ماہنامہ

ہمدرد

نونہال

ستمبر ۱۹۸۶ء

خاص نمبر

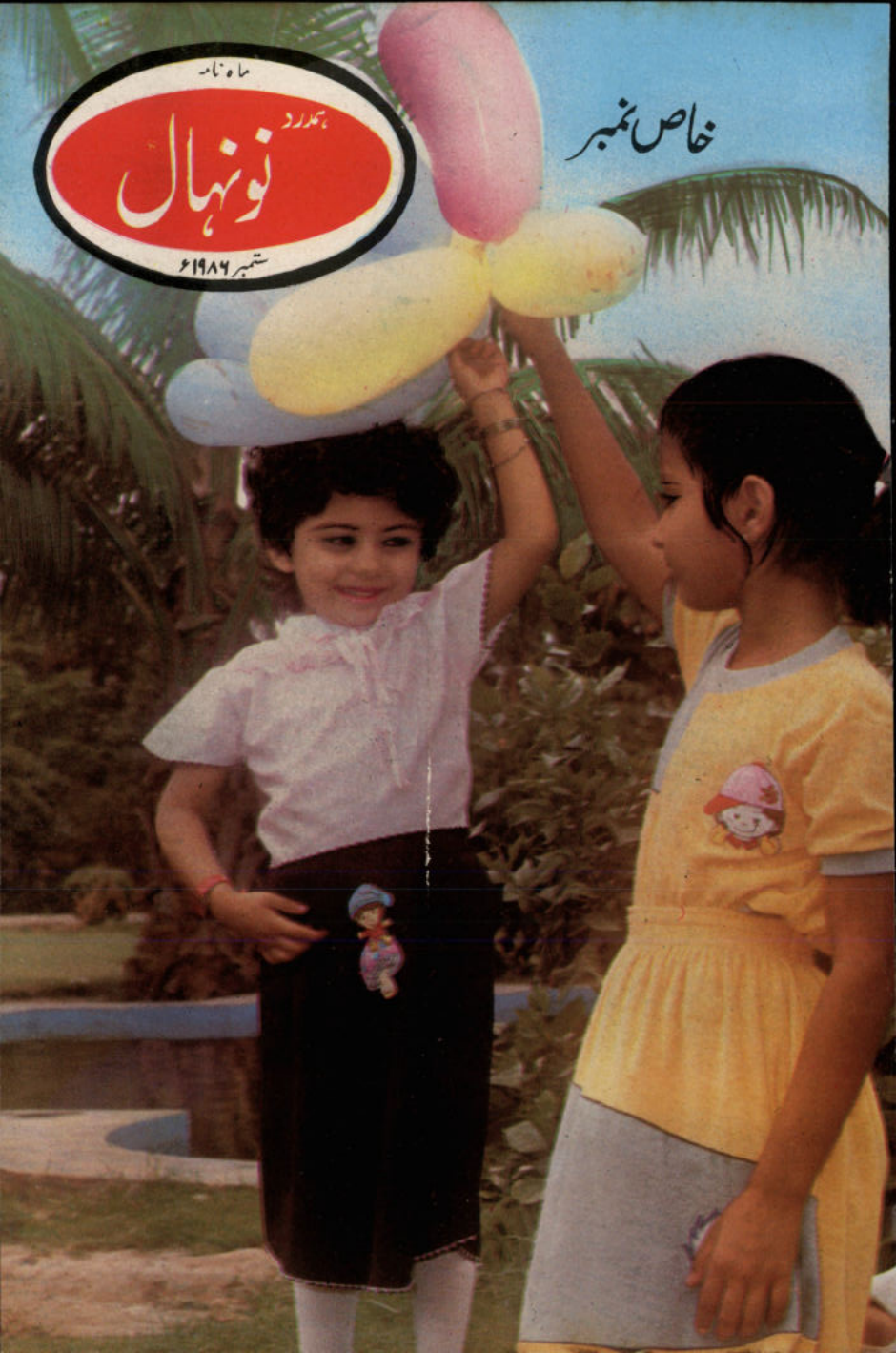

رُوح افزا - رُوحِ پاکستان

چپہ چپہ، گوشہ گوشہ نام ہمارا جانے ہے

رُوح افزا ایسے پھلوں، پھولوں، سبزیوں اور جڑی بوٹیوں سے بنایا جاتا ہے جو ارضِ وطن کے گوشے گوشے سے حاصل کی جاتی ہیں۔

پاکستان کے پتے پتے، بُوٹے بُوٹے سے تیار ہونے والا رُوح افزا نہ صرف پاکستان کے چپے چپے میں مقبول ہے بلکہ ملک سے باہر بھی اسی ذوق و شوق سے پسند کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رُوح افزا کو "رُوحِ پاکستان" کہنا زیب دیتا ہے۔

رنگ، خوشبو، ذائقے، تاثیر اور معیار میں بے مثال

مشروبِ مشرق **رُوح افزا**

رُوحِ پاکستان

ہمدرد

ہم خدمت خلق کرتے ہیں

BBM-4-86. -UD.

R-LINTAS

ENGLISH
BISCUIT

الف سے انگلش بے سے بسکٹ
پہلی غذا انگلش بسکٹ

MNJ

رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

ٹیلے فون : 616001 سے 616005

نونہال

خاص نمبر

مجلس ادارت

صدر مجلس — حکیم محمد سعید

مدیر اعلا — مسعود احمد برکاتی

مدیرۂ اعزازی — سعدیہ راشد

محرم — ۱۴۰۷ھ

ستمبر — ۱۹۸۶ء

جلد — ۳۴

شمارہ — ۹

نونہالوں کے لیے تحفہ
ایک حسین آٹو گراف بک

قیمت فی شمارہ — ۴/۰۰ رُپے

سالانہ — ۴۵/۰۰ رُپے

سالانہ (جبٹری سے) ۸۱/۰۰ رُپے

خاص نمبر — ۷/- رُپے

پتا: ہمدرد نونہال
ہمدرد ڈاک خانہ
ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

ہمدرد فاؤنڈیشن (پاکستان) نے نونہالوں کی تعلیم و تربیت اور صحت و مسرت کے لیے شائع کیا۔

اس رسالے میں کیا ہے؟

جاگو جگاؤ	جناب حکیم محمد سعید	۷
پہلی بات	مسعود احمد برکاتی	۸
اللہ (نظم)	جناب فیض لودھیانوی	۱۰
السّلام علیکم	مسعود احمد برکاتی	۱۱
فرخندہ اور اس کی سہیلی	جناب میرزا ادیب	۱۷
رضیہ سلطانہ	جناب محمد زکریا ماٹل	۲۳
آٹھویں سال گرہ	جناب معراج	۳۱
کیسے بھول جاؤں	جناب حکیم محمد سعید	۳۹
غالب (نظم)	جناب قمر ہاشمی	۴۵
خیال کے پھول	ننھے گل چیں	۴۶
لال بطخ	جناب میرزا ادیب	۴۷
ہرنوٹے نے کہانی لکھی	جناب رؤف پاریکھ	۵۴
خزانے کا محافظ	جناب معراج	۶۰
وارث کی تلاش (پہلا ٹکڑا)	جناب مناظر صدیقی	۶۹
کارٹون	جناب مشتاق	۷۷
اخبار نونہال	ننھے صحافی	۷۸
ساحلی جنگلات	ڈاکٹر سہیل برکاتی	۸۱
مسکراتی تحریریں	جناب مجتبیٰ حسین	۸۵
ہمہ دانا انسائیکلو پیڈیا	جناب علی ناصر زیدی	۹۵
برسات کا سماں (نظم)	جناب سلیم فاروقی	۹۹
مفید گھریلو چٹکلے	جناب رشید الدین احمد	۱۰۰
عجیب و غریب اتفاقات	جناب طاہر جاوید	۱۰۳
تقریر کی تقدیر	جناب مرتضیٰ علی حسن	۱۰۵
ایک ذہین چیونٹی	جناب ڈاکٹر شمیم حنفی	۱۱۰
سنگ دل کھلونے	جناب معراج	۱۱۳
پھل صحت کے لیے	ڈاکٹر سید اسلم	۱۳۱
کارٹون	جناب مشتاق	۱۳۳
طب کی روشنی میں	جناب حکیم محمد سعید	۱۳۵
دو پرانی چیزیں	مسعود احمد برکاتی	۱۳۹
بچہ اور مرغا (نظم)	جناب عبدالغنی شمس	۱۴۱
سیاروں کی دنیا	جناب ندیم یوسف	۱۴۳
بلا عنوان (انعامی مقابلہ)	جناب علی اسد	۱۵۵

عجیب عجیب باتیں	ادارہ	۱۶۹
صحت کے اصول	محترمہ عفت گل اعزاز	۱۷۱
جمعراتی	مسعود احمد برکاتی	۱۷۹
معلومات عامہ ۲۴۵	ادارہ	۱۸۲
ژول ورن	جناب شہزاد منظر	۱۸۴
زیرِ زمین سفر	جناب ژول ورن	۱۸۵
سنہری ذرّات	جناب خالد فہیم سبزواری جناب سید محمد رضا	۲۰۹
اقوالِ حکیم	جناب عصمت علی پٹیل	۲۱۳
نونہال مصور	ننھے آرٹسٹ	۲۱۶
تحفے	باذوق نونہال	۲۱۷
ایشیائی کھیل	جناب ساجد علی ساجد	۲۲۵
سدا بہار قصّے	ادارہ	۲۳۱
مگر تو تا گرفتار ہوگیا	جناب غلام رازق شیخ	۲۳۳
مسکراتے رہو	ننھے مزاح نگار	۲۳۵
پانی کی کھال	جناب مناظر صدیقی	۲۴۱
اس شمارے کے مشکل الفاظ	ادارہ	۲۴۴
صحت مند نونہال	ادارہ	۲۴۵
منتخب کہانیاں	شہیرہ - حلیمہ	۲۴۶
نونہال ادیب	ننھے لکھنے والے	۲۵۰
ننھے قارئین لکھتے ہیں	نونہال پڑھنے والے	۲۶۷

معلومات عامہ ۲۴۳ کے جوابات ادارہ ۲۷۰

اس رسالے کی تمام کہانیوں کے کردار اور واقعات فرضی ہیں۔ ان میں سے کسی کی کسی حقیقی شخص یا واقعے سے مطابقت محض اتفاقی ہوسکتی ہے، جس کے لیے ادارہ ذمے دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیثِ نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے، لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہوں اُن کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

بیگم محمد سعید پبلشر نے ماس پرنٹرز کراچی سے چھپوا کر ادارۂ مطبوعاتِ ہمدرد ناظم آباد کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا۔

تمام طلباء و طالبات کی دلپسند

نوٹ بکس

پی پی پی برانڈ

ملک بھر کے یوٹیلیٹی اور کینٹین اسٹورز اور اسٹیشنری کی
دوکانوں میں مقررہ داموں پر دستیاب ہیں۔

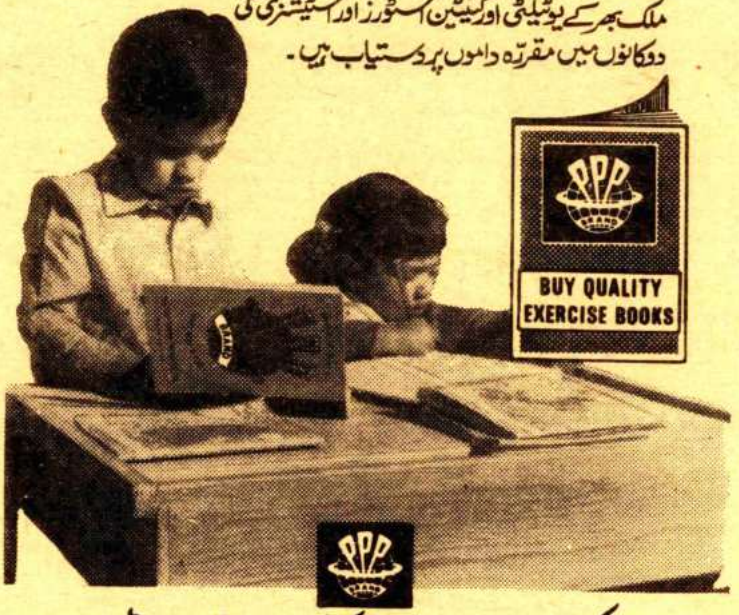

پاکستان پیپر پروڈکٹس لمیٹڈ

پوسٹ بکس نمبر ۷۴۳۸ - کراچی ۳

786/PPP-16/84

جاگو جگاؤ

چوری، لوٹ، ڈاکا، دھوکا۔ یہ سب کتنی بُری باتیں ہیں۔ ان کو کون پسند کرتا ہے۔ سب ہی بُرا کہتے ہیں۔ چور، ڈاکو، لٹیرے اور فریبی کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، لیکن تاجر کی سب عزّت کرتے ہیں۔ تجارت ایک باعزّت پیشہ ہے۔ اس سے منافع بھی حاصل ہوتا ہے احترام بھی، لیکن تجارت میں سے اگر اخلاق کو نکال دیا جائے تو؟ جواب آسان ہے۔ جو تاجر ایسا کرے گا وہ عزّت، احترام کے قابل نہیں رہے گا۔

اخلاق سے کیا مراد ہے۔ تاجر یا دُکان دار کی چکنی چُپڑی، میٹھی میٹھی باتیں اور خوشامدانہ لہجہ نہیں، کیوں کہ یہ تو ظاہری اخلاق ہوئے۔ ظاہری اور اوپری اخلاق تو دھوکے اور فریب ہی کی تعریف میں آتے ہیں۔ اخلاق سے مراد یہ ہے کہ سچ بولے، اپنے مال کی جھوٹی تعریف نہ کرے، مال میں کسی قسم کا عیب ہو تو اس کو چھپائے نہیں بلکہ بتا دے، کم نہیں تولے، کم نہیں ناپے اور منافع مناسب لے۔ اگر کسی دُکان دار نے ایک رُپے کی چیز ۵ رُپے میں بیچ دی تو یہ منافع نہیں ہوا، دھوکا ہوا، لوٹ ہوئی، کیوں کہ جب تک دُکان دار جھوٹ نہ بولے اور اس چیز کی تعریف میں زمین آسمان کے قلّابے نہ ملائے، وہ ایک رُپے کے ۵ رُپے وصول نہیں کر سکتا۔ ایک کے پانچ بنا کر بعض بلکہ اکثر تاجر دل میں خوش ہوتے اور اس کو معقول منافع اور اللہ کا فضل کہتے ہیں، لیکن یہ تجارت نہیں ہے، لُوٹ ہے۔ گاہک کو دھوکا دینا ہے۔ ایسا کرنا دیانت، امانت اور اخلاقی اصولوں کے خلاف ہے۔ اس سے مہنگائی بھی بڑھتی ہے۔ تجارت وہی اچھی ہے جو سچّے اخلاق کے ساتھ کی جائے۔ اس میں بہ ظاہر نفع کم ملتا ہے، لیکن برکت زیادہ ہوتی ہے۔ دل مطمئن رہتا ہے اور اطمینان بڑی دولت ہے۔

تمھارا دوست اور ہمدرد

حکیم محمد سعید

پہلی بات

مسعود احمد برکاتی

ہماری کئی مہینے کی محنت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ خاص نمبر کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ یہ بہت محنت لیتا ہے۔ کہانیوں، مضمونوں، نظموں، معلومات، مستقل عنوانات غرض سب تحریروں کی تعداد ۵۲ ہے۔ کیا کم ہے یہ تعداد؟ اس اس بار ہم نے خاص طور پر خیال رکھا ہے کہ تحریریں مختصر ہوں، خشک نہ ہوں مگر معلوماتی اور اخلاقی بھی ہوں۔ رنگا رنگ ہوں اور ہر مذاق کے نونہالوں کو پسند آئیں۔

سلسلے وار کہانی نہ ہونے کی بہت شکایت تھی، وہ بھی شروع کر دی ہے۔ ہم نے جناب میرزا ادیب کی ایک کہانی کا اعلان کیا تھا، لیکن ان کی دو مزے دار کہانیاں شامل ہیں۔ ہم مرزا صاحب کے شکر گزار ہیں۔ جناب حکیم محمد سعید کو بچوں اور ہمدرد نونہال سے کس قدر دل چسپی ہے اس کا اندازہ نونہالوں کو اچھی طرح ہے۔ حکیم صاحب نے ہر قدم پر ہماری راہنمائی اور ہمت افزائی کی اور پھر اپنے بچپن کی باتیں بھی لکھ کر دیں۔ ہے نا شکریہ ادا کرنے کے قابل بات۔

جناب معراج کی پوری تین اور تینوں دل چسپ کہانیاں شامل ہیں۔ ان کا لکھنے کا انداز بہت عمدہ ہے اور وہ تلاش کر کے ہمدرد نونہال کے لیے اچھی کہانیاں لاتے ہیں۔ جناب علی اسد کی اس بار صرف ایک کہانی ہے، جاسوسی اور حیرت انگیز۔ جناب ڈاکٹر سید اسلم پاکستان کے مشہور ماہر قلب ہیں۔ ہمدرد انسان ہیں اور اتنے ہی اچھے ادیب بھی ہیں۔ ہم ان کے قلمی تعاون کے لیے ممنون ہیں۔

مسکراتی تحریروں کے عنوان سے مشہور مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین کی تحریروں کا انتخاب پیش ہے۔ یہ انتخاب شہزاد منظر صاحب نے کیا ہے۔ انھوں نے ہماری مدد بھی کی، ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

ہمدرد نونہال، ستمبر ۱۹۸۶ء

جناب علی ناصر زیدی ہمدرد نونہال کے بہت پرانے قلمی معاون ہیں۔ وہ ہمدرد انسائکلوپیڈیا کے علاوہ بھی مضامین لکھتے ہیں۔ ہم اُن کے ممنون ہیں۔ جناب مشتاق آپ کے لیے کارٹون کے علاوہ کہانیوں کی تصویریں بھی بناتے ہیں۔ جناب قمر ہاشمی اور جناب فیض لودھیانوی آپ کے لیے اچھی اچھی نظمیں لکھتے ہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں نا ؟

جناب محمد زکریا مائل مرحوم کا ایک بڑا اچھا تاریخی مضمون شامل کیا ہے۔ رؤف پاریکھ صاحب نے ایک بڑی خوب صورت کہانی ہماری فرمائش پر لکھی ہے۔ اب آیندہ آپ پر ہے۔ آپ چاہیں تو فرمائش کریں۔

ہندُستان کے ایک بہت مشہور ادیب اور استاد ڈاکٹر شمیم حنفی نے ہماری درخواست پر کہانی لکھی ہے اور آیندہ بھی لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ شمیم صاحب کا شکریہ۔ ایک گجراتی کہانی کا ترجمہ جناب غلام رازق شیخ نے احمدآباد (ہندُستان) سے بھیجا ہے۔ بتائیے کیسا ہے ؟

میں نے اپنی ایڈیٹری سے فائدہ اُٹھا کر اپنی تین تحریریں شامل کردی ہیں۔ پسند نہ آئیں تو نہ پڑھنا۔

اچھا اب آپ خود ہی پڑھیے۔ میں بیچ میں دخل نہیں دیتا، خط لکھیں، مگر مختصر۔ تعریف بھی مختصر اور ناراضی بھی مختصر۔ ایک نونہال ایک سے زیادہ خط نہ لکھے۔ ہاں ہاں سمجھ گئے نا۔

اس بار معلومات عامہ کے سوالات پر نقد انعام نہیں رکھا، مگر وہی میرا جملہ "نام بہت بڑا انعام" یاد رکھیے۔ پیسہ تو خرچ ہو جاتا ہے، نام باقی رہتا ہے، پھر نہ کوئی کوپن نہ کوئی شرط، بس ذہانت شرط۔

بھئی خوب صورت آٹو گراف بُک کا شکریہ آپ ہمدرد دواخانہ وقف کا ادا کریں۔ یہ انھوں نے نونہالوں کے لیے دیا ہے۔

اچھا خالدہ ناز کی تعریف بھی کر دوں ؟ ہاں بھئی آخر انھوں نے پورا خاص نمبر تن تنہا کتابت کیا ہے۔ آیندہ مہینے تک کے لیے اجازت

نیض لودھیانوی

ایک ہے وہ اُس کا ثانی ساری دنیا میں نہیں
آسماں اُس نے بنایا اُس نے پیدا کی زمیں

وقت پر سورج نکلتا ہے اُسی کے حکم سے
روشنی پھیلا کے ڈھلتا ہے اُسی کے حکم سے

دوسرا کوئی اگر ہوتا کہیں اُس کا شریک
رہ نہیں سکتا تھا پَل بھر میں یہ بندوبست ٹھیک

چاند تارے جانور پھل پھول دریا کوہسار
جس طرف دیکھو اُدھر اُس کی خدائی آشکار

ہر جگہ ہر چیز پر ہر آن ہے اُس کی نگاہ
ذرّہ ذرّہ قطرہ قطرہ پتّا پتّا ہے گواہ

اُس کی لاکھوں خوبیاں کوئی بتائے کس طرح
وہ ذرا سے ذہن کے اندر سمائے کس طرح

زندگی اُس نے عطا کی اُس نے بخشیں نعمتیں
پس ہمارا فرض ہے ہم بندگی اس کی کریں

فیض اُس کے قہر سے بندوں کو ڈرنا چاہیے
جس سے وہ راضی ہو ایسا کام کرنا چاہیے

اَلسَّلام عَلَیکم

مسعود احمد برکاتی

ایک بزرگ تھے۔ بازار میں ان کو کوئی کام نہیں ہوتا تھا، لیکن وہ اکثر شام کے وقت بازار چلے جایا کرتے تھے۔ ایک بار لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ بازار کیوں جایا کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا، اس لیے جاتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو سلام کر سکوں اور جواب میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کا سلام لے سکوں۔ آپ اگر کسی کو بھولے سے سلام کیے بغیر آگے بڑھ جاتے تو پلٹ کر آتے اور سلام کرتے۔ یہ بزرگ تھے حضرت عبداللہؓ ابن عمر فاروق۔

اس واقعے سے سلام کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ سلام کے معنی ہیں سلامتی۔ جب ہم کسی کو سلام کرتے ہیں تو کہتے ہیں:

السلام علیکم یعنی تم پر سلامتی ہو۔

سَلام عربی لفظ ہے اور اس کے بہت سے معنی ہیں: سلامتی، دعا، امن، امان، سالم، تسلیم، بندگی، آداب، کورنش۔

جب ہم کسی کو سلام کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کی سلامتی، اس کی بھلائی کی دعا کرتے ہیں۔ ہمارے سلام کرنے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جس شخص کو ہم نے سلام کیا ہم اُسے جانتے ہیں، چاہے معمولی طور پر ہی جانتے ہوں اور اس کی بھلائی چاہتے ہیں۔ اُس شخص پر ہمارا اچھا جذبہ، اچھی خواہش ظاہر ہوتی ہے۔ اِس سے اُس شخص کو سکون ملتا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا میں اس کی بھلائی چاہنے والے بھی ہیں۔ اس طرح باہم اُنس اور پیار بڑھتا ہے۔ محبّت کی فضا بنتی ہے۔ یہ محبّت کی فضا بڑی ضروری اور کام کی چیز ہے۔ اس سے انسان، انسان میں قُربت بڑھتی ہے۔ ایک دوسرے پر اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خوشی سے خوش ہوتے ہیں۔ دیکھا آپ نے سلام کا ایک لفظ کتنے کام کرتا ہے، لیکن سلام صرف

ایک لفظ ہی نہیں ایک جذبہ ہے، ایک مزاج ہے۔ یہ جذبہ ترقی کرتا ہے تو معاشرہ ترقی کرتا ہے۔ یہ مزاج معاشرے کو سکون، راحت اور خوشی عطا کرتا ہے۔ معاشرہ بہت سے انسانوں کے مجموعے سے بنتا ہے۔ معاشرہ چھوٹا بھی ہوتا ہے اور بڑا بھی۔ سب سے چھوٹا معاشرہ خاندان کہلاتا ہے۔ اس سے بڑے معاشرے کو برادری کہہ سکتے ہیں۔ پھر شہر اور ملک آتے ہیں۔ ہر قوم کا اپنا ایک معاشرہ ہوتا ہے۔ جس خاندان جس برادری اور جس قوم کے لوگ ایک دوسرے کے سچے دوست اور بھائی ہوں، ان کا معاشرہ بڑے امن اور چین سے رہتا ہے اور خوب پھلتا پھولتا ہے۔

جنّت کو دارُالسّلام کہتے ہیں، کیوں کہ وہاں داخل ہونے کے بعد لوگ تمام پریشانیوں، برائیوں، مصیبتوں، عیبوں اور آپس کی دشمنیوں سے محفوظ رہیں گے۔ جنّت کو دارالسّلام اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ وہاں جنّت والے ایک دوسرے سے خلوص اور محبّت رکھیں گے اور اس کو ظاہر کرنے کے لیے بار بار سلام کریں گے بلکہ فرشتے اور خود اللہ میاں بھی جنّت والوں کو سلام کرتے رہیں گے۔ جنّت کو شاید دارالسّلام اس لیے بھی کہتے ہوں گے کہ اللہ میاں کا ایک نام "سلام" بھی ہے اور جنّت کو خانۂ خُدا یا اللہ کا گھر کہا گیا ہے۔

دونوں جہانوں کے سردار اور ہمارے پیارے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"تم لوگ جنّت میں نہیں جا سکتے جب تک کہ مومن نہیں بنتے اور تم مومن نہیں بن سکتے جب تک کہ ایک دوسرے سے محبّت نہ کرو۔ میں تمھیں وہ تدبیر کیوں نہ بتادوں جس کو اختیار کر کے تم ایک دوسرے سے محبّت کرنے لگو۔ آپس میں سلام کو پھیلاؤ۔"

یعنی سلام کو پھیلانے سے محبّت بڑھے گی۔ محبّت مومن ہونے کی ایک نشانی ہے اور جنّت کا راستہ کھولتی ہے بلکہ دنیا کو بھی جنّت بناتی ہے۔ آپؐ نے ایک اور موقع پر فرمایا:

"جب تم گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرو اور جب تم گھر سے باہر جاؤ سلام کر کے رخصت حاصل کرو۔"

آپؐ کا یہ ارشاد بھی سونے سے لکھے جانے کے قابل ہے:

"غریبوں کو کھانا کھلاؤ اور ہر مسلمان کو سلام کرو، چاہے تمھاری اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو۔"

ہر مسلمان کو سلام کرنے کی ہدایت کر کے آپؐ نے محبت اور مساوات (برابری) کی تعلیم دی ہے۔ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ایک دوسرے کی سلامتی اور بھلائی چاہنا اُن کا فرض ہے۔ آج بہت سے بڑے لوگ سلام کرنے کے بجائے سلام سننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ وہ چھوٹوں کو سلام کرنا شاید اپنی توہین سمجھتے ہیں، لیکن سلام کرنا توہین نہیں ہے، بڑائی کی نشانی ہے۔ بڑا آدمی ہی دوسروں کی بھلائی اور سلامتی چاہتا ہے۔ جو لوگ اس امید میں رہتے ہیں کہ دوسرے ان کو سلام کریں اُن کے دل میں کھوٹ ہوتی ہے، محبت نہیں ہوتی۔ حضورؐ کا ایک اور ارشاد پڑھیے:

"وہ آدمی اللہ تعالیٰ سے زیادہ قریب ہے جو سلام کرنے میں پہل کرتا ہے۔"

خود حضورؐ کا طریقہ کیا تھا؟ آپ کا طریقہ یہ تھا:

آپؐ کے پاس جو شخص بھی آتا آپؐ اس کو سلام کرنے میں پہل فرماتے۔ آپؐ کی کوشش ہوتی کہ اس سے پہلے کہ کوئی شخص آپؐ کو سلام کرے، آپؐ پہلے اس پر سلامتی بھیج دیں۔ آپؐ اس طرح سلام کرتے تھے:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہ

ایک دن آپؐ مسجد کے پاس سے گزرے۔ وہاں کچھ عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں، آپؐ نے اُن کو اپنے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔

ایک شخص نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپؐ نے اس کا جواب دیا اور فرمایا: اس شخص کو تیس نیکیاں ملیں۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ 'السلام علیکم' کا جواب 'وعلیکم السلام' ہے، یعنی "اور تم پر بھی سلامتی ہو"۔ لیکن اگر کوئی جواب میں "ورحمۃ اللہ (اور اللہ کی رحمت ہو) کے الفاظ بڑھا دے تو اچھا ہے اور "وبرکاتہ" (اور برکتیں بھی نازل ہوں) جواب میں شامل کر لے تو کیا کہنے۔ اس طرح اس کی خوش دلی زیادہ ظاہر ہوگی۔

سلام تہذیب کی علامت بھی ہے۔ جو آدمی سلام کرتا ہے وہ مہذب کہلاتا ہے اور لوگ

اس کو اچھا سمجھتے ہیں۔ سلام کرنے میں ایک آسانی بھی ہے۔ آدمی کے پاس ہمیشہ اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ کسی جاننے والے سے رُک کر بات چیت کرے، لہٰذا وہ سلام کہہ کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ سلام کرنے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے ہیں اور آپس میں ناراض نہیں ہیں، خوش ہیں۔ دو جاننے والوں کا آمنا سامنا ہو اور وہ وقت کی کمی کی وجہ سے بات چیت نہ کر سکیں، ویسے ہی گزر جائیں تو شک ہونے لگتا ہے کہ کہیں دلوں میں فرق تو نہیں آ گیا۔ سلام کرنے سے یہ شبہ نہیں ہوتا اور ذہن صاف رہتا ہے۔

اب ذرا اردو میں سلام کے معنی اور محاورے بھی دیکھیے۔ سلام عربی لفظ ہے اور اس کے معنی بھی میں نے اوپر لکھ دیے ہیں، لیکن اردو بھی ایک بڑی اور مستقل زبان ہے۔ ہر زبان دوسری زبان سے متاثر ہوتی ہے اور اس کے بعض لفظ اپنا بھی لیتی ہے، لیکن مستقل اور زندہ زبان کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسری زبان کے لفظ لے تو لیتی ہے، لیکن ان کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ مثلاً ہی سے کسی لفظ کو جوں کا توں قبول کرتی ہے۔ کہیں زیر زبر بدل دیتی ہے کہیں معنی بدل دیتی ہے اور کہیں اس کے ساتھ اپنا کوئی لفظ لگا کر نئے معنی پیدا کرتی ہے۔ لفظ سلام کے ساتھ بھی اردو نے کچھ ایسا ہی سلوک کیا ہے۔ عربی میں سلام کے جو معنی ہیں ان کے ساتھ ساتھ اردو میں کئی معنی ایسے بھی ہیں جو عربی میں نہ ہوں گے، مثلاً اردو میں سلامتی کے علاوہ الزام دینے کے لیے بھی سلام کہتے ہیں۔ اسی طرح کے چند اور محاورے اور ان کا مفہوم لکھتا ہوں:۔

سلام پھیرنا : نماز ختم کرنا۔
سلام پیام : بات چیت۔ منگنی یا شادی کے سلسلے میں بات چیت۔
سلام دینا : دُور کرنا، رخصت کرنا۔
سلام کرنا : آداب کرنا، رخصت ہونا۔ کسی کام کو چھوڑنے کے معنی میں بھی سلام کرنا بولتے ہیں جیسے داغ نے اس شعر میں لکھا ہے:

تھی نہ تابِ ستم تو حضرتِ دل
عاشقی کو سلام کر نا تھا

کسی کی مہارت یا قابلیت کا قائل ہو جانا۔

سلام لینا : سلام کا جواب، اشارے یا زبان سے دینا۔ میل ملاپ چھوڑنے کے معنی میں بھی سلام لینا بولتے ہیں۔

سلام ہونا : ملاقات ہونا۔

سلام ہے : ہم باز آئے۔ معاف کیجیے۔ اللہ محفوظ رکھے، اللہ کام نہ ڈالے۔

سلامِ نیاز : عاجزی کا سلام۔

سلامِ رُوستائی : غرض مندی کا سلام۔

سلام : ایک قسم کی تعریفی نظم کو بھی کہتے ہیں، جو غزل کے انداز پر ہوتی ہے اور جس میں حضورؐ کی سیرت یا واقعۂ کربلا کا ذکر ہوتا ہے۔

سلام پڑھنا : میلاد میں حضورؐ پر منظوم سلام پڑھنا۔

سلام بھیجنا : درود اور سلام پڑھنا۔

a great name in
INSURANCE

PLATINUM
PROGRESS WITH SAFETY

Platinum
Insurance Co. Ltd.

4th & 5th FLOOR STATE LIFE BUILDING NO. 2 WALLACE ROAD KARACHI (PAKISTAN) Phones: 222962 - 222959

BROCHE

NO. 51

★ PARFUM COLOGNE SPRAY
★ ROLLET PARFUM

NO. 51 بروچ

پرفیوم کلون اسپرے

رولیٹ پرفیوم

THE OUTSPOKEN PARFUM THAT LASTS AND LASTS

R-285

فرخندہ اور اُس کی سہیلی

میرزا ادیب

یورپ کے کئی ملکوں میں اپنے شوہر اور بچّوں کے ساتھ دس برس بسر کرنے کے بعد جب فرخندہ واپس اپنی کوٹھی میں پہنچی تو اس کے عزیزوں اور سہیلیوں کے ٹیلے فون آنے لگے۔ یہ سب اُس سے ملنے کے لیے بے تاب تھے۔ فرخندہ ان سب کا شکریہ ادا کرتے کرتے تھک سی گئی تھی۔ اس کی ساس بولیں، "فرخندہ بی بی، تم ایک ایک کے گھر میں کہاں جاؤ گی ان سب کو اپنے ہاں چائے پر بُلا لو۔ سب سے ملاقات ہو جائے گی۔ کسی کو یہ شکایت بھی نہیں رہے گی کہ فرخندہ نے ہمیں نہیں پوچھا۔"

فرخندہ نے ساس کی بات سُن کر کہا، "خالہ جان! آپ کی تجویز بہت اچھی ہے اور میں ضرور

اس پر عمل کروں گی مگر ابھی نہیں۔"

"پھر کب؟"

"سب سے پہلے میں اپنے پرانے محلّے میں جاؤں گی۔ وہاں ایک سہیلی سے مل کر آؤں گی تو اس پروگرام پر عمل کروں گی۔"

"پرانے محلّے میں تمھاری کوئی سہیلی ہے؟" ساس نے پوچھا۔

"آپ اُسے نہیں جانتیں خالہ جان! وہ ایک غریب عورت ہے اور ایک چھوٹے سے ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہتی ہے۔"

اس کی ساس کو حیرت ہوئی کہ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں غریب عورت اس کی بہو کی سہیلی کیوں کر ہو سکتی ہے؟ انھوں نے اس سلسلے میں مزید گفت گو نہ کی اور خاموش ہو گئیں۔

دوسرے روز صبح کے وقت فرخندہ نے اپنی چھوٹی نند کو ساتھ لیا۔ ہاتھ میں ایک سوٹ کیس اُٹھایا اور گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ گاڑی سے اُتر کر ایک گلی میں جا رہی تھی۔ گلی کے آخری مکان کے دروازے پر فرخندہ نے دستک دی۔ ایک لڑکی آئی۔

"تمھاری امّی ہیں گھر پر؟"

"جی ہیں۔"

"کہہ دو فرخندہ آئی ہے۔"

ایک منٹ بعد ایک عورت جس کا لباس بہت معمولی تھا بھاگی بھاگی آئی۔ فرخندہ اسے دیکھتے ہی آگے بڑھی اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ کمرے کے اندر جا کر وہ بڑے پیار اور محبّت سے باتیں کرنے لگیں۔ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد جب فرخندہ جانے لگی تو اس نے وہ سوٹ کیس جو ساتھ لائی تھی اس عورت کے حوالے کرتے ہوئے کہا، "تمھارے اور تمھارے بچّوں کے لیے کچھ تحفے۔"

وہ بہت خوش ہوئی۔ اور فرخندہ پہلے کی طرح اس سے گلے ملی اور اس کے گھر سے نکل آئی۔

فرخندہ کی نند نے یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کوٹھی میں آ کر اس نے جو کچھ دیکھا

تھا اپنی ماں کو بتا دیا، "اماں! یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"حیرت تو مجھے بھی ہے۔ رات کو فرخندہ سے پوچھیں گے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔"

رات کو جب سب کھانے سے فارغ ہو گئے تو فرخندہ کی ساس بولیں، "فرخندہ بی بی! نغمہ نے بتایا ہے کہ تم اس غریب عورت سے بڑی محبت کے ساتھ ملی تھیں اور اسے تحفے دیے تھے۔ بیٹی کون ہے یہ؟"

فرخندہ کہنے لگی، "خالہ جان! یہ کون ہے اور میں کیوں ہر ایک کو چھوڑ کر سب سے پہلے اس کے ہاں گئی تھی۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔"

"کیا وجہ ہے؟" ساس نے پوچھا۔

"خالہ جان! ایک واقعہ سناتی ہوں۔ یہ واقعہ آج سے تیس برس پہلے ہوا تھا۔"

"تیس سال پہلے!"

"جی ہاں خالہ جان! اس زمانے میں میری ایک کمزوری تھی اور وہ کمزوری یہ تھی کہ اندھیرے میں تنہا کسی جگہ نہیں جاتی تھی۔ وہاں جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ اس وقت شاید میری عمر گیارہ برس تھی۔ ماموں جان کراچی سے آئے تو وہ ہم سارے بچوں کے لیے طرح طرح کی چیزیں بھی لائے۔ میری چھوٹی بہن ممتاز جسے ہم پیار سے 'تازی' کہتے تھے، اس کے لیے ایک بڑی خوب صورت بطخ لائے۔ تازی یہ تحفہ پا کر بے حد خوش ہوئی۔ وہ اس بطخ کو پانی میں تراتی رہتی تھی اور خوش ہوتی رہتی تھی۔ پندرہ بیس دن گزر گئے۔ ایک شام تازی روتی روتی امی کے پاس آئی اور کہنے لگی، "میلی بطخ کدھر ہے؟"

"وہاں ہو گی جہاں رکھی تھی تم نے۔" امی نے تلخ لہجے میں کہا۔

"نا ہیں ہے۔"

"مجھے کیا پتا اپنی چیزیں کہاں رکھتی ہو؟"

تازی زیادہ زور سے رونے لگی۔ امی نے مجھے بلوا بھیجا۔ میں آئی تو بولیں، "فرخندہ، یہ کم بخت اپنی بطخ کہیں گم کر بیٹھی ہے۔ ڈھونڈ کر دو اسے۔ رو رو کر آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔"

امی کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ بلا ضرورت کسی کمرے میں بلب روشن کیا جائے

اس لیے ہمارے گھر کے دو تین کمرے ہی روشن رہتے تھے۔ کسی کو کسی دوسرے کمرے میں جانا ہوتا تھا تو وہ سوئچ آن کر دیتا تھا اور باہر نکلتا تھا تو یہ سوئچ آف کر دیتا تھا۔ اتفاق سے اس شام میرا چھوٹا بھائی بھی گھر میں نہیں تھا ورنہ اسی کو لے کر کمروں میں چلی جاتی اور بطخ کو ڈھونڈ کر لے آتی۔ اکیلے اندھیرے میں جانے سے خوف آتا تھا۔ میں اِدھر اُدھر گھومتی پھری، مگر ان کمروں میں قدم تک نہ رکھا جن میں اندھیرا تھا۔ تھوڑی دیر بعد امّی کو آ کر بتا دیا۔

"امّی، بطخ کہیں بھی نہیں ہے۔"

"کیا بطخ کہیں نہیں ہے؟" امّی گرجیں۔

"نہیں ہے امّی۔"

یہ خبر سن کر کہ اس کی بطخ گھر میں نہیں ہے تازی نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

میں نے اپنی چیزیں اس کے آگے ڈھیر کر دیں۔ اس کو ہر طرح بہلانے کی کوشش کی مگر اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر روتے روتے، کچھ کھائے پیے بغیر سو گئی۔ امی نے مجھ سے پوچھا، "آج کون کون گھر میں آیا تھا؟" ان کی مراد محلّے کے بچّوں سے تھی جو کبھی کبھی ہمارے ہاں آجاتے تھے۔

میں نے بتایا:

"امی آج تو گھر میں کوئی نہیں آیا تھا۔ تازی کے ساتھ نوکرانی کھیلتی رہی تھی۔ پتا نہیں وہ ــ لے گئی ہو گی۔"

ہماری نوکرانی ایک غریب لڑکی تھی جو ہمارے ہاں کام کاج کیا کرتی تھی۔ صبح آتی اور شام سے پہلے پہلے اپنے گھر لوٹ جاتی تھی۔

دوسرے روز صبح وہ آئی تو امّی نے اس سے بڑی سختی کے ساتھ پوچھا، "کہاں ہے تازی کی بطخ۔ جلدی بتاؤ۔"

"مجھے پتا نہیں جی۔"

"تجھے پتا نہیں۔ سچ سچ بتاؤ۔ گھر لے گئی ہو؟"

اس کے منھ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ بڑی مشکل سے بولی، "نہیں بڑی.... بی بی.... جی میں بطخ گھر نہیں لے گئی۔"

امی کے غصّے کا پارا اور چڑھ گیا۔ کڑک کر کہا، "اگر آدھے گھنٹے کے اندر اندر مجھے وہ بطخ نہ

ملی تو میں تمہارا حشر خراب کر دوں گی۔"

ابھی پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ نوکرانی بطخ لیے ہوئے آ گئی۔

"کہاں سے ملی یہ؟" امی نے پوچھا۔

"آخری کمرے میں صوفے کے اوپر پڑی تھی۔" وہ بطخ امّی کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

"اسی کمرے میں تھی سچ کہہ رہی ہے تو؟"

وہ اثبات میں اپنا سر ہلانے لگی۔ اس وقت امی نے میری طرف غور سے دیکھا۔ "فرخندہ! تُو نے تو کہا تھا کہ میں سب جگہ دیکھ آئی ہوں۔ یہ کہاں سے لے آئی ہے؟"

میں کیا کہتی چپ رہی۔ امی کو کچھ شک ہوا۔ "سچ سچ بول۔ گئی تھی وہاں؟"

میں پھر خاموش رہی۔

"کیا پوچھ رہی ہوں تجھ سے۔ بولتی کیوں نہیں۔ گئی تھی اس کمرے میں؟"

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "نہیں امی۔"

"تو تُو ادھر گئی ہی نہیں تھی اور چوری کا الزام لگا دیا تھا نوکرانی پر۔ تازی بے چاری چیختی چلاتی رہی بتا کیا کہتی ہے تُو؟"

میں بھلا کیا کہہ سکتی تھی؟ امی طبیعت کی بڑی سخت تھیں۔ جو بات ایک بار کہہ دیتی تھیں اس پر ہر صورت میں عمل کرا کر چھوڑتی تھیں۔ مجھے جھوٹ بولنے اور نوکرانی پر جھوٹا الزام لگانے کے قصور میں فرمایا:

"رات اندھیرے میں اُسی کمرے کے اندر بند رہو گی۔"

میں بہتیرا روتی چیختی۔ امّی کو ایک ابا جی ہی ضد سے باز رکھ سکتے تھے مگر وہ دنیا سے جا چکے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی ان سے کچھ کہنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا نتیجہ یہ کہ مجھے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ باہر سے امی نے کنڈی لگا دی۔ میں نے دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارے مگر امی کب سنتی تھیں میری۔ اندھیرے میں کمرے کے اندر میں بڑی خوف زدہ تھی، لیکن کر بھی کیا سکتی تھی۔ اچانک ایک ہلکی سی آواز آئی:

"چھوٹی بی بی!"

یہ آواز نوکرانی کی تھی۔ وہ ہی مجھے چھوٹی بی بی کہا کرتی تھی۔

"میں آپ کے پاس رہوں گی۔ بالکل نہ گھبرائیے۔" وہ بولی۔

اور وہ ساری رات میرے پاس رہی۔ باتیں کرتی رہی۔ مجھے ہر طرح تسلی دیتی رہی۔ اس کی موجودگی میں میں زیادہ نہ گھبرائی۔

صبح کی روشنی روشن دان سے اندر آئی تو وہ چلی گئی اور جاتے ہوئے دروازے کی کنڈی لگا گئی۔

امی نے مجھے معاف کر دیا۔ نوکرانی سے بھی معافی منگوائی اور یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا فرخندہ نے مسکرا کر ہر ایک کو دیکھا اور چند لمحے رُک کر بولی:

"یہ وہی نوکرانی ہے جس پر میں نے چوری کا الزام لگایا تھا، مگر جس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا تھا کہ ساری رات میرے پاس رہی تھی۔ میں اس کا احسان کبھی نہیں بھول سکتی۔" یہ کہہ کر فرخندہ خاموش ہو گئی۔

"بیٹی فرخندہ!" اس کی ساس بولی۔

"جی خالہ جان!"

"تمھاری یہ پرانی نوکرانی بڑی عزت اور احترام کے قابل ہے اور بیٹی، تم نے بہت اچھا کیا جو سب سے پہلے اس کے ہاں گئیں۔"

کراچی میں ہمدرد کی کتابیں

ہمدرد سینٹر ناظم آباد کے علاوہ اِن دُکانوں سے بھی ملتی ہیں۔

- طاہر بُک ڈپو، پریڈی اسٹریٹ، صدر
- البدر بُک کارپوریشن، پریڈی اسٹریٹ، صدر
- کراچی بُک ڈپو، اردو بازار
- البلال بُک سینٹر، اردو بازار
- علمی کتاب گھر، اردو بازار
- مدینہ پبلشنگ کمپنی، ایم۔ اے جناح روڈ
- السجاد اسٹیشنرز، نزد پاپوش ریلوے کراسنگ، ناظم آباد

رضیہ سُلطانہ

سیکڑوں برس پہلے کا ذکر ہے، ہندُستان کو فتح کرنے والا ایک بہادر بادشاہ تھا، جس کا نام تھا قطب الدین ایبک۔ یہ ان لوگوں میں سے تھا، جنھوں نے شمال کی طرف سے ہندُستان پر چڑھائی کی اور بہادری کے ساتھ لڑائی جیت کر اس ملک پر قبضہ کیا۔ پھر بھلائی اور انصاف کے ساتھ حکومت کرنے کے لیے یہیں ٹھیر گئے اور اس ملک کو اپنا وطن بنا کر ہمیشہ کے لیے رہ گئے۔

ہاں تو اسی قطب الدین کا ایک غلام تھا شمس الدین التمش۔ یہ بڑا لائق اور بہت وفادار آدمی تھا۔ بادشاہ کو اس سے بڑی محبّت تھی۔ وہ اس کی محنت اور ہوشیاری کو دل سے پسند کرتا تھا اور اتنا چاہتا تھا کہ اس نے اپنی بیٹی تک اس سے بیاہ دی تھی۔

جب قطب الدین ایبک اللہ کو پیارا ہوا تو اس کے بعد اس کا بیٹا ہندُستان کا بادشاہ بنا، مگر اس میں اتنی عقل اور سوجھ بوجھ نہ تھی کہ بادشاہی جیسا بڑا کام چلا سکتا، اس لیے حکومت کے امیروں اور سرداروں نے اسے ناپسند کیا اور شمس الدین کو بُلا بھیجا کہ وہ آکر بادشاہی کا کام سنبھالے۔ شمس الدین نے ان لوگوں کا کہنا مان لیا اور دہلی آکر انھی امیروں کی مدد سے قطب الدین کے بیٹے کو تخت سے اُتارا۔ اب یہی شخص جو پہلے قطب الدین کے یہاں ایک معمولی غلام کی طرح آیا تھا، اپنی قابلیت اور محنت سے ترقی کرتے کرتے ہندُستان کا بڑا مشہور بادشاہ ہو گیا اور سلطان شمس الدین التمش کہلایا۔

یوں تو شمس الدین کے کئی بچّے تھے، لیکن ان سب میں اُسے اپنی ایک لڑکی رضیہ سب سے زیادہ پیاری تھی۔ جس طرح شمس الدین صورت شکل کا بہت اچھا تھا، اس کی یہ بیٹی بھی بڑی خوب صورت تھی۔ شمس الدین جہاں کہیں بھی جاتا رضیہ کو ساتھ رکھتا۔

رضیہ کی ماں پڑھی لکھی نہ تھی، اس لیے رضیہ کو پڑھانے کا کام سلطان نے اپنے ذمّے

لیا۔ اسے ضروری تعلیم دی اور سلطنت کے قاعدے قرینے سکھائے۔ وہ بھی ذہن کی اتنی اچھی تھی کہ جو کچھ سکھایا جاتا بہت جلد یاد کر لیتی۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ اتنا لکھ پڑھ گئی کہ دربار کے سب امیر اور وزیر تعجب کرنے لگے۔ سلطان بیٹی کی یہ قابلیت دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتا اور دل ہی دل میں اس کے لیے دعا کرتا رہتا۔

دہلی کا قطب مینار دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ اسی بادشاہ شمس الدین کا بنا ہوا ہے اور اس پر عربی زبان میں جو کچھ لکھا یا کھدا ہے وہ اس کی چہیتی بیٹی رضیہ کی قابلیت ظاہر کرنے کے لیے بہت ہے۔

جس زمانے کا یہ قصّہ ہے ہندوستان کے بادشاہوں کو شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ ان کے ساتھ ان کی بیگمیں بھی جایا کرتی تھیں اور لونڈیاں اور نوکر چاکر بھی ساتھ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے، سلطان شیر کے شکار کے لیے نکلا۔ بیگمیں بھی پالکیوں میں بیٹھ کر ساتھ ہولیں۔ ان میں اکیلی رضیہ ہی ایسی تھی جو مردانہ لباس پہنے اور تمام

ہتھیار لگائے ہوئے گھوڑے پر بڑی شان کے ساتھ چل رہی تھی۔ باقی سب عورتیں پالکیوں میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ چلتے چلتے ان لوگوں کا گزر ایک گھنے جنگل سے ہوا جس میں بڑے بڑے ڈراؤنے اور پھاڑ کھانے والے جانور رہتے تھے۔ جب بیچ جنگل میں پہنچے تو یکایک ایک شیر پنجہ کھولے ہوئے ایک جھاڑی میں سے نکلا اور سلطان کی طرف جھپٹا۔ اس کا یہ حملہ اتنی تیزی سے ہوا کہ ساتھ کے سرداروں میں سے ایک کو بھی سلطان کے بچاؤ کے لیے ہتھیار اُٹھانے کا موقع نہ مل سکا۔ رضیہ جیسی بہادر عورت ڈرنا تو جانتی ہی نہ تھی۔ اس نے جو باپ کو ایسی نازک حالت میں دیکھا تو فوراً گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس کی مدد کو جا پہنچی اور قریب پہنچتے ہی تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ شیر پر مارا کہ شیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اگر یہ ذرا دیر اور نہ پہنچتے تو سلطان کو شیر پھاڑ ڈالتا۔ اس وقت سلطان کی جان صرف رضیہ کی بہادری، ہمت اور چستی سے بچی۔ سلطان نے بے ساختہ رضیہ کو گلے لگا کر کہا، "میری بچی، آج تُو نے اپنی بہادری سے باپ کی جان بچائی، میرے سوار اور سپاہی سب دیکھنے کے ہیں تو مردوں سے بھی زیادہ بہادر ہے۔" اس واقعے سے لوگوں پر رضیہ کی دھاک بیٹھ گئی اور سب پہلے سے زیادہ اس کا خیال رکھنے لگے۔

یہ قصہ اب سے کوئی سات سو برس پہلے کا ہے۔ شیر کے واقعے کے تھوڑے دن بعد سلطان شمس الدین کو کوئی علاقہ فتح کرنے کے لیے دہلی سے باہر جانا پڑا۔ وہ چاہتا تو اس کے کئی جوان بیٹے موجود تھے، ان میں سے کسی کو بھی اپنا نائب بنا دیتا مگر اس نے دیکھا کہ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو رضیہ کی طرح ہوشیار اور بہادر ہو۔ رضیہ ان ساری خوبیوں میں سب بھائی بہنوں سے بڑھی ہوئی ہے، اس لیے سلطنت کا کام سنبھالنے کے لیے اس نے رضیہ ہی کو پسند کیا۔ اس کے سب وزیروں نے بھی یہی رائے دی اور کہا کہ رضیہ سے زیادہ اچھا کوئی نہیں۔ سلطان نے اپنے جانے سے ایک دن پہلے دربار کیا اور بڑے بڑے امیروں اور سرداروں کے سامنے کہا، "آپ لوگ جانتے ہیں کہ خدا نے مجھے بیس بیٹے دیے ہیں مگر بادشاہی کا بوجھ بہت بڑا ہوتا ہے، اسے اٹھانا ان کے بس کی بات نہیں معلوم ہوتی۔ یہ خدا کی دین ہے کہ اس نے میری بیٹی رضیہ کو اتنی طاقت، ہمت اور سمجھ بوجھ دی ہے کہ ان بیس میں سے ایک میں بھی نہیں پائی جاتی۔ میں نے بہت سوچنے کے بعد فیصلہ

کیا ہے کہ جب تک میں لڑائی سے واپس نہ آؤں رضیہ ہی میری جگہ حکومت کرے تمھارا فرض ہے کہ جس طرح میرا حکم مانتے ہو اسی طرح اس کا بھی حکم مانو۔ سب لوگوں نے سر جھکایا اور وعدہ کیا کہ ہم جان و دل سے رضیہ کے حکم پر چلتے رہیں گے۔

اس کے بعد سلطان مہم پر روانہ ہو گیا اور کوئی چھے سال تک دہلی سے باہر رہا۔ اس مدت میں رضیہ ہی حکومت کرتی رہی۔ اس نے سلطنت کے کام بڑی عقل مندی اور بھلائی سے چلائے وہ خدا سے بہت ڈرتی تھی اور دعائیں کیا کرتی تھی کہ اس میں اتنی ہمت اور سمجھ دے کہ وہ بادشاہی کے سب کام اچھی طرح کر سکے۔ اس نے باپ کی جگہ ایسی بادشاہی کی کہ تمام وزیر اور امیر تو تعریف کرتے ہی تھے اُس کے بے ڈھنگے بھائی بھی یہ مان لینے پر مجبور ہو گئے کہ واقعی بادشاہی کا کام رضیہ ہی سنبھال سکتی تھی، اگر یہ کام ہمارے سپرد ہوتا تو ہم ہرگز اتنی اچھی طرح نہ کر سکتے تھے۔

جب سلطان واپس آیا اور اس نے دیکھا کہ رضیہ نے سارے کام قابلیت اور انصاف کے ساتھ کیے ہیں تو اس نے دل سے اس کی تعریف کی۔ اتنے دن بادشاہی کرنے کے بعد بھی رضیہ کی عادت اور طبیعت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لوگ عام طور سے دولت، طاقت اور حکومت پا کر بگڑ جاتے ہیں، مگر رضیہ ایسی نہ تھی، وہ جیسی اچھی پہلے تھی ویسی ہی اب بھی رہی۔ اس نے باپ کے آتے ہی بادشاہی کے سب کام باپ کے حوالے کر دیے اور آپ خاموشی کے ساتھ محل میں چلی گئی۔ اب اس نے پھر گھر گرہستی اور خانہ داری کے کام سنبھال لیے۔

کئی برس کے بعد سلطان شمس الدین کو ملتان جانے کی ضرورت پڑی اور وہ سفر کی تیاری کرنے لگا، مگر اب اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ سفر کی نوبت نہ آئی تھی کہ موت آ پہنچی۔

شمس الدین کے بعد لوگوں نے اس کے بیٹے رکن الدین کو بادشاہ بنایا، مگر وہ اس کام کے لائق نہ تھا۔ ایک تو وہ کم زور تھا دوسرے عیش و آرام کا بڑا شوقین تھا۔ دن رات سیر تماشے اور کھیل کود میں وقت گزارنا چاہتا تھا۔ بادشاہی ان باتوں کے ساتھ کہاں چل سکتی ہے۔ اُس نے خزانے کی دولت اور ہیرے جواہرات ناچنے گانے والیوں اور

اپنے کمینہ مُصاحبوں اور دوستوں پر لُٹانا شروع کر دیے اور بادشاہی کا کام اپنی جاہل اور بے وقوف ماں پر چھوڑ دیا۔ یہ عورت لوگوں کے ساتھ بڑا ظلم کرتی تھی اور اس کا طریقہ اور رکھ رکھاؤ اچھا نہ تھا۔ تھوڑے ہی دِنوں میں دربار کے سارے امیر اور وزیر ان ماں بیٹوں کے خلاف ہو گئے اور مشکل سے سات ہی مہینے رُکن الدین کو بادشاہی کرتے ہوئے گزرے ہوں گے کہ اُسے تخت سے اُتار دیا گیا۔ اب پھر اس بات پر غور ہونے لگا کہ رُکن الدین کی جگہ کِسے بادشاہ بنایا جائے۔ دربار کے امیروں میں ایسے لوگ بہت تھے جو رضیہ ہی کو بادشاہی کے قابل سمجھتے تھے، اس لیے سب نے آپس میں صلاح کر کے رضیہ سے درخواست کی کہ اب وہی تخت پر بیٹھے اور یہ سب کام سنبھالے۔ رضیہ نے مجبور ہو کر ان کا کہنا مانا اور ملکہ بننے پر راضی ہو گئی۔

تخت پر بیٹھی تو اس کا درباری لقب رضیہ سلطان مشہور ہوا اور اسی نام سے لوگ اُسے آج تک یاد کرتے ہیں۔ رضیہ نے بڑی بہادری کے ساتھ بادشاہی کی۔ وہ بڑی شان کے ساتھ تخت پر بیٹھتی مقدمات کے فیصلے کرتی اور سلطنت کے تمام معاملات میں ہر قسم کے ضروری حکم دیا کرتی۔ یہ نہ تھا کہ لوگ اُس کے عورت ہونے کی وجہ سے اس کو خاطر میں نہ لاتے ہوں یا اس کا حُکم ماننے میں ہچر مچر کرتے ہوں۔ ان پر اس کی بہادری اور قابلیت کا سکّہ ایسا بیٹھا ہوا تھا کہ درباری اس کے سامنے خوف کے مارے کانپنے لگتے تھے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دل کی سخت یا ظالم تھی یا لوگوں کو ستاتی اور دُکھ دیتی تھی۔ اس لیے لوگ اس سے ڈرتے رہتے تھے۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ قاعدے قانون کی سختی سے پابندی کرتی تھی اور سب کاموں میں انصاف اور سچائی کا بڑا خیال رکھتی تھی۔ جہاں کسی نے کسی پر کوئی زیادتی کی اُس نے فوراً بڑی سختی کے ساتھ سزا دے دی۔ اسی لیے اس کی حکومت بڑی مضبوطی سے چلتی رہی۔

دنیا میں لوگ جہاں اچھے آدمی کو پسند کرتے ہیں تو بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اسی اچھے آدمی کو ناپسند کرتے ہیں اور اس سے بے وجہ جلنے لگتے ہیں اس قسم کے لوگ زیادہ تر وہی ہوتے ہیں، جن کے طور طریقے اچھے نہیں ہوتے۔ چوں کہ رضیہ سلطان نے اپنے دربار کے لوگوں میں ایسے آدمیوں کو سخت سزائیں دی تھیں جو لوگوں سے رشوت لیتے اور

لوٹ مار کیا کرتے تھے اس لیے اس قسم کے بُرے لوگ رضیہ کے دشمن بن گئے۔ انھوں نے اس کے دشمنوں سے مِل کر جھوٹی سچّی باتیں مشہور کرنا شروع کر دیں اور بے چاری رضیہ سلطان کو جی بھر کے بدنام کیا۔ دشمنوں کی یہ جماعت پرانے وزیر کی سرداری میں زور پکڑ رہی تھی؛ آہستہ آہستہ دربار کے تمام بڑے بڑے طاقت ور امیر اس گروہ میں شامل ہو گئے اور انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم ایک عورت کی حکومت برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم اس کے آگے سر جھکانے سے نفرت کرتے ہیں۔

اب ان لوگوں کا زور اتنا بڑھ گیا تھا کہ یہ کوئی چھپے دشمن نہیں رہے تھے۔ آخر ان لوگوں نے بہت سی فوج جمع کر کے کُھلم کُھلا بغاوت کر دی اور دہلی کی فصیل کے باہر اکٹھے ہو کر انتظار کرنے لگے کہ کب موقع آئے کہ رضیہ سلطان کو تخت سے اُتار دیں۔ یہ حال دیکھ کر رضیہ کے بعض امیروں اور سرداروں نے اس کی مدد کو جانا چاہا تو باغیوں نے انھیں طرح طرح کے وعدے کر کے اور رضیہ کے متعلق بہت سی غلط سلط تہمتیں لگا کر اپنی طرف کر لیا، لیکن یہ رضیہ ہی کی ہمّت اور اس کا زور تھا کہ باغی اسے جتنی تکلیفیں دے سکتے تھے، رضیہ نے اس سے زیادہ خود باغیوں کو ہی پریشان کر ڈالا۔ اس نے ایسی ہوشیاری اور چالاکی سے کام لیا کہ خود ان کے آپس میں پھوٹ پڑ گئی اور وہ ایک دوسرے پر شک کرنے لگے۔ آخر انھیں اپنا پڑاؤ چھوڑنا پڑا اور وہ سب اِدھر اُدھر پناہ لینے کے لیے نکل بھاگے۔

اس کام سے فرصت پا کر رضیہ پھر پہلے کی طرح بڑی مستعدی سے حکومت کرنے لگی۔ وہ مَردوں کا سا لباس پہن کر دربار کرتی، مظلوموں سے انصاف کرتی اور ظالموں کو ان کے کیے کی سزا دیتی۔ اس کو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کا ایسا ڈھب آتا تھا کہ لوگ اس کی دل سے تعریف کرتے اور یہ سمجھتے کہ حق اور ناحق کو سمجھنا رضیہ کی پیدائشی عادت ہے۔ وہ بغیر ڈرے اور جھجکے ہوئے ظلم کرنے والوں کو کچل کر رکھ دیتی تھی۔ ان خوبیوں کی وجہ سے اس کی رعایا دل سے اس پر بھروسا کرتی تھی اور اپنے آپ کو اس کی بادشاہی میں بہت زیادہ محفوظ سمجھتی تھی۔

کچھ دِنوں تک اس کی فوج کا یہ حال رہا کہ سب سپاہی اور حاکم اس پر جان چھڑکنے

کے لیے تیار رہتے تھے، مگر ایک زمانہ ایسا آیا کہ ایک حبشی سردار کی وفاداری اور قابلیت نے رضیہ سلطان کے دل میں بہت گھر کر لیا۔ اس نے اس سردار کو جلدی جلدی ترقی دینا شروع کی تو یہ بات اور امیروں کے دل میں بُری طرح کھٹکنے لگی۔ وہ اندر ہی اندر جلنے لگے۔ ساتھ ہی دشمنوں کو موقع مل گیا۔ انھوں نے فوج کے لوگوں کو رضیہ کی طرف سے بدگمان کرنا شروع کر دیا، مگر ان کی یہ سب حرکتیں شرارت کی وجہ سے تھیں۔ صرف اس وجہ سے جلتے تھے کہ انھیں عورت کا حکومت کرنا بالکل پسند نہ تھا تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ لاہور کا صوبہ دار باغی ہو بیٹھا۔ رضیہ نے پھر ہمت اور حوصلے سے کام لیا اور ہوشیاری کے ساتھ باغیوں کی روک تھام کرنے لگی۔ جب سب کام ٹھیک ہو گئے تو ایک بہت بڑی فوج ساتھ لے کر باغی صوبہ دار سے لڑنے کے لیے نکلی اور اس سے مقابلہ کر کے اسے شکست دی۔

اس کے تھوڑے دن بعد بھٹنڈہ کے صوبہ دار نے سر اُٹھایا۔ اس مرتبہ بھی رضیہ خود ہی لڑنے کے لیے چلی، مگر اب اس کی قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ جو امیر ظاہر میں اُس کے دوست بنے ہوئے تھے مگر دل میں اس کے دشمن تھے اور موقع کا انتظار کر رہے تھے، انھوں نے فوج کے اکثر لوگوں کو بہت سا روپیہ رشوت دے کر رضیہ سے بے وفائی کرنے پر تیار کر لیا تھا۔ اب جو رضیہ نے لڑائی پر جانا چاہا تو ان کی چال چل گئی اور انھوں نے ایک دم آنکھیں پھیر کر رضیہ سلطان کو قید کر لیا، پھر اس حبشی سردار کو پکڑ کر رضیہ کی آنکھوں کے سامنے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ جس وقت اس کی فوج کے باغی رضیہ کو قید کرنے لگے تو اُس نے انھیں بہت سمجھایا بجھایا اور ان کے وعدے اور اقرار یاد دلا کر طرح طرح کے وعدے کیے، مگر ان ظالموں نے ایک نہ سُنی اور اُسے اپنے ساتھ لے جا کر بھٹنڈہ کے حاکم کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد یہ لوگ جلدی سے دہلی پہنچے اور رضیہ کے بھائی بہرام شاہ کو بادشاہ بنا دیا، جو بڑا چھچھورا اور طبیعت کا بہت کمینہ تھا، عیش اور آرام کا بھی بہت عادی تھا، مگر باغیوں پر تو غصّے کا بھوت سوار تھا، وہ ان باتوں کو بھلا کب سوچ سکتے تھے، انھیں تو فقط رضیہ کی دشمنی سے کام تھا۔

اُدھر رضیہ کا یہ حال ہوا کہ جب یہ بھٹنڈے کے حاکم کے سامنے پہنچی تو حاکم کو اس

کی قابلِ رحم حالت دیکھ کر ترس آ گیا۔ وہ اس کی خوب صورتی، عقل مندی اور سمجھ بوجھ کی وجہ سے اس سے محبت کرنے لگا۔ اس نے رضیہ کو قید سے آزاد کر دیا اور بہت عزت اور ہمدردی کا برتاؤ کیا، پھر تھوڑے ہی دنوں بعد رضیہ کو سمجھا بجھا کر اس سے شادی کر لی۔ اب یہ دونوں ہنسی خوشی اور چین کی زندگی گزارنے لگے۔ پھر جب رضیہ نے دیکھا کہ اب شوہر کو بہت زیادہ محبت ہو گئی ہے اور وہ اس کی ہر خوشی پوری کرنے پر تیار رہتا ہے تو ایک بار موقع پا کر شوہر کو دہلی پر فوراً چڑھائی کرنے کی صلاح دی اور کہا کہ بہرام نام کا بادشاہ ہے، باغیوں کے اشارے پر ناچتا رہتا ہے، ہم لڑائی بڑی آسانی سے جیت لیں گے، پھر تم بادشاہ بننا اور میں ملکہ۔ دونوں بڑے اطمینان سے بادشاہی کریں گے، مگر قسمت نے اب بھی ساتھ نہ دیا۔ رضیہ کی فوجیں ہار گئیں اور وہ اور اس کا شوہر دونوں پکڑے گئے اور بہرام کے حکم سے قتل کر دیے گئے۔ اور اس طرح ہندوستان کی اس بہادر، نڈر اور شیر دل ملکہ کا افسوس ناک انجام ہوا۔ افسوس صد افسوس۔

صحت کی الف بے

مسعود احمد برکاتی

جس طرح خوش بُو اور رنگ یک جا ہوتے ہیں اُسی طرح کردار اور صحت بھی یک جان ہوتے ہیں۔

صحت کی الف بے میں صحت و تن دُرستی کی بنیادی باتیں آسان اور انتہائی دل کش انداز میں پیش کی گئی ہیں۔

باتوں باتوں میں
کام کی باتیں

قیمت: ——— چار رُپے

ہمدرد فاؤنڈیشن، ہمدرد سنٹر
ناظم آباد کراچی ۱۸۔

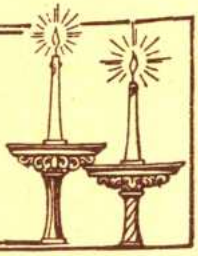

آٹھویں سال گرہ

معراج

ایک دن کا ذکر ہے کہ نیک دل اور مہربان جادوگر بربروس کسی کام سے جا رہا تھا۔ راستے میں اسے دو جڑواں بھائی ملے۔ وہ بربروس کو اتنے پیارے معلوم ہوئے کہ وہ ان سے بات چیت کرنے کے لیے ٹھیر گیا۔ اُن کے بھولے اور معصوم چہروں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی۔ ان کے مضبوط اور توانا جسموں میں پھرتی اور چستی بھری ہوئی تھی۔ جادوگر بربروس بہت شفقت سے بولا "کیوں میاں، کیا تم جڑواں بھائی ہو؟ تمھاری شکلیں تو بالکل ایک جیسی ہیں۔"

ایک لڑکا بولا، "آپ نے ٹھیک فرمایا ہے۔ ہم دونوں جڑواں بھائی ہیں۔ ہم ایک ہی دن پیدا ہوئے تھے۔ اس جمعرات تو قیر آٹھ سال کا ہو جائے گا۔"

دوسرا لڑکا یعنی توقیر بولا، "اُسی دن تو صیف بھی آٹھ سال کا ہو جائے گا۔"

جادوگر بربروس قہقہہ لگا کر بولا، "بہت خوب، اس کا مطلب ہے کہ جمعرات کو تمھاری سال گرہ منائی جا رہی ہے؟ بھئی مجھے بھی دعوت میں بُلانا۔ مجھے ایسی دعوتوں میں شریک ہونے کا بہت شوق ہے۔"

توصیف بولا، "جی ہاں، ہم آپ کو اس پارٹی میں ضرور بُلائیں گے۔ دادا جان نے تو ہمیں پانچ پانچ رُپے پہلے ہی دے دیے ہیں تاکہ ہم اپنی پسند کے تحفے خود ہی خرید لیں۔"

بربروس بہت دل چسپی سے بچّوں کی باتیں سُن رہا تھا۔ اس نے کہا،

"ضرور تم نے کھلونے یا دل چسپ کہانیوں کی کتابیں خریدی ہوں گی یا پھر گیند بلّا اور فُٹ بال خریدی ہو گی۔"

توصیف مسکرا کر بولا، "غلط، بالکل غلط۔ ہم نے ان پیسوں سے اپنے لیے ٹافیاں، چیونگم، لال سپاری اور کھٹی میٹھی گولیاں خریدیں۔"

تو قیر نے کہا، "اور چٹخارے دار املی اور کچّے امرود بھی لیے۔"

جادوگر بربروس گھبرا کر بولا، "پیارے بچّو، یہ سب چیزیں تو صحت کے لیے سخت مُضر ہیں، خاص طور پر سپاری اور چٹخارے دار املی تو بہت ہی نقصان دہ ہے۔ اسے کھانے سے کھانسی اور تیز بخار ہو سکتا ہے۔ پھر کچّے امرود بھی بہت نقصان دیتے ہیں۔ بھئی اگر تم میرا مشورہ مانو تو ان چیزوں سے پرہیز ہی رکھنا۔"

توصیف بولا، "معاف کیجیے گا، ہم یہ چیزیں کھا پی چکے ہیں۔ کاش کہ آپ ہم سے ذرا دیر پہلے ملے ہوتے تو ہم آپ کی باتوں پر پوری طرح عمل کرتے۔"

جادوگر بربروس نے کہا، "اچھا بھئی خدا خیر رکھے۔ اب میں تم سے سال گرہ کے دن ملوں گا، خدا حافظ!"

جادوگر بربروس اگلے موڑ پر پہنچا تو اس نے منتر پڑھا اور ہوا میں غائب ہو گیا۔ دراصل وہ ان لڑکوں کا پیچھا کر کے ان کے گھر کا پتا معلوم کرنا چاہتا تھا۔ وہ ان لڑکوں کو سال گرہ کا تحفہ دینا

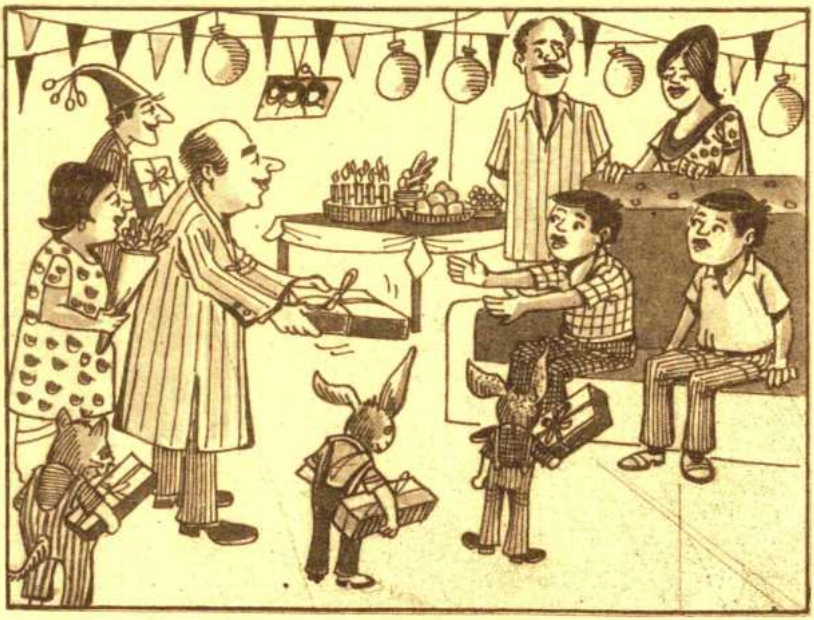

چاہتا تھا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ان کے گھر تک پہنچ گیا۔ اس نے اپنی نوٹ بک میں مکان کا نمبر اور پتا لکھا اور واپس چلا گیا۔

جمعرات کا دن بھی آ پہنچا۔ جادوگر بربروس نے دو بہت خوب صورت کھلونے خریدے، پھر وہ ان بچّوں کے گھر پہنچا۔ اس نے گھنٹی بجائی۔ کچھ دیر بعد لڑکوں کی والدہ نے دروازہ کھولا۔ وہ ایک اجنبی کو دروازے پر دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔

بربروس نے بہت اخلاق سے سلام کیا اور بولا، "خاتون، کیا میں توصیف اور توقیر سے مل سکتا ہوں؟"

وہ خاتون بولی، "جی نہیں، وہ آپ سے نہیں مل سکیں گے۔"

بربروس نے حیران ہو کر پوچھا، "وہ کس لیے بھلا؟"

خاتون بولی، "کیا کبھی آپ کو کالی کھانسی کا مرض لاحق ہوا ہے؟"

بربروس نے اور زیادہ حیران ہو کر کہا، "کالی کھانسی؟ خاتون میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔"

خاتون بولی، "بھائی، بات یہ ہے کہ دونوں بچّوں کو کالی کھانسی ہو گئی ہے۔ آج صبح ڈاکٹر نے معائنے کے بعد کہا کہ دونوں بچّوں کو یہ مرض ہے۔ دیکھیے کتنی پریشانی کی بات ہے۔ آج ہی کے دن ان کی سال گرہ بھی ہے۔"

جادوگر بربروس نے پوچھا، "کیا سال گرہ پارٹی ملتوی کر دی گئی ہے؟"

خاتون بولی، "جی ہاں ایسا کرنا ہی پڑا۔ یہ چھوت کی بیماری ہے، یعنی ایک شخص سے دوسرے کو لگ جاتی ہے۔ اس لیے ہمیں ان بچّوں کو سب سے علاحدہ رکھنا پڑا۔"

بربروس نے پوچھا، "کیا وہ بستر میں لیٹے ہوئے ہیں؟"

خاتون نے کہا، "انھیں بخار نہیں ہے، بس شدید قسم کی کھانسی ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے کھانسی کا شدید دورہ پڑتا ہے۔ بچّے کھانس کھانس کر بے حال ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو اندر آ کر انھیں دیکھ لیں۔"

بربروس نے کہا، "میں اپنے چھوٹے چھوٹے دوستوں سے ضرور ملوں گا۔"

خاتون جادوگر بربروس کو مکان کے اندر لے گئی۔ دونوں بچّے بے حد رنجیدہ دکھائی

دے رہے تھے۔ بربروس نے خوش دلی سے کہا، "دوستو، سال گرہ مبارک ہو۔"

توصیف آنسو پونچھ کر بولا، "ہمیں عین سال گرہ کے دن کھانسی ہو گئی۔ اس منحوس مرض نے ہماری سال گرہ پارٹی کا مزہ خراب کر دیا۔"

جادوگر بربروس مسکرا کر بولا، "بھائی، یہ مرض تو تم نے خود ہی مول لیا ہے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ سپاری اور چٹخارے دار املی بہت مضر ہے، اسے کھاتے سے کھانسی اور دوسری بیماریاں ہو سکتی ہیں۔"

دونوں بچے منہ بسورنے لگے۔ بربروس نے کہا، "یہ دیکھو، میں تمھیں ایک فلم دکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر بربروس نے اپنے تھیلے سے ایک مشین نکالی اور اس کا بٹن دبا دیا۔ سامنے دیوار پر تصویریں آنے لگیں۔ ایک جگہ چٹخارے دار املی بنائی جا رہی تھی۔ املی پر بے شمار مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ گندے غلیظ لوگ اپنے گندے ہاتھوں سے املی کو پیکٹوں میں بند کر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ بُری طرح کھانس رہے تھے۔ ایک جگہ دمے کا مریض کھانس رہا تھا۔ وہ لالی پاپ کو منہ سے چُوس کر گیلا کرتا پھر اس پر ایک مشہور کمپنی کا لیبل چپکا دیتا۔

یہ دیکھ کر دونوں بھائیوں کو متلی ہونے لگی۔ بربروس نے مشین بند کر دی۔

توصیف بولا، "ہم نے سال گرہ پارٹی کے لیے بہت انتظام کیا تھا۔ سال گرہ کیک، میٹھے اور نمکین بسکٹ، ناریل کے سموسے، پھل فروٹ اور اس کے علاوہ چائے۔ یہ سب چیزیں پڑی سڑتی رہیں گی۔ کاش آج ہمارے دوست یہاں ہوتے اور ان چیزوں سے لطف اندوز ہوتے۔"

بربروس نے مسکرا کر کہا، "اگر تم چاہو تو میں اپنے دوست یہاں لا سکتا ہوں۔ انھیں کالی کھانسی کی کوئی فکر اور پروا نہیں ہے۔ میرے یہ دوست بہت خوش مزاج ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی انھیں پسند کرو گے۔"

توقیر نے خوش ہو کر کہا، "اوہو، پھر تو بہت مزہ آئے گا۔ آپ امّی جان سے بات کر لیجیے۔"

بربروس نے اپنے تحفوں کے پیکٹ میز پر رکھے اور بچّوں کی ماں کے پاس گیا۔ اُس نے پوری بات سُنائی اور اپنے دوستوں کو وہاں لانے کی اجازت مانگی۔

وہ ہنس کر بولی، "آپ بہت شریف، خوش اخلاق اور زندہ دل شخص ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے دوست بھی آپ کی طرح زندہ دل اور خوش مزاج ہوں گے۔ اگر آپ چاہیں تو بارہ دوستوں

کو لے آئیے۔ ہمارے پاس کھانے پینے کا سامان کافی ہے۔"

بربروس نے کہا" میں چار بجے اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں آؤں گا۔"

بربروس دوڑتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ اس نے بہت زور سے دروازہ کھولا۔ شور کی آواز سُن کر بلّی ڈر گئی۔ بربروس نے کہا،"بی کلّو، جلدی سے دس بارہ آدمیوں کے نام گنواؤ جو کالی کھانسی سے پرہیز نہ کرتے ہوں۔ جلدی کرو، ہمیں چار بجے پارٹی میں جانا ہے۔"

بلّی بولی" میں آؤں (میاؤں)، میں کالی کھانسی سے نہیں ڈرتی۔ بلّیوں کو کبھی کالی کھانسی نہیں ہوا کرتی۔"

بربروس نے خوش ہو کر کہا" ٹھیک ہے۔ میں ابھی بازار سے تمھارے لیے نیا ربن لے آتا ہوں۔ اب میرے ساتھ آؤ۔ ہم کچھ اور لوگوں کو تلاش کریں۔"

وہ دونوں کچھ اور لوگوں کی تلاش میں باہر نکل گئے۔

ٹھیک چار بجے انھوں نے ان بھائیوں کے مکان پر دستک دی۔

ان بارہ مہمانوں میں ایک تو خود میاں بربروس تھے۔ گول مٹول لال گلابی چہرے اور نیلی آنکھوں والا ہنس مکھ جادوگر، اس کے پیچھے کلّو بلّی، اس کے گلے میں بنا خوب صورت سا ربن بندھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے گلزار بانو تھی، ایک چھوٹے سے قد کی موٹی سی عورت۔ جب وہ چلتی تو یوں لگتا جیسے لڑھک رہی ہے۔ پھر کو لمبو خاں تھے۔ ایک بہت لمبے قد کا دُبلا پتلا شخص اس کی ٹوپی میں چاندی کے گھنگھرو بندھے ہوئے تھے۔ جب وہ چلتا تو ہر ہر قدم پر چھَن چھَنا چھَن کی آواز نکلتی تھی۔ پھر دو بونے تھے۔ ساتویں اور آٹھویں نمبر پر دو بڑے بڑے خرگوش تھے، جو بہت شرمیلے انداز میں کھڑے ہوئے تھے۔ نویں نمبر پر لمبی داڑھی والا بوڑھا تھا۔ اس کی داڑھی اتنی لمبی تھی کہ اس نے اپنی کمر سے پیٹ رکھی تھی اور اپنے فرغُل کے اندر چھپائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد تین بونے تھے۔ ان کی ناکیں اتنی لمبی تھیں کہ زمین کو چھُو رہی تھیں۔ وہ اتنے ہنسوڑ تھے کہ انھیں دیکھ کر ہر کوئی کھلکھلا کر ہنس دیتا۔

توصیف اور توقیر کے والدین ان عجیب و غریب مہمانوں کو دیکھ کر حیران تو ہوئے، لیکن کچھ بولے نہیں۔ انھوں نے بہت خوش دلی سے ان مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ جب توصیف اور توقیر نے ان عجیب مہمانوں کو دیکھا تو وہ بہت خوش ہوئے۔

جادوگر بربروس نے قہقہہ لگا کر کہا، "میاں، تم نے وہ ضرب المثل تو سُنی ہو گی کہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ تمھارے والدین نے بارہ مہمان لانے کے لیے کہا تھا۔ سو اس تعداد کو پورا کرنے کے لیے میں یہ لوگ ساتھ لیتا آیا۔"

مہمانوں میں سے ہر ایک کے پاس کچھ نہ کچھ تحفہ تھا۔ بے چارے خرگوش بہت غریب سے تھے۔ وہ اپنے ساتھ پھولوں کے گُچھے ہی اُٹھا لائے تھے۔ جڑواں بھائیوں نے اس تحفے کی بہت تعریف کی اور انھیں گل دان میں سجا دیا۔ گلزار بانو نے ایک گلاس تحفے میں دیا۔ کو لمبو خان اور دوسرے مہمانوں نے بھی اچھے اچھے تحفے دیے۔

پھر آنکھ مچولی کا کھیل شروع ہوا۔ خرگوش اور بلّیاں تو بھلا کسی کے ہاتھ کیا آتیں البتہ بربروس ہر بار پکڑا جاتا، کیوں کہ وہ جہاں بھی چھپتا، اس کی ہنسی کی آواز سے فوراً اس جگہ کا پتا چل جاتا۔ کو لمبو خان کی چاندی کی گھنٹیاں بھی چھن چھن بج کر اس کا پتا بتا دیتیں۔ چائے کا دَور شروع ہوا تو گول مٹول گلزار بانو نے بسکٹوں کا ڈبّا نکال کر میز پر رکھ دیا۔ یہ بسکٹ بھی جانوروں اور کھلونوں کی شکل کے بنے ہوتے تھے۔ تو قیر نے انجن کی شکل کا بسکٹ اُٹھایا۔ جب اسے ذرا سا دبایا تو اس میں بھرا ہوا مکھن اور جام باہر ٹپکنے لگا۔ بربروس نے جیب سے ایک چابی کا چوہا نکالا اور اس میں چابی بھر کر چھوڑ دیا۔ بی بلّی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ بربروس نے کہا، "اسے پکڑ کر دکھاؤ۔"

اب چوہا آگے آگے اور بلّی اس کے پیچھے پیچھے۔ وہ ہڑبونگ مچی کہ توبہ بھلی۔ سب لوگ ہنس ہنس کر دُہرے ہو گئے۔ چوہا بلّی کے ہاتھ نہ آسکا۔ پھر کو لمبو خان نے یہ گیت گایا:

اگر خرگوش کا بچّہ کہیں جنگل میں ہو سوتا
اسے میرا پتا دینا اُسے اتنا بتا دینا
کہ تیرے کان لمبے ہیں یا بجلی کے کھمبے ہیں

اس پر بہت تالیاں بجائی گئیں۔ خرگوش نے کان پھڑپھڑا کر داد دی۔ اس کے بعد ایک بونے نے گیت گایا:

باجی کا بلّا مر گیا دنیا کو سُونا کر گیا
کتّے سے تو ڈرتا نہ تھا بلّی سے شاید ڈر گیا
افسوس بلّا مر گیا

اس پر بھی بہت تالیاں بجائی گئیں۔ کلّو بلّی بھی میاؤں میاؤں کر کے داد دیتی رہی۔ اب گول مٹول گلزار بانو کی باری تھی۔ وہ کمرے میں دوڑ لگانے لگی۔ اس کی ٹانگیں بہت چھوٹی چھوٹی سی تھیں، اسی لیے یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ لڑھکتی ہوئی پھر رہی ہو۔ اب بربروس کی باری آئی اس نے کوئی منتر پڑھا اور غائب ہو گیا۔ ذرا دیر بعد وہ پھر وہیں کھڑا تھا پھر پلک جھپکتے ہی دوبارہ غائب۔ اس نے یہ کرتب بار بار کر کے دکھایا۔

توقیر نے بربروس سے یہ منتر سکھانے کی درخواست کی۔ بربروس نے یہ منتر اُسے سکھا دیا۔ جب توقیر نے یہ منتر پڑھا تو صرف اس کی ٹانگیں غائب ہو گئیں۔ اوپر کا دھڑ ویسے کا ویسا ہی نظر آ رہا تھا۔ سب لوگوں نے خوب قہقہے لگائے۔ اب میوزک چیئرز کا وقت آ گیا۔ موسیقی کی دُھن پر سب لوگ اُچھل اُچھل کر چلتے۔ جب موسیقی بند ہو جاتی تو ہر شخص کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کرتا۔ جو رہ جاتا وہ مقابلے سے خارج ہو جاتا۔ اس میں بربروس ہی اوّل رہا۔ وہ اپنے منتر کے ذریعہ سے کرسی کو کھینچ کر اس پر بیٹھ جاتا۔ لوگوں نے اس حرکت کا بُرا نہیں مانا بلکہ سب لوگ دیر تک ہنستے رہے۔

توصیف اور توقیر نے کچھ غبارے پھاڑے۔ اس کے دھماکے کی آواز سے خرگوش اور بلّی سہم کر اپنی اپنی جگہ دُبک گئے۔ ان کا خوب مذاق اُڑایا گیا۔ سب سے آخر میں کیک کاٹا گیا۔ سب مہمانوں نے "ہیپی برتھ ڈے ٹو یُو" گایا اور پھر سب لوگ ایک آواز ہو کر گیت گانے لگے:

سب نے یہ شور مچایا ہے سال گرہ کا دن آیا ہے

اچانک باہر دستک کی آواز سُنائی دی۔ ایک ڈاکیا کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے دونوں بھائیوں کو ایک ایک پیکٹ دیا۔ یہ ان کے لیے کسی نے تحفہ بھیجا تھا۔ توصیف نے پیکٹ کھولا تو اس میں چٹخارے دار املی نکلی۔ توقیر کے پیکٹ سے کھٹی میٹھی گولیوں اور رسیلی سپاریوں کا تحفہ نکلا۔ دونوں بھائیوں نے نفرت اور حقارت سے یہ تحفے دُور پھینک دیے۔ وہ دونوں سمجھ گئے کہ یہ جادوگر بربروس کی شرارت ہے۔

توصیف بولا "انھی چیزوں کی وجہ سے آج ہمارا یہ حال ہوا ہے۔"

بربروس نے قہقہہ لگا کر کہا "تمھارا مطلب ہے کہ ٹافیوں کے دام اور بیماریاں مفت۔"

اتنے میں باہر موٹر کے ہارن کی آواز سُنائی دی۔ بربروس نے دونوں بھائیوں سے رخصت چاہی۔

توصیف نے کہا، "آج کی پارٹی بے حد شان دار رہی۔ آپ کے تشریف لانے کا بے حد شکریہ۔"

توقیر بولا، "اگر آپ لوگ تشریف نہ لاتے تو ہمارا دن بہت بور گزرتا۔ آپ سب کا بے حد شکریہ۔"

جادوگر بربروس اور اس کے دوست رخصت ہوئے۔ توقیر اور توصیف نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ باہر ایک رنگ برنگی بس کھڑی تھی۔ سب مہمان بس میں سوار ہوئے اور بس آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

توصیف نے کہا، "بربروس کتنا اچھا اور مہربان شخص ہے۔ جب ہم اکیلے پڑے ہوئے بور ہو رہے تھے تو اس نے ہمیں خوشی اور تفریح پہنچائی۔"

توقیر بولا، "اس نے ہمیں ایک بہت عمدہ نصیحت بھی تو کی ہے۔ املی کے دام دو، بیماری مفت لو۔"

کیسے بھول جاؤں

حکیم محمد سعید

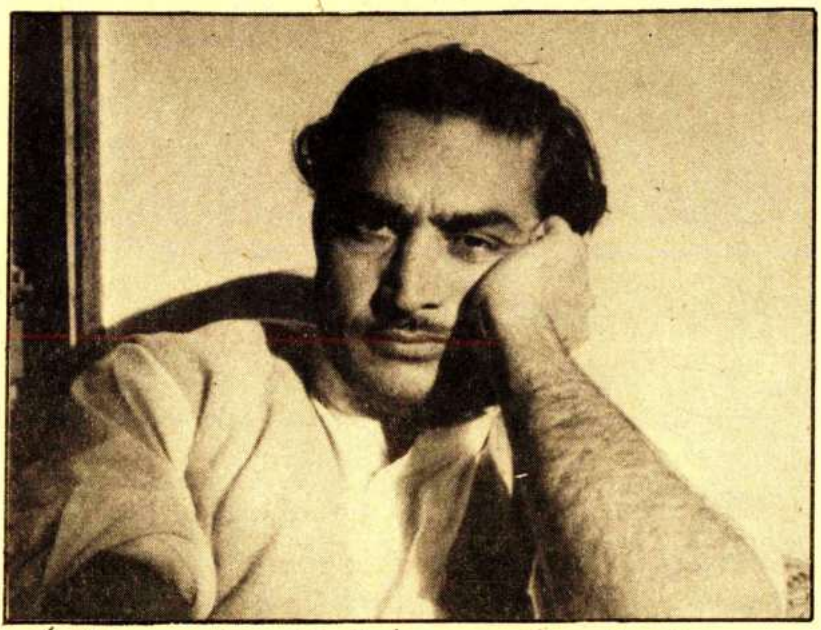

جب میں تین سال سے ذرا کم عمر میں محترم اُستانجی (چچی جان) کے ہاں ناظرہ قرآنِ حکیم پڑھنے کے لیے بٹھایا گیا تو وہاں کا ماحول بڑا دل چسپ تھا۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ پہلے دن جب وہاں پہنچا تو گھر کے صحن میں جمنا کی بڑی چمکتی ریت جمع تھی۔ ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ریت نم تھی۔ دوسرے بچّوں کے ساتھ میں بھی ریت سے کھیلنے لگا۔ ریت میں پیر دبا کر مکان بنانا تعمیر کا دل چسپ مشغلہ تھا اور خوب تھا۔ نرم ریت میں پیر ڈالا۔ اوپر سے مزید ریت جمائی، تھپ تھپایا، پیر نکال لیا۔ اندر خلا رہ گیا جیسے۔ گویا مکان بن گیا۔ میں نے دیکھتے ہی دیکھتے ریت

کے ڈھیر کے چاروں طرف کٹی مکان بنا ڈالے۔ خیر ابتدا اس طرح تعمیری جدوجہد سے ہوئی۔

اس گھر میں ڈھیر سارے کبوتر تھے، زیادہ تر سفید! استانجی (چچی جان) اور چچا جان دونوں کبوتروں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ رات کی باسی روٹیاں صبح دونوں میاں بیوی لے کر بیٹھ جاتے اور ننھے ننھے ٹکڑے کر کے کبوتروں کے آگے ڈالتے۔ کبوتر بڑے شوق سے کھاتے۔ مجھے یہ منظر بڑا ہی بھاتا تھا۔ جلد ہی یہ کام میں نے بھی شروع کر دیا اور کبوتر مجھ سے خاصے مانوس ہو گئے۔

ایک دن اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ چچی جان دورے پر نکل گئیں اور چچا جان تھانہ حوض قاضی ڈیوٹی پر۔ گھر میں بہت سارے بچے اور بچیاں میری ہم جماعت۔ میں گویا مانیٹر! نہ جانے کیا دل میں آئی کہ سیڑھی لگا میں کبوتروں کی کابک میں پہنچ گیا اور اندر گھس کر سب سے زیادہ خوب صورت موٹے سے کبوتر کو اپنے ننھے ہاتھوں میں دبوچ لیا اور لگا پیار کرنے۔ وہ بڑا طاقت ور نکلا۔ زور مارا اور میرے ہاتھوں سے نکل گیا اور دُم اس کی میرے ہاتھ میں رہ گئی۔

اس صورتِ حال نے تین کیفیتیں بہ یک وقت پیدا کیں۔ ایک: کبوتر کی تکلیف کہ اس کی پوری سفید دُم میرے ہاتھ میں رہ گئی اور وہ بغیر دُم رہ گیا۔ دوسرے: خوف کہ چچی جان اور چچا جان پوچھیں گے تو کیا جواب دوں گا۔ اس حادثے کے عینی گواہ ۱۵-۱۶ بچے تھے۔ تیسرے: ناکامی کہ کبوتر ہاتھ سے نکل گیا۔

رات گزر گئی۔ صبح جب ماموں فضل استانجی کے ہاں چھوڑنے آئے تو چچا چچی دونوں کبوتروں کو دانہ چُگا رہے تھے۔ ان میں بے دُم کبوتر بھی تھا! اُسے دیکھ کر ایک بار تو میرا دَم ہی تو نکل گیا!

"سعید بیٹے، اس کبوتر کی دُم کو آخر کیا ہو گیا؟"

میرے قریب جا کر بیٹھتے ہی چچا جان نے سوال کیا۔ میں نے گہرا سانس لیا اور پھر حقیقت جو گزری تھی سچ سچ بیان کر دی۔ اس سچ پر چچی جان کا تاثر یہ تھا کہ "کیسا نڈر ہے، منھ در منھ باتیں کر رہا ہے"۔ مگر چچا جان کے تاثرات بالکل مختلف تھے۔ میری سچائی پر وہ واقعی خوش ہوئے اور صرف یہ کہا کہ کبوتر کو تکلیف ہوئی ہے۔ ایسا ہونا بُرا ہوا۔ یہ افسوس تو خود مجھے بھی تھا۔ چچی جان نے بہر حال کٹی پابندیوں میں جکڑ دیا، جس سے میرے دل میں بغاوت

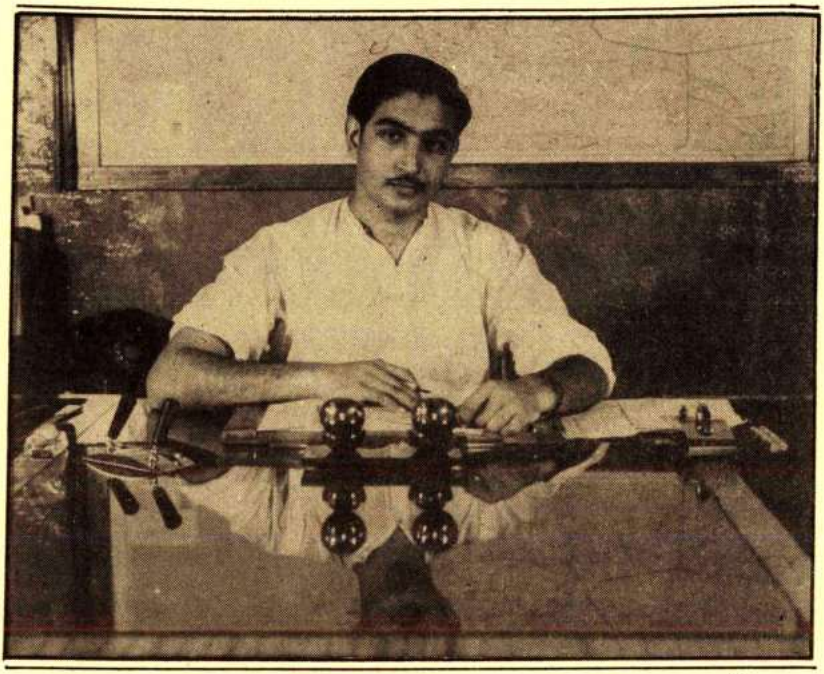

پیدا ہوئی۔

ادھر جب میں ذرا بڑا ہوا اور ناظرہ قرآن ختم کر کے پانچ سال کی عمر میں حافظ سید عمر دراز علی صاحب کے ہاں حفظِ قرآن کے لیے بٹھایا گیا تو وہاں کبوتروں کا شوق اُٹھا۔ آپا (محترمہ والدہ صاحبہ) نے کوئی ممانعت نہیں کی اور گھر میں کئی جوڑے کبوتر آ گئے۔ پھر شوق بڑھا۔ کابلی، گورے، نشاورے، لقا، یاہو، شیرازی غرض کئی قسم کے کبوتروں سے گھر بھر گیا۔

شوق یہاں ختم نہ ہوا۔ جب ۹ سال کی عمر میں قرآن کا حافظ بن گیا تو کبوتروں کی تعداد ہزار تک جا پہنچی۔ اب میں کبوتروں کی ٹکڑیاں اُڑانے بھی لگا۔ یہ ایک فن ہے۔ میں دس سال کی عمر میں اس فن میں طاق تھا!

گزشتہ دِنوں نیویارک ٹائمز کا ایک مضمون نظر سے گزرا، کبوتروں پر تھا۔ اُسے میں نے غور سے پڑھا کہ فنِ کبوتر بازی پر ایک نوٹ تیار کروں گا کہ ایک اخبار میں ان دِنوں بالاقساط فنِ کبوتر بازی پر سلسلۂ مضامین شروع ہو گیا ہے جسے میں دل چسپی سے پڑھ رہا ہوں۔ خیال یہ

ہے کہ مدینۃ الحکمت میں اچھے کبوتر بھی ہونے چاہییں۔

شہسواری

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں؛ میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے میرے گھوڑے موتی نے کئی بار پٹخ پٹخ دیا ہے۔ یہ میری ۱۲۔۱۳ سال کی عمر کی بات ہے۔ گھڑ سواری کا میرا خاص لباس تھا۔ خاکی بر جیس، اس پر پنڈلیوں تک چمڑے کے موزے، خاکی کوٹ، فُل بُوٹ اور اس میں ایڑھ بندھی ہوئی۔ موتی نہایت شریر تھا۔ وہ دیکھنے میں بھی معصوم نہ تھا۔ جب بگڑتا تو ہنگامہ کر دیتا۔ اس کی پیٹھ پر زین کسنا مذاق نہ تھا۔ اس کے منہ میں لگام دینا بھی آسان نہ تھا۔ وہ اس سے ناراض ہوتا اور جب وہ یہ دیکھتا کہ ایک چھوٹا سا لڑکا خاص لباس پہنے چلا آرہا ہے تو وہ گویا اس طرح ہنہناتا جیسے ہنس کر میرا مذاق اُڑا رہا ہو۔ اس کے ہنہنانے سے بے پروا ہو کر میں بڑے ٹھاٹھ سے سوار ہوتا۔ شروع میں موتی بڑی شرافت برتتا، مگر جب دوڑانے کے لیے میں ایڑھ لگاتا تو وہ بدک جاتا تھا۔ بدک کر الف ہو جاتا۔ اس نے ناراض ہو کر کئی بار، بلکہ بار ہا مجھے زمین پر پٹخ دیا، مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور آخر شہسوار بن گیا۔ موتی نے مجھے قبول کر لیا تھا۔ شہسواری بھی کیا تفریح ہے اور کیسی اچھی ورزش ہے۔ اب بھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں یہ ورزش کروں، مگر وقت کہاں سے لاؤں۔

موٹر ڈرائیونگ

موٹر چلانا میرا بچپن کا شوق ہے۔ سچ پوچھیے تو لاکھوں میل موٹریں بھگا چکا ہوں۔ میں ابھی تیرہ سال کا تھا کہ ماہر موٹر ڈرائیور بن چکا تھا۔ میرا ڈرائیونگ لائسنس ۱۹۳۳ء کا ہے۔ ہندوستان میں بھی موٹر خوب چلائی۔ ۱۹۴۷ء میں دہلی کے ہنگاموں میں میں نے دہلی سے پاکستان جانے والوں کی بڑی خدمت کی۔ مار ا ماری اور قتل و غارت میں ان کو ہوائی میدان پہنچانے کی خدمت میں نے اپنے ذمے لے لی تھی۔

پاکستان میں کوئی تیس سال موٹر چلاتا رہا۔ یورپ میں بھی چلائی اور خوب دوڑائی۔ لو بچو! ایک حادثہ سنو۔ میں، بڑے بھائی جان (حکیم عبدالحمید) اور ڈاکٹر برکات احمد ہم تینوں

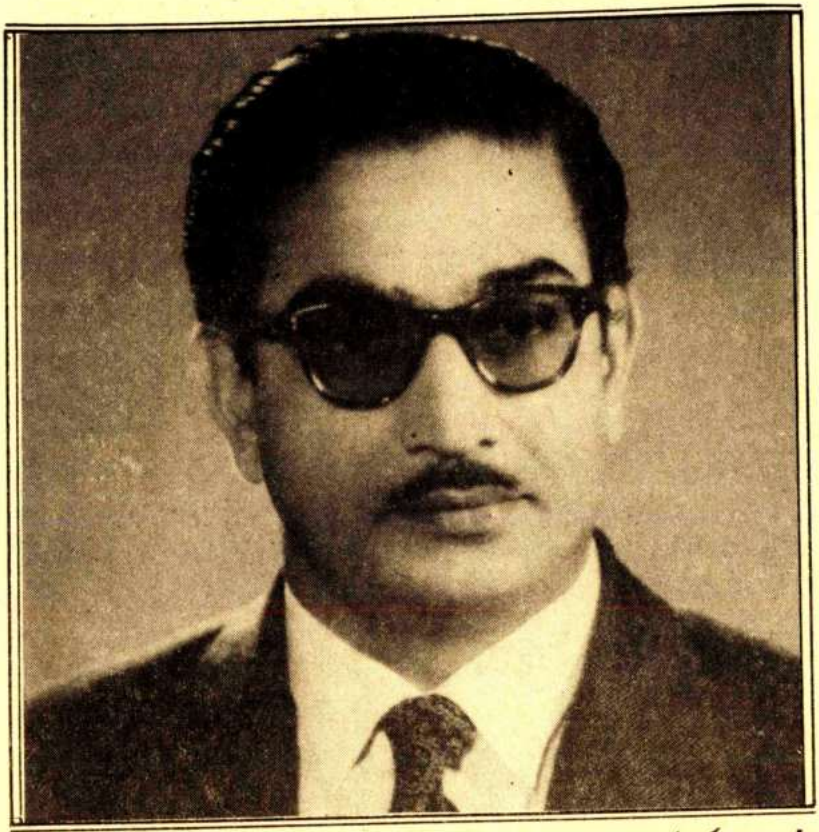

انقرہ سے سڑک کے راستے استنبول روانہ ہوئے۔ ظاہر ہے کہ موٹر میں چلا رہا تھا۔ ترکی میں "کیپ رائٹ" (دائیں جانب رہو) ہے جب کہ پاکستان، ہندوستان میں کیپ لیفٹ ہے۔ میں بڑی تیز موٹر چلا رہا تھا۔ صاف چوڑی سڑک تھی۔ رفتار ۶۵۔۷۰ میل فی گھنٹہ تھی۔ باتوں باتوں میں بھول گیا اور دائیں کے بجائے بائیں جانب آگیا۔ ادھر سامنے سے ایک بس تقریباً اسی رفتار سے اپنے دائیں آرہی تھی۔ میں بائیں تھا۔ بس ہم دونوں کا سامنا ہوگیا۔ رفتار دونوں کی تیز، فاصلہ آنکھ جھپکتے طے ہوگیا اور میری کار اور بس دونوں آمنے سامنے آگئے اور ایک دفعہ ہی ہم دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہوئے۔ آپس میں ٹکر بھی ہوئی۔ میری کار اُچھل کر دریائے مارمرا کی طرف جا گری۔ وہاں ایک پول نے ٹکرا کر کار کو دریا میں گرنے سے روک

دیا۔ ذرا ہوش آیا تو میں بھی سڑک پر تھا اور دیکھا تو بس بھی سڑک پر تھی۔ میرا رُخ استنبول کی طرف تھا اور بس کا رُخ انقرہ کی طرف!

چند سیکنڈوں میں سارا حادثہ گزر گیا۔ کوئی تین چار میل چل کر حواس ٹھکانے ہوئے۔ اب غور کیا تو میری دائیں ہاتھ کی چاروں انگلیاں اُتر چکی تھیں۔ استنبول پہنچا تو خاصا تیز بخار تھا۔ ایسے حادثوں کا کوئی حساب نہیں ہے۔ میں نے حادثوں سے ہمیشہ زور آزمائی کی ہے!

موٹر سائکل

میں نے زندگی میں ایک بار بھی بائسکل نہیں چلائی ہے۔ ہاں بہت بچپن میں تین پہیّوں والی سائکل ضرور چلائی۔ اب جب کہ میں ۱۳۔۱۴ سال کا تھا تو موٹر سائکل کا شوق ہوا۔ ایک استاد کی خدمات حاصل کیں اور دہلی میں جمنا کے کنارے بیلا روڈ پر موٹر سائکل چلانی سیکھی۔ بچّے جانتے ہیں کہ موٹر سائکل میں نکل کا چمک دار سائلنسر ہوتا ہے۔ اس سے انجن کا دھواں باہر خارج ہوتا ہے۔ یہ سخت گرم ہوتا ہے۔ ایک بار بے قابو ہوا تو میری پنڈلی اس گرم سائلنسر پر جا کر چپک گئی اور پوری کھال پنڈلی سے اُتر کر سائلنسر پر چپک گئی۔ میری پنڈلی پر یہ داغ آج بھی ہے!

بھائی جان محترم سے چھپواں موٹر سائکل سیکھنے کا سلسلہ جاری رہا اور آخر کار مہارت پر ختم ہوا۔ میں نے اس نئے شوق کو بھائی جان محترم سے راز رکھا تھا، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ بھائی جان کوٹھی نمبر ۱ دریا گنج سے مجھے روز بیلا روڈ پر دیکھا کرتے تھے، مگر ایک دن انھوں نے جواب طلبی نہ فرمائی!

پہلے ڈھائی ہارس پاور کی بی۔ ایس۔ اے موٹر سائکل لی۔ پھر پانچ ہارس پاور کی ایری ریل ریڈ ہنٹر اور پھر دس ہارس پاور کی انڈین۔ بڑا قابو تھا۔ خوب دوڑاتا تھا۔ مڑائی پر کمال یہ تھا کہ دونوں پیڈل زمین سے ٹکراتے اور گھس جاتے تھے۔ کیا مزہ آتا تھا! پھر لانگ جمپ کا شوق ہوا تو مشق کرتے کرتے موٹر سائکل کو ۱۷۔۱۸ فیٹ جمپ کرانے لگا اور جب دہلی میں سرکس آیا تو "موت کے کوے" میں بھی موٹر سائکل چلانے سے باز نہ آیا۔ واہ وا کیا زمانہ تھا! کیسے بھول جاؤں اِس سب کو!

میرزا غالب

قمر ہاشمی

ایک تھے چچا غالب — رہنے والے دلّی کے
شاہِ ہند کے اُستاد — خوب شعر کہتے تھے
دوستوں کو خط لکھتے — جیسے باتیں کرتے ہیں
پاک و ہند کے شاعر — دم اُنھی کا بھرتے ہیں
جب گئے وہ کلکتّے — مغربی ہوا دیکھی
ذہن کُھل گیا اُن کا — ہر نئی ادا دیکھی
آم کے وہ رسیا تھے — میٹھے آم کھاتے تھے
کوئی بھیجتا تحفے — اُس کے گُن بھی گاتے تھے
آدمی کی عزّت کا — تھا خیال غالب کو
شہر کے اُجڑنے کا — تھا ملال غالب کو
ہر زباں میں زندہ ہے — اُن کا شعر اردو کا
حرف تھے محبّت کے — اور اثر تھا جادو کا
ہر صدی ہے غالب کی — ہر زمانہ غالب کا
اُٹھ گیا تھا دنیا سے — آب و دانہ غالب کا

خیال کے پھول

۔ حضور اکرمؐ — جو طلبِ علم کی راہ پر چلتا ہے اللہ اس کے لیے جنّت کی راہ کھول دیتا ہے۔

مرسلہ: اللہ بخش عبیر ناگوری، جھڈو

۔ حضرت علیؓ — بزدل موت سے اسی طرح لرزتے ہیں جیسے رسیاں گہرے کنویں میں اُترتی ہوئی لرزتی ہیں۔

مرسلہ: عینیہ فرح، کراچی

۔ امام جعفر صادقؒ — منافقت کی دوستی سے کھُلم کھُلّا عداوت کہیں بہتر ہے۔

مرسلہ: سعدیہ سعید، سکھر

۔ حضرت جنید بغدادیؒ — کسی سے نیکی کرتے وقت بدلے کی توقع نہ رکھو، کیوں کہ نیکی اور اچھائی کا بدلا بندہ نہیں خدا دیتا ہے۔

مرسلہ: روبینہ مریم بھلن، شکارپور

۔ امام غزالی — دل کو زندہ اور بیدار رکھنے کے لیے اچھی کتابوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

مرسلہ: سید ندیم، کراچی

۔ ابنِ عربی — اپنے نفس کا محاسبہ کیا کرو۔ اپنے دل اور خیالات پر نگرانی رکھو۔ دل میں اللہ تعالیٰ سے شرم و حیا رکھو۔

مرسلہ: سلیم انور عباسی، کراچی

۔ سقراط — اعلاظرف انسان کی شناخت یہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ بھی اس کا برتاؤ اچھا ہو۔

مرسلہ: سید رفیع حسن

۔ افلاطون — دنیا عاقل کی موت پر اور جاہل کی زندگی پر ہمیشہ آنسو بہاتی ہے۔

مرسلہ: عاطف جلال، کراچی

۔ ارسطو — زندگی کی سب سے بڑی فتح نفس پر قابو پانا ہے۔

مرسلہ: جمیلہ رانی

۔ شیخ سعدیؒ — انسان سے محبّت کرنا ہی در حقیقت خدا سے محبّت کرنا ہے۔

مرسلہ: فرح بلقیس، کراچی

۔ حکیم بو علی سینا — نہایت خوش حالی اور نہایت بدحالی بُرائی کی طرف لے جاتی ہے۔

مرسلہ: زرینہ اختر، اسلام آباد

۔ ایڈمرل نیلسن — زندگی میں میری کام یابی کا راز یہ ہے کہ میں ہمیشہ پندرہ منٹ پہلے اپنے کام پر پہنچ جاتا ہوں۔

مرسلہ: محمد عمران صدیقی، اسلام آباد

۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ — بدترین شخص وہ ہے جو توبہ کی اُمید پر گناہ کرے۔

مرسلہ: عبدالرشید فاروقی، جھنگ

لال بطخ

میرزا ادیب

"نہیں بہن! میں نہیں جاؤں گی۔"

"آخر وجہ کیا ہے تمھارے وہاں نہ جانے کی؟"

"وجہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ نہ جانے تمھاری بہنیں اور سہیلیاں میرے ساتھ کیا سلوک کریں گی۔ مجھے اپنے ساتھ رکھیں گی یا نہیں۔ نہ بہن! تمھارا شکریہ میں نہیں جا سکتی۔"

"تم میرے ساتھ چل کر ذرا دیکھو تو سہی۔" "مجھے ڈر لگتا ہے۔ یہاں ٹھیک ہوں۔"

یہ گفت گو ایک کوٹھی کے لان میں دو بطخوں کے درمیان ہو رہی تھی۔ سفید رنگ کی بطخ اپنی سہیلی کو اپنے ہاں لے جانے کی کوشش کر رہی تھی، مگر اس کی سہیلی اس پر آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کیوں اپنی سہیلی کے ساتھ اس کی بہنوں اور سہیلیوں کے ہاں جانے سے انکار کر رہی تھی؟ یہ سہیلی تو اسے ایک ایسی جگہ لے جانا چاہتی تھی جہاں ایک چھوٹا سا تالاب بھی تھا جس میں بطخوں کو تیرنے کی پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی وہ اُدھر جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ اسے جاننے کے لیے ایک واقعہ بیان کرنا پڑے گا۔

یہ بطخ جو اپنی سہیلی کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی ایک عام بطخ نہیں تھی۔ عام بطخیں تو سفید رنگ کی ہوتی ہیں، مگر یہ اپنی چونچ سے لے کر پاؤں تک لال رنگ کی تھی۔ وہ لال رنگ کی پیدا نہیں ہوئی تھی یعنی یہ اس کا پیدائشی رنگ نہیں تھا بلکہ کوٹھی میں رہنے والے ایک لڑکے جمیل نے اُسے لال رنگ میں رنگ دیا تھا۔ یہ نہیں کہ جمیل نے یہ حرکت شرارت سے کی تھی یا وہ اُسے بدنما بنانا چاہتا تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ جمیل اسے زیادہ خوب صورت بنانے کا خواہش مند تھا اور یہ اس کی اسی خواہش کا نتیجہ تھا کہ اس نے اُسے سر سے پاؤں تک سرخ کر دیا تھا۔ سرخ رنگ میں رنگے جانے کے بعد یہ بطخ اپنے معمول کے مطابق کوٹھی سے باہر نکلی تو پہلے تو اس کی ایک سہیلی بطخ نے اسے پہچاننے ہی سے انکار کر دیا۔ وہ لاکھ کہتی رہی میں تمھاری "شیتو بطخ" ہوں، مگر اس کی سہیلی

پوری بات سُن کر بھی یہ یقین نہ کر سکی کہ وہ بطخ ہے کوئی اور جانور نہیں ہے۔ پھر جب محلّے کے لڑکوں نے اُسے دیکھا تو اُسے ایک عجیب شے سمجھ کر اس کے پیچھے بھاگنے لگے تاکہ اسے پکڑ کر معلوم کریں کہ یہ کیا ہے۔ ایک لڑکے نے تو اس پر روڑا بھی پھینک مارا۔ اب اس کے لیے جان بچانے کا صرف یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا کہ اپنے گھر چلی جائے اور وہ ہانپتی کانپتی اپنے گھر میں چلی گئی۔

اس کے بعد وہ گھر کے دروازے سے باہر نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ ہر وقت کوٹھی کے لان ہی میں اکیلی بیٹھی رہتی تھی۔ وہ بہت اُداس ہو گئی تھی، لیکن گھر سے باہر کیسے جاتی۔ جو کچھ پہلے اُس کے ساتھ ہوا تھا دوبارہ بھی ہو سکتا تھا اور وہ یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھی۔

کوٹھی سے کچھ دُور اس کی ایک سہیلی تالاب کے قریب رہتی تھی۔ اُسے 'شینو' سے بڑی محبّت تھی اور وہ اس کے پاس کبھی کبھی آتی جاتی رہتی تھی۔ اس روز وہ وہاں گئی تو شینو کو اس حالت میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ شینو کی اس سہیلی کا نام مینو تھا۔

جب شینو نے اپنی مصیبت کا قصّہ سُنایا تو مینو اسے اپنے ساتھ تالاب کے پاس اپنے گھر میں لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس پر ان دونوں کے درمیان وہ باتیں ہوئیں جو اوپر بیان کر دی گئی ہیں۔

مینو نے شینو کو بڑی محبّت اور ہمدردی سے سمجھایا کہ اس کی بہنیں اور سہیلیاں اس کے ساتھ بُرا سلوک ہرگز نہیں کریں گی۔ اس نے کہا، یہاں تو تنہا رہ کر وہ مَر جائے گی۔ وہاں خوش خوش رہے گی۔

آخر شینو نے مینو کے ہمراہ جانے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

کوٹھی سے نکلتے نکلتے شام کا اندھیرا پھیل گیا۔ اس وقت تو مینو اسے اپنے گھر کے اندر لے گئی۔ وہاں کوئی لڑکا نہیں تھا۔ سارے بڑی عمر کے لوگ تھے۔ انھوں نے شینو کو دیکھ کر حیرت کا اظہار تو ضرور کیا مگر اسے پکڑنے کی کوشش نہ کی۔

دوسرے روز دھوپ نکلی تو مینو، شینو کو لے کر تالاب کے کنارے پہنچی۔ کچھ بطخیں تالاب میں تیر رہی تھیں اور کچھ باہر گھوم پھر رہی تھیں۔

مینو نے شینو کا تعارف کرایا اور اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ بھی سُنا دیا۔ مینو کو توقع تھی کہ ساری بطخیں اس کی سہیلی کا خیر مقدم کریں گی اور اُسے خوشی خوشی قبول کر لیں گی، مگر انھوں نے تو ایک طوفان برپا کر دیا۔ وہ شینو کو بطخ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھیں۔

"بھلا کبھی لال رنگ کی بھی بطخ ہوتی ہے؟" ایک بولی۔

"یہ ہماری طرح بطخ نہیں ہے۔" دوسری بولی۔

"کوئی خطرناک جانور ہے۔" تیسری نے کہا۔

مینو نے بڑی کوشش کی کہ شینو کو اپنی جیسی بطخ سمجھ لیں، مگر وہ کسی صورت بھی اُسے بطخ ماننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ ناچار شینو اپنے گھر چلی گئی اور مینو نے بھی اس کا ساتھ دیا یعنی اس کے ساتھ ہی اس کے گھر میں آ گئی۔

ایک دن گزرا تو شینو نے کہا، "پیاری سہیلی! میں تمھاری بہت ممنوں ہوں، لیکن تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔" "وہ کیوں؟"

"وہ لڑکا جس نے مجھے رنگ دیا تھا کہ اچی شہر سے واپس آ گیا ہے۔ رات کو آیا ہے۔ اگر اس نے تمھیں دیکھ لیا تو مجھے ڈر ہے کہ تمھیں بھی رنگ دے گا۔"

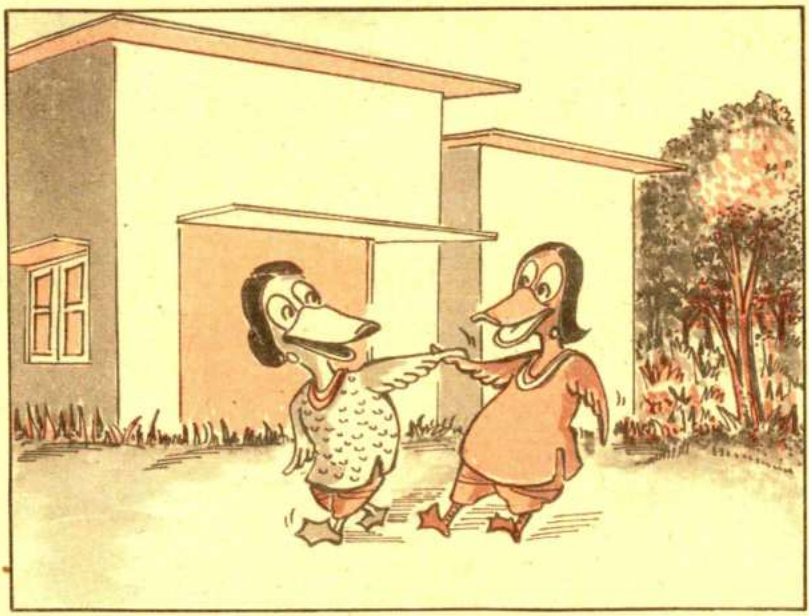

سفید بطخ اپنی سہیلی کو اپنے گھر لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔

"تمھیں چھوڑ کر تو میں نہیں جاؤں گی" مینو کا فیصلہ تھا۔

دونوں غور کرنے لگیں کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ سوچ سوچ کر وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ انھیں کہیں اور چلے جانا چاہیے۔ کسی ایسی جگہ پر چلے جانا چاہیے جہاں بہت کم لوگ ہوں بلکہ بالکل نہ ہوں۔

ایسی جگہ کوئی جنگل ہی ہو سکتا تھا اور انھوں نے شہر سے باہر جانے کا ارادہ کر لیا۔ رات کے وقت وہ بڑی دیر تک چلنے کے بعد ایک ویران جگہ پر پہنچ گئیں۔

"اب یہی ہمارا گھر ہو گا" شینو بولی۔

"جنگل میں کہیں کہیں پانی بھی ہوتا ہے۔ صبح پانی ڈھونڈیں گے" مینو نے کہا۔

"لو بہن، اب تم بھی سو جاؤ اور میں بھی سو جاتی ہوں" یہ شینو کے الفاظ تھے۔

دونوں بہت تھک گئی تھیں سو گئیں۔

صبح اس وقت ان کی آنکھ کھلی جب سورج پوری طرح چمک رہا تھا۔

بھوک سے ان کا بُرا حال تھا۔

"آؤ بہن! گھومیں پھریں کھانے کو کچھ مل ہی جائے گا"

اتفاق سے وہاں ایک فقیر بھی رہتا تھا۔ اس نے بچوں کو دیکھا تو انھیں روٹی کے ٹکڑے ڈال دیے۔ وہاں سے آگے بڑھیں تو انھیں پینے کے لیے پانی بھی مل گیا۔ اور کیا چاہیے تھا۔ خوش ہو گئیں۔ فقیر انھیں خوراک دے دیتا اور وہ ندی پر جا کر پانی پی لیتیں۔

ایک روز وہ ندی کے کنارے پہنچیں تو وہاں کئی بڑے بڑے کتوں کو دیکھا جو پانی پی رہے تھے۔ یہ کتے کسی شکاری کے ساتھ آئے تھے۔ یہ تو خوش قسمتی ہوئی کہ کتوں کی نظر اُن پر نہ پڑی وہ پانی پینے میں مشغول رہے، مگر ان کے لیے تو بڑا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ بھاگیں وہاں سے اور دُور تک بھاگتی چلی گئیں۔

رات آئی تو وہ سونے کی تیاری کرنے لگیں۔ یکایک شینو نے مینو سے سرگوشی کی:

"مینو، اِدھر دیکھو"

مینو نے ایک طرف دیکھا۔ دو بڑی خوف ناک آنکھیں چمک رہی تھیں۔ دونوں سانس روکے بیٹھی رہیں۔ آنکھیں غائب ہو گئیں۔

صبح ہوئی تو شینو نے بہت اصرار کر کے مینو کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اپنے گھر چلی

جائے۔

"اور تم؟" مینو نے پوچھا۔

"میں اپنے گھر۔ پیاری سہیلی! یہ جنگل ہے۔ یہاں خوف ناک جانور رہتے ہیں۔ اِدھر رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے اپنے گھر چلی جائیں۔" شینو نے کہا۔

شینو اپنی سہیلی کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی، مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس رات شینو اپنے گھر میں تھی اور مینو اپنے گھر میں۔ شینو پھر بہت اُداس رہنے لگی۔ اب تو اس کی سہیلی مینو بھی نہیں تھی۔

کئی دن اور کئی راتیں بیت گئیں۔

ایک شام شینو بہت ہی اداس تھی۔ اسے اپنی حالت پر رونا آرہا تھا۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ اللہ مجھے موت دے دے کہ اس کے کان میں آواز آئی:

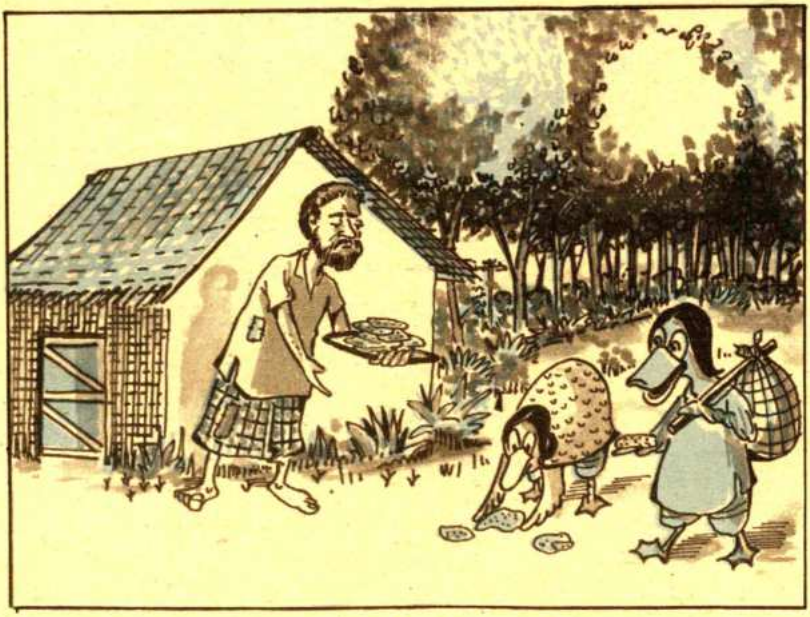

فقیر نے بطخوں کے سامنے روٹی کے ٹکڑے ڈال دیے۔

"شینو بہن!"

شینو نے اُدھر دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ مینو اسے بڑی محبت سے دیکھ رہی تھی۔

"مینو بہن! کیوں آئی ہو؟"

"شینو بہن! فوراً میرے ساتھ چلو اور سنو! یہ بالکل نہیں پوچھنا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"کہاں جائیں گے؟"

"میں نے کہا نا یہ نہیں پوچھنا۔ وعدہ کرتی ہو؟"

"ٹھیک ہے وعدہ کرتی ہوں۔"

دونوں باہر نکلیں۔ آگے آگے مینو تھی اور پیچھے پیچھے شینو۔

چلتی گئیں۔ چلتی گئیں۔ شینو تھک گئی۔

"مینو! بتاؤ تو سہی۔ مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟"

"تم نے وعدہ کیا تھا کہ یہ سوال نہیں پوچھو گی۔ بس خاموشی سے چلتی رہو۔"

شینو کیا کرتی۔ خاموشی کے ساتھ چلنے لگی۔

تھوڑی دیر کسی کسی جگہ رُکنے کے بعد وہ اُس وقت ایک پہاڑی علاقے میں پہنچ گئیں جب سورج طلوع ہو رہا تھا۔

"ہم آ گئے ہیں۔"

"یہ کون سی جگہ ہے؟" مینو نے سوال کیا۔

"مجھے ایک بزرگ نے یہی جگہ بتائی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ اب تمھیں ہمت سے کام لینا ہوگا۔ تمھاری مصیبت دُور ہو جائے گی۔" مینو نے اسے بتایا۔

وہ شینو کو ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں گرم پانی کا چشمہ بہ رہا تھا۔

"چھلانگ لگا دو اس میں۔"

شینو گرم پانی کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی:

"پاگل ہو گئی ہو مینو، کیا مجھے مار ڈالنے کا ارادہ ہے؟"

"شینو میری بہن! اس گرم پانی میں صرف ذرا سی دیر رہنا ہوگا۔ باہر نکلو گی تو تمھارا یہ رنگ اُتر چکا ہوگا۔ یہ رنگ صرف گرم پانی سے ہی اُتر سکتا ہے۔ عام پانی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔"

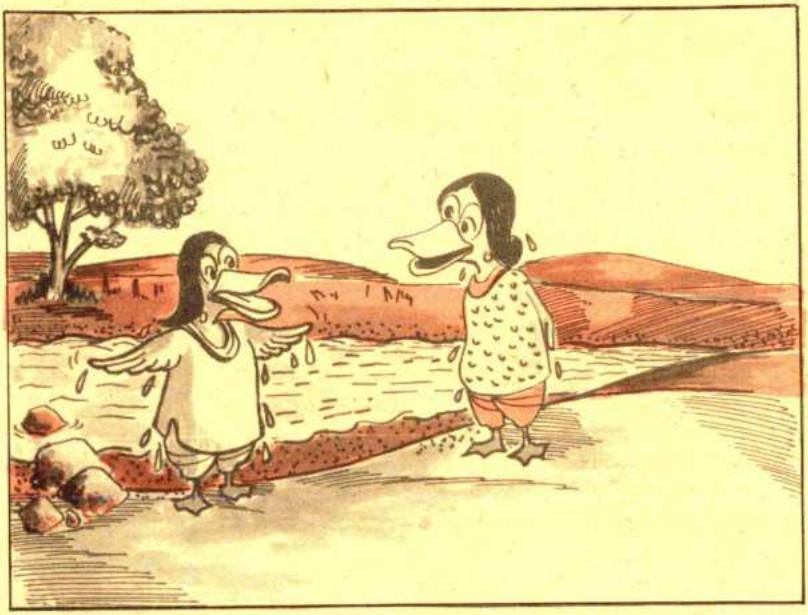

شینو گرم تالاب سے باہر نکلی تو اس کا رنگ سفید ہو چکا تھا۔

شینو پانی میں اُترنے کے لیے آمادہ نہیں تھی۔

"اچھا یہ بات ہے دیکھو" اور مینو یہ کہہ کر پانی میں اُتر گئی "ہائے یہ کیا کر رہی ہو تم؟"

اب تو شینو کو بھی اُترنا پڑا۔ گرم پانی سے اسے تکلیف ہوئی، مگر جب جلد ہی وہ مینو کے ساتھ باہر آئی تو اپنی سہیلی کی طرح سفید ہو چکی تھی۔ لال رنگ غائب ہو گیا تھا۔

"ہائے میرے اللہ۔ میں پھر ویسی کی ویسی ہو گئی ہوں۔ شینو کے خوشی کے مارے آنسو نکل آئے۔ دونوں وہاں پہنچیں جہاں مینو کی بہنیں اور سہیلیاں تالاب میں تیر رہی تھیں۔ انھیں دیکھ کر سب بہت خوش ہوئیں۔ شینو وہیں رہنے لگی۔

اسے اپنی ہمدرد سہیلی سے اور زیادہ پیار ہو گیا۔ مینو نے ہی اسے مصیبت سے نجات دلائی تھی۔ ایسی ہمدرد، غم گسار اور قربانی کرنے والی سہیلی کا وہ جتنا شکریہ ادا کرتی کم تھا۔

دونوں سہیلیاں خوشی خوشی رہنے لگیں۔

ہرنوٹے نے کہانی لکھی

رؤف پاریکھ

سورج بادلوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پھول ہوا میں جھول رہے تھے اور تتلیاں پھولوں پر ناچ رہی تھیں۔ درخت کے نیچے ہری ہری گھاس پر ہرنوٹا (ہرن کا بچہ) پیٹ کے بل لیٹ کر کچھ لکھ رہا تھا۔ ننھے خرگوش کا اُدھر سے گزر ہوا تو ہرن کے بچے کو لکھتا دیکھ کر وہ رُک گیا اور اس کے پاس جا کر بولا، "کیا ہو رہا ہے بھائی ہرنوٹے؟"

ہرنوٹا چونک گیا اور خرگوش کو دیکھ کر سنجیدگی سے کہنے لگا، "سنبر میں ہمدرد نونہال کا خاص نمبر شائع ہو رہا ہے۔ اس کے لیے کہانی لکھ رہا ہوں۔"

"اچھا!" ننھا خرگوش ہنس کر بولا، "ذرا سناؤ تو سہی کہانی۔ لکھا کیا ہے؟"

ہرنوٹا کہانی سنانے لگا، "لکھا ہے، کسی شہر میں دو انسان رہتے تھے۔ دونوں میں بہت دوستی تھی۔ جو بھی گھاس اور چارا ملتا دونوں مل جُل کر کھاتے اور رات کو درخت پر گھونسلے میں سو جاتے۔"

یہ سُن کر ننھا خرگوش زور زور سے ہنسنے لگا۔

"کیا ہوا؟ کیوں ہنس رہے ہو؟" ہرنوٹا حیرت سے کہنے لگا۔ ہرنوٹے کی عمر بہت کم تھی اور انسانوں کے بارے میں اسے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ جنگل کے جانوروں کا شکار کر کے لے جاتے ہیں۔

"بھائی ہرنوٹے! تم بالکل گدھے ہو۔" ننھے خرگوش نے جواب دیا۔

"ارے آہستہ بولو دوست! اگر گدھے نے سُن لیا تو اماں ہرنی سے شکایت کر دے گا اور وہ ماموں چیتے سے ڈانٹ کھلوائیں گی، لیکن تم ہنس کیوں رہے ہو؟"

ہرنوٹے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی کہانی میں کیا خرابی ہے۔

"یہ تمھیں کس نے بتایا کہ انسان درختوں پر رہتے ہیں اور گھاس کھاتے ہیں؟" خرگوش نے

چوہے نے جلدی جلدی جال کی رسیاں کاٹ دیں۔

پوچھا۔ پھر خرگوش کہنے لگا، "لو سنو، میں تمھیں بتاتا ہوں۔ میں نے انسانوں کے بارے میں بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ اس کے علاوہ میرے دادا انسانوں کے درمیان بہت عرصہ رہ چکے ہیں۔ انھوں نے بھی مجھے انسانوں کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔ مجھے ان کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔" ننھے خرگوش نے شیخی بگھاری۔

"مجھے بھی بتاؤ۔ میں ایک کہانی لکھوں گا انسانوں کے بارے میں۔" ہرنوٹے نے کہا۔

"ہاں ہاں ضرور بتاؤں گا، لیکن کہانی میں میرا نام بھی آنا چاہیے۔ مجھے جو اتنی ڈھیر ساری معلومات ہیں وہ میں تمھیں مفت میں کیسے دے دوں۔ اتنی معلومات تو جنگل کے کسی جانور کو نہیں ہوں گی۔" یہ کہتے ہوئے ننھے خرگوش کا سینہ فخر سے پھول گیا۔

"دیکھو بھائی خرگوش! بڑا بول مت بولو۔ اللہ تعالیٰ کو غرور پسند نہیں ہے۔" ہرنوٹا بولا۔

"بھائی، ہرنوٹا بالکل صحیح کہہ رہا ہے۔" چوہے نے جھاڑی کے پیچھے سے سر نکال کر کہا۔ وہ کافی دیر سے ہرنوٹے اور خرگوش کی باتیں سُن رہا تھا۔ "غرور کا سر نیچا ہوتا ہے۔"

"ارے بھائی مونچھ مروڑ! تم کہاں سے آن ٹپکے؟" ننھے خرگوش نے چوہے کو چھیڑا۔ وہ ہمیشہ بے چارے چوہے کو مونچھ مروڑ کہہ کر چڑایا کرتا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے شریر جانور بھی اسے مونچھ مروڑ کہنے لگے۔

"دیکھو میں تمھیں پھر سمجھا رہا ہوں خرگوش میاں! شیخی اور غرور اللہ کو پسند نہیں۔" چوہے نے اس کی سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا اور اسے سمجھایا کہ "فوراً توبہ کرو۔"

یہاں تو یہ باتیں ہو رہی تھیں اور اُدھر شکاریوں کی ایک جیپ جنگل میں داخل ہو رہی تھی۔ اس میں چار شکاری بندوقیں، دُوربین، کیمرا، جال، رسّیاں، کھانے پینے کا سامان، خیمے اور دوسری بہت سی چیزیں لے کر جنگل میں شکار کھیلنے آ رہے تھے۔ چوں چوں چڑیا ایک درخت پر بیٹھی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ شکاری جنگل میں خیمے لگا رہے ہیں اور بندوقیں اُٹھا اُٹھا کر اس میں گولیاں بھر رہے ہیں تو وہ پُھر سے اُڑ کر جنگل میں تمام جانوروں کو خبردار کرنے لگی کہ چھپ جاؤ، شکاری آ رہے ہیں۔ چوں چوں چڑیا نے ننھے خرگوش، ہرنوٹے اور مونچھ مروڑ چوہے کو ایک درخت کے نیچے زور زور سے باتیں کرتے پایا تو ان کے پاس پہنچی اور انھیں سمجھایا کہ جلدی سے اپنے اپنے گھر چلے جاؤ اور باہر نہ نکلنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شکاری رات کو جو تِکّے اور کباب کھائیں وہ تمھارے ہی گوشت کے بنے ہوئے ہوں۔

یہ کہہ کر چوں چوں چڑیا تو اُڑ گئی، لیکن ننھا خرگوش پھر شیخی بگھارنے لگا: "ارے یہ انسان میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ میں کتنا تیز دوڑتا ہوں۔ یہ نہ مجھے پکڑ سکتے ہیں اور نہ مار سکتے ہیں۔ چلو ذرا ان انسانوں کی خبر لیں۔ آئے ہیں بڑے ہمیں شکار کرنے۔"

ہرنوٹا کان پکڑ کر بولا، "نہ بابا، نہ، زبردست کا جو تاسُر پر ہوتا ہے۔ دوڑتا تو میں بھی تیز ہوں، لیکن ان شکاریوں کے آگے جانا موت کو دعوت دینا ہے۔ کیوں اپنی جان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہو۔"

"آؤ بھائی ہرنوٹے، ہم تو چلتے ہیں۔ اس خرگوش کے بچے کو شکاریوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اکیلا ہی چھوڑ دو۔" چوہے نے کہا۔

لیکن ہرنوٹا خرگوش کو سمجھانے میں لگا رہا اور شکاریوں نے اپنی دُوربینوں سے ان تینوں

کو باتیں کرتا دیکھ لیا۔ پہلے تو وہ چپکے چپکے ان تینوں کے قریب آئے اور جھاڑیوں کے پیچھے سے چپکے سے ان کی تصویر اُتار لی۔ پھر ان کے جی میں آئی کہ ہرن کے اتنے خوب صورت بچے کو زندہ پکڑنا چاہیے۔ پھر خرگوش کو شکار کر کے اس کی بوٹیاں نمک مرچ لگا کر کھائیں گے۔ چناں چہ انھوں نے رسّی کا پھندا بنایا اور درختوں کی آڑ لے کر چپکے چپکے آگے بڑھنے لگے۔ جانوروں کے کان بہت تیز ہوتے ہیں۔ وہ ذرا سی آہٹ بھی فوراً سُن لیتے ہیں۔ ایک شکاری کے جوتے کے نیچے درخت کے سوکھے پتّے چرمرائے تو ہرن کے کان کھڑے ہو گئے۔ چوہا بھی چوکنا ہو گیا۔ ہرن "بھاگو" کہہ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ چوہے نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ڈر تو ننھے خرگوش کو بھی لگ رہا تھا، لیکن وہ چوہے اور ہرنوٹے پر رعب جمانے کے لیے وہیں کھڑا رہا۔ شکاریوں نے جو ہرن کے بچّے کو یوں بھاگتے دیکھا تو جھٹ رسّی کا پھندا گھما کر پھینکا جو خرگوش کی گردن میں جا کر پھنس گیا۔ خرگوش کی گردن میں پھندا بہت مضبوطی سے لگا ہوا تھا۔ وہ بہت اُچھلا، تڑپا، لیکن شکاریوں نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور اسے جال میں ڈال کر اپنے ٹھکانے کی

چوہے نے خرگوش اور ہرنوٹے کو دشمن سے خبردار کیا۔

طرف چل دیے۔

ادھر ہرنوٹا اور چوہا کچھ دُور تک تو بھاگتے رہے، لیکن جب انھیں احساس ہوا کہ ننھا خرگوش ان کے ساتھ نہیں تو وہ رُک گئے اور سوچنے لگے کہ ننھا خرگوش شاید کسی مصیبت میں ہے۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ دبے پاؤں واپس چلے، لیکن خرگوش کا وہاں نام و نشان تک نہ تھا البتہ دُور جنگل میں آگ جلتی نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں چپکے چپکے وہاں پہنچے اور جھاڑیوں کی آڑ سے جھانکا تو کیا دیکھتے ہیں کہ شکاری آگ جلا رہے تھے اور باتیں کرتے جا رہے تھے کہ خرگوش کا گوشت کس طرح پکایا جائے۔ ایک طرف ننھا خرگوش جال میں بندھا پڑا تھا۔ بے چارہ ہل جُل بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ دونوں رات ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جیسے ہی شام ہوئی اور اندھیرا پھیلنے لگا ایک شکاری نے اپنا لمبا چاقو نکالا اور اسے تیز کرنے لگا۔ خرگوش نے یہ دیکھا تو اسے اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ بے چارہ رونے لگا اور دل ہی دل میں خدا سے دُعا کی کہ "یا اللہ! میں نے غرور کیا تھا اس کی یہ سزا ملی ہے، اگر تُو مجھے اس قید سے رہائی دلا دے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی غرور نہیں کروں گا اور نہ کسی کو ستاؤں گا۔"

اُدھر ہرنوٹا اور چوہا بھی سمجھ گئے کہ اگر ذرا بھی دیر کی تو خرگوش اپنی جان سے جائے گا۔ چناں چہ دونوں اُٹھے اور چپکے چپکے کھسکتے ہوئے جال تک پہنچے۔ خرگوش نے انھیں دیکھا تو دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ چوہے نے آگے بڑھ کر سرگوشی کی، "کیوں بھائی خرگوش! اب کیا ہوا؟ کہاں گئی تمھاری تیز رفتاری اور انسانوں کے بارے میں تمھاری معلومات؟"

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔" ہرنوٹے نے سرگوشی میں چوہے کو ڈانٹا۔ "تمھارے دانت تیز ہیں۔ فوراً جال کو کُتر ڈالو۔"

چوہے نے جلدی جلدی جال کی رسّیاں اپنے دانتوں سے کُترنا شروع کیں اور تھوڑی ہی دیر میں خرگوش آزاد ہو چکا تھا۔ اس کے آزاد ہوتے ہی تینوں وہاں سے سر پر پیر رکھ کر بھاگے اور پیچھے مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔ بھاگتے بھاگتے جب تینوں کافی آگے نکل گئے اور گھنے جنگل میں پہنچے تو رُک گئے۔ خرگوش نے چوہے اور ہرنوٹے کو گلے لگا لیا اور ان سے معافی مانگی، "اگر تم نہ ہوتے تو شاید اب تک میں مَر چکا ہوتا۔ میں نے جو بڑا بول بولا تھا، اُس

کی سزا مجھے مل گئی۔ بھائی چوہے! میں تمھیں بہت ستایا کرتا تھا، مجھے معاف کر دو" خرگوش نے کہا۔

"تم ہمارے بھائی ہو۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تمھیں سمجھ دی۔ چلو اس واقعے کا کم از کم اتنا فائدہ تو ہوا کہ اب تم غرور نہیں کرو گے" چوہے نے جواب دیا۔

"اور ہاں اب میں ہرنوٹے کو انسانوں کے بارے میں ساری معلومات دوں گا تاکہ وہ کہانی لکھ سکے" خرگوش نے کہا۔

ہرنوٹے نے کہا، "بھئی جو واقعہ ہمارے ساتھ پیش آیا ہے میں اُسی پر ایک کہانی لکھ ڈالوں گا اور اس کا عنوان ہو گا غرور کا سر نیچا" اور وہ تینوں ہنسنے لگے۔

ننھا سُراغ رساں

(کہانیاں)

مُصنف

مسعود احمد برکاتی و دیگر

بچے اور نوجوان بھی بہادری اور سُراغ رسانی کے کام کر سکتے ہیں۔ سراغ رسانی اور بہادرانہ کارناموں کی یہ چھے کہانیاں پڑھیے۔ ان میں :-

★ ایک ننھا سُراغ رساں ایک تلوار پر کھُدی ہوئی عبارت پڑھ کر دلیل سے ثابت کرتا ہے کہ وہ تلوار کبھی امریکی جنرل جیکسن کے پاس نہیں رہی تھی۔ ★ جرمنی میں جنگی قیدی لکڑی کے گھوڑے کے نیچے زمین میں سرنگ بنا کر فرار ہو جاتے ہیں ★ ایک بچہ سرکس میں لکڑی کے شیر کے پیٹ میں چھُپائے ہوئے جواہرات کا کھوج لگاتا ہے۔ ★ اس کے علاوہ جواہرات پر ڈاکا ڈالنے کے لیے ہوائی جہاز کو ہائی جیک (اغوا) کرنے کا سنسنی خیز واقعہ پڑھیے۔

قیمت ۵/۰۰ رُپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد

کراچی ۱۸

خزانے کا محافظ

معراج

بہت دن گزرے ملک ہسپانیہ کے گاؤں میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ اس کا نام راشد تھا۔ وہ بے حد غریب تھا۔ وہ اپنی روزی کمانے کے لیے شہر شہر پھرتا اور گلی کوچوں میں بر بط بجا بجا کر لوگوں کا دل بہلاتا۔ وہ خوش ہو کر اسے رُپے پیسے انعام دیتے۔ اس طرح اس کے پاس اتنی رقم ہو جاتی جو اس کے گزر بسر کے لیے کافی ہوتی۔

ان دِنوں شہر غرناطہ کی بہت شہرت تھی۔ غرناطہ کے باشندے گانے بجانے کے بے حد شوقین تھے۔ وہ موسیقاروں کے بہت قدر دان تھے۔ ایک دن راشد نے غرناطہ جا کر قسمت آزمائی

راشد کو یہ سپاہی بہت عجیب معلوم ہوا۔

سپاہی نے راشد کو بتایا اس صندوق میں بے شمار جواہرات ہیں۔

کا ارادہ کیا، چناں چہ وہ غرناطہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک بزرگ کا مزار تھا۔ راشد نے مزار پر فاتحہ پڑھی اور دعا مانگی "اے اللہ! تُو میری غریبی دُور فرما دے تاکہ میں بھی آرام اور چین سے زندگی بسر کر سکوں۔"

جب وہ دُعا مانگ کر وہاں سے رخصت ہونے لگا تو اچانک اس کی نظر ایک چمک دار چیز پر پڑی جو سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ راشد نے جھک کر اسے اُٹھا لیا۔ یہ ایک سونے کی انگوٹھی تھی۔ اس پر ایک ستارہ بنا ہوا تھا۔ یہ سلیمانی انگوٹھی تھی۔ یہ طلسم (جادو) کا اثر دُور کرنے کی تاثیر رکھتی تھی اور اسے پہننے والا ہر قسم کے جادُو ٹونے سے محفوظ رہتا تھا لیکن سیدھے سادے راشد کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ اس نے انگوٹھی کو اُن بزرگ کا انعام سمجھ کر اپنی انگلی میں پہن لیا اور خوشی خوشی غرناطہ کی طرف چلا۔

آخر وہ غرناطہ کے مشہور شہر میں پہنچ گیا۔ وہ غرناطہ شہر کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ عربوں کے تعمیر کیے ہوئے میناروں، مسجدوں اور شان دار عمارتوں کو دیکھ کر وہ بہت خوش

ہوا۔ غرناطہ کے لوگ رقص اور موسیقی کے بہت شوقین تھے، انھوں نے راشد کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ راشد جہاں بھی جاتا لوگ اس کی موسیقی کی بہت قدر کرتے۔ وہ بربط بجاتا تو لوگ اس کے گرد اکھٹے ہو جاتے۔ چھوٹے چھوٹے بچے تو بربط کی دھن پر رقص کرنے لگتے۔

ایک دن وہ فوارہ چوک میں بربط بجا رہا تھا۔ لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ اس نے ایک درویش کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ سب لوگ احترام سے کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے ادب سے درویش کے ہاتھوں کو چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ یہ درویش اصل میں ایک دھوکے باز اور مکّار شخص تھا اور سادہ لوح لوگوں کو اپنے مکر اور فریب سے لوٹتا رہتا تھا۔ پیدل چلنے کی وجہ سے درویش پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر آرام کرنے کے لیے ایک پتھر کی تپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس کی خادمہ نے صراحی کا گلاس بھرا اور درویش کو دیا۔ درویش نے ایک ایک گھونٹ کر کے پانی پیا۔ اس کے ساتھ وہ کباب اور دوسری لذیذ چیزوں سے لطف اٹھاتا رہا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد درویش اور اس کی خادمہ وہاں سے رخصت ہوئے۔ راشد نے لوگوں سے ان کا پتا پوچھا۔ کسی نے بتایا کہ درویش شاہی محلّے میں رہتا ہے۔ وہاں بہت سے لوگ اس کے مرید ہیں۔

آخر نوروز کا دن آ پہنچا۔ اس دن غرناطہ کے لوگ جشن مناتے ہیں۔ شام کے وقت لوگ دریا کے کنارے پر جمع ہو جاتے ہیں۔ رات بھر رقص اور موسیقی کی محفل جمتی ہے۔ راشد بھی بربط بجاتا ہوا لوگوں کے ساتھ ساتھ دریا کے کنارے پر پہنچا۔ وہاں پر لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ جھانجھر کی جھنکار، دف (طبلہ) کی تھاپ اور بربط کی دھن پر لوگ رقص کر رہے تھے۔ بے چارہ راشد ایک پتھر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ حسرت بھری نظروں سے ان خوش و خرم لوگوں کو دیکھتا رہا۔ اتنے بڑے مجمع میں وہ اکیلا تھا۔ اس کا نہ کوئی دوست تھا نہ ہمدرد۔ اچانک راشد کی نظر ایک سپاہی پر پڑی۔ جو اس کی طرح بالکل تنہا کھڑا تھا۔ شکل صورت سے وہ کوئی عرب دکھائی دیتا تھا۔ اس کا قد لمبا تھا۔ اس نے زرہ بکتر پہنی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں نیزہ تھا اور کندھے سے ڈھال لٹک رہی تھی۔ لوگ اس کے پاس سے گزر رہے تھے، لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ راشد کو یہ سپاہی بہت عجیب معلوم ہوا۔ وہ اس کے پاس پہنچا اور بولا، "بھائی، تم کون ہو؟ اور کس فوجی دستے کے سپاہی ہو؟" سپاہی نے کہا، "میں ابو عبداللہ کے محافظ دستے کا سپاہی ہوں۔"

راشد یہ سُن کر بہت حیران ہوا۔ اس نے کہا، "خدا تمھارے حال پر رحم فرمائے۔ ابو عبداللہ

تین سو سال پہلے یہاں کا بادشاہ تھا۔"

سپاہی بولا، "میرے بھائی، تم نے ٹھیک کہا ہے۔ بے شک ابو عبداللہ تین سو سال پہلے غرناطہ کا بادشاہ تھا۔ میں اس وقت سے پہرے دار کا فرض ادا کر رہا ہوں۔"

راشد بے یقینی سے سر ہلا کر بولا، "تین سو سال؟ یہ تو بڑی لمبی مدت ہے۔ کوئی شخص اتنے عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ ناممکن، سراسر ناممکن۔"

سپاہی افسردگی سے بولا، "تم یقین کرو کہ میں تین سو سال سے زندہ ہوں اور نہ جانے کب تک یہ عذاب جھیلتا رہوں گا، لیکن تمھیں دیکھ کر مجھے یقین ہو چلا ہے کہ اب میری مصیبت کا زمانہ ختم ہونے والا ہے۔" سپاہی پھر بولا، "میرے دوست، کیا تمھیں دولت چاہیے؟"

راشد ہنس کر بولا، "دنیا میں وہ کون سا شخص ہے جسے روپے پیسے کی ضرورت نہیں ہے؟"

یہ کہہ کر راشد نے اپنا دامن پھیلا دیا۔ سپاہی نے کہا، "ٹھیک ہے تم میرے پیچھے پیچھے آؤ میں تمھارا دامن اشرفیوں سے بھر دوں گا۔"

درویش نے سپاہی کی بات نہ سُنی اور بوتل میں منھ لگا دیا۔

راشد کے دل میں کچھ شک پیدا ہوا۔ اس نے کہا، "میں غریب ضرور ہوں، لیکن بے ایمان یا چور ڈاکو نہیں ہوں۔ میں دولت حاصل کرنے کے لیے کوئی غلط کام ہرگز نہیں کروں گا۔"

سپاہی غصّے سے بولا، "میں ایک سچّا مسلمان ہوں۔ تم مجھ پر بھروسا کرو اور بے خوف ہو کر میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

راشد سپاہی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ سپاہی لوگوں کے ہجوم میں سے بچ کر گزر رہا تھا جیسے کسی کو نظر ہی نہ آ رہا ہو۔ سپاہی ایک تنگ سی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ دُور الحمرا کے مینار نظر آ رہے تھے۔ جب وہ قلعے کے نزدیک پہنچے تو سورج کی آخری کرنیں قلعے کی دیواروں پر تھرتھرا رہی تھیں۔ سپاہی چلتے چلتے ایک شکستہ (ٹوٹی ہوئی) برجی کے پاس ٹھہر گیا۔ اس نے برچھی کا دستہ زمین پر مارا۔ بہت زور کی گڑگڑاہٹ ہوئی اور پتھریلی زمین میں ایک شگاف پیدا ہو گیا۔ سپاہی نے کہا، "خدا کا نام لے کر تہ خانے میں داخل ہو جاؤ اور بالکل مت ڈرو۔"

راشد کو بہت ڈر لگا، پھر بھی وہ ہمّت کر کے سپاہی کے پیچھے اس تہ خانے میں داخل ہو گیا۔ اس کی دیواروں پر عربی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ سپاہی نے لوہے کے ایک صندوق کی طرف اشارہ کر کے کہا، "پچھلے تین سو سال سے یہی میرا بستر اور بچھونا ہے۔"

راشد نے پوچھا، "اس جگہ تمھیں نیند کیسے آتی ہو گی؟"

سپاہی بولا:

"پچھلے تین سو سال سے میں پلک تک نہیں جھپک سکا ہوں۔ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ میں ابو عبداللہ کے محافظ دستے کا سالار ہوں۔ جب محل پر دشمنوں کا قبضہ ہو گیا تو اس نے خزانے کو اس تہ خانے میں منتقل کر دیا اور مجھے اس کا محافظ بنا دیا۔ ابو عبداللہ کے ساتھ ایک جادوگر تھا۔ خدا جانے اس نے کیا منتر پڑھ کر پھونک ماری کہ میرا جسم پتھر کی طرح سخت ہو گیا۔ وہ مجھے اس تہ خانے میں بند کر کے چلے گئے اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے۔ اس واقعے کو تین سو برس بیت گئے۔ اس عرصے میں قلعہ الحمرا کی دیواریں اور برج ٹوٹ پھوٹ گئے۔ یہ تہ خانہ اور اس میں موجود ہر چیز جوں کی توں موجود ہے، کیوں کہ اس پر طلسم کا اثر ہے۔ ہر سو سال بعد طلسم کچھ دیر کے لیے دُور ہو جاتا ہے۔ اس وقت میں تہ خانے سے نکل کر اس پل پر آتا ہوں اور اس شخص کا انتظار کرتا ہوں جو مجھے اس قید سے نجات دلائے گا۔ تم پہلے شخص ہو جس نے مجھے دیکھا اور

مجھ سے بات چیت کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے سلیمانی انگوٹھی پہنی ہوئی ہے۔ یہ انگوٹھی ہر قسم کے جادو کے اثر کو دُور کر سکتی ہے۔ اب یہ تمھارے اختیار میں ہے کہ تم مجھے رہائی دلاؤ یا ہمیشہ کے لیے اس قید خانے میں چھوڑ جاؤ۔"

راشد بہت توجہ سے یہ دل چسپ اور حیرت انگیز داستان سنتا رہا۔ اس نے کہا، "دوست، میں تمھیں رہائی دلانے کی پوری کوشش کروں گا۔"

سپاہی نے صندوق کی طرف اشارہ کر کے کہا، "اس صندوق میں بے شمار سونے چاندی کے سکّے جواہرات اور قیمتی زیورات بند ہیں۔ اگر تم اس طلسم کو توڑ دو جس میں، میں قید ہوں تو یہ خزانہ تمھیں دے دوں گا۔"

راشد نے پوچھا، "میں اس طلسم کو کیسے دُور کر سکتا ہوں؟"

سپاہی بولا، "اس جادو کو دُور کرنے کے لیے ایک عبادت گزار درویش اور ایک نیک سیرت لڑکی کی ضرورت ہے۔ یہاں آنے سے پہلے درویش روزہ رکھے گا۔ پھر وہ ان دیواروں پر لکھی ہوئی عبارت کو بلند آواز سے پڑھے گا۔ وہ نیک سیرت لڑکی سلیمانی انگوٹھی میری ذرہ بکتر سے رگڑے گی۔ اسی وقت طلسم کا اثر جاتا رہے گا اور میں آزاد ہو جاؤں گا، لیکن یاد رکھنا کہ یہ عمل شروع ہونے کے بعد کوئی شخص نہ تو شراب پیے گا اور نہ کوئی بُرا کام کرے گا۔"

راشد نے کہا، "میں ایک درویش اور اس کی نیک سیرت خادمہ کو جانتا ہوں۔ میں انھیں اپنے ساتھ لے کر بہت جلد واپس آؤں گا۔"

سپاہی بولا، "مجھے صرف تین دن کی مہلت ملی ہے۔ اگر ان دِنوں میں مجھے رہائی نہ ملی تو پھر سو سال تک مجھے اس قید خانے میں گزارنے پڑیں گے۔"

راشد بولا، "تم کوئی فکر نہ کرو۔ میں بہت جلدی واپس لوٹوں گا، لیکن یہ تو بتاؤ کہ میں دوبارہ اس تہ خانے میں کیسے داخل ہو سکوں گا؟"

سپاہی نے کہا، "تم سلیمانی انگوٹھی کو تہ خانے پر رکھے ہوئے پتھر سے رگڑنا، تہ خانے کا دروازہ آپ ہی کھُل جائے گا۔"

اگلے دن راشد درویش کے پاس پہنچا۔ اس نے اسے سپاہی کی کہانی سنائی۔ خزانے کا ذکر سنتے ہی درویش کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ وہ بولا، "میں اس مظلوم سپاہی کی ضرور مدد کروں گا۔

تم جانتے ہو مجھے دولت کی ہوس نہیں ہے۔ اگر یہ خزانہ مجھے مل جائے تو میں اسے نیک کاموں پر صرف کر دوں گا اور غریبوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دوں گا۔"

یہ درویش بہت ریاکار شخص تھا۔ وہ بہت عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ تنہائی میں شراب بھی پیتا تھا۔ درویش کے لیے روزہ رکھنا بے حد مشکل ثابت ہوا۔ اس نے دو دفعہ روزہ رکھنے کی کوشش کی اور دونوں دفعہ بھوک، پیاس اور شراب کی طلب سے بے تاب ہو کر روزہ توڑ دیا۔ تیسرے دن اس نے اپنے اوپر بہت جبر کیا۔ شام کے وقت درویش، خادمہ اور راشد قلعے کی طرف چلے۔ خادمہ کے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی جس میں بھنا ہوا مرغ، کباب، قورمہ، پھل اور شربت تھا۔ یہ درویش کے افطار کا سامان تھا تاکہ جب روزہ ختم ہو تو وہ پیٹ بھر کر کھانا کھا سکے۔

تہ خانے کے دروازے پر پہنچ کر راشد نے سلیمانی انگوٹھی تہ خانے کے دروازے سے رگڑی اور وہ ایک پُرشور آواز کے ساتھ کھل گیا۔ وہ تہ خانے میں داخل ہوئے۔ سپاہی ابھی تک صندوق پر بیٹھا ہوا اُن کا انتظار کر رہا تھا۔

سپاہی کی ہدایات کے مطابق طلسم توڑنے کی سب رسمیں ادا کی گئیں۔ پہلے درویش نے دیواروں پر لکھی ہوئی عبارت اونچی آواز سے پڑھی۔ اس کے بعد خادمہ نے سلیمانی انگوٹھی کو سپاہی کی زرہ بکتر (لوہے کا کوٹ) سے رگڑا۔ زرہ بکتر ریزہ ریزہ ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اب وہ اس قید سے آزاد تھا۔ اس نے ہاتھ اوپر اُٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا۔

پھر خادمہ نے انگوٹھی کو صندوق سے رگڑا۔ صندوق کا ڈھکنا ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ صندوق سونے چاندی کے سکّوں، ہیرے جواہرات اور قیمتی زیوروں سے بھرا ہوا تھا۔ راشد جلدی جلدی اپنی جیبیں سونے چاندی کے سکّوں سے بھرنے لگا۔

سپاہی نرمی سے بولا، "جلدی اور گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم اس صندوق کو باہر نکال کر اس کی دولت آپس میں بانٹ لیں گے۔"

اُدھر درویش کا بھوک اور پیاس سے بُرا حال تھا۔ آخر اللہ اللہ کر کے سورج غروب ہوا۔ درویش کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ بھنا مرغ، قورمہ، کباب، کورفتے کھا کر اس کی جان میں جان آئی۔ اب اسے شراب کی طلب (خواہش) ہوئی۔ اس نے اپنی جیب سے شراب کی بوتل نکالی اور بولا، "میری انتڑیوں میں آگ سی لگی ہوئی ہے۔ میں زیادہ دیر تک یہ عذاب برداشت نہیں کر

سکتا۔" سپاہی نے چلّا کر کہا، "خبردار، شراب کو ہاتھ نہ لگانا ورنہ اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔"
لیکن درویش نے سپاہی کی بات سُنی اَن سُنی کر دی اور بوتل منھ سے لگا کر غٹا غٹ پینے لگا۔ سپاہی کے منھ سے ایک چیخ نکلی۔ صندوق کا ڈھکنا ایک دھماکے سے بند ہوگیا اور اس پر قفل (تالا) لگ گیا۔ اس کے ساتھ ہی زلزلہ آ گیا۔ تہ خانے کی دیواریں لرزنے لگیں۔ کسی غیبی طاقت نے راشد، خادمہ اور سپاہی کو تہ خانے سے اُچھال کر باہر پھینک دیا۔ پھر ایک گرج دار آواز کے ساتھ تہ خانے کا راستہ بند ہو گیا اور درویش تہ خانے میں بند ہو گیا۔

جب خوف اور دہشت کا غلبہ ذرا کم ہوا تو راشد نے پھر تہ خانے میں جانے کا ارادہ کیا۔ اس دوران سلیمانی انگوٹھی کہیں گر گئی تھی۔ اپنے آقا کو یاد کر کے خادمہ رونے لگی۔ سپاہی نے کہا، "بی بی، اب رونے دھونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کیا تم نے سُنا نہیں کہ جو گناہ کرے گا وہ اس کی سزا بھگتے گا۔ اب وہ اپنے گناہوں کی پاداش (سزا) میں سیکڑوں سال تک قید رہے گا۔ ہاں، اگر کسی کے پاس سلیمانی انگوٹھی ہو تو وہ اسے رہائی دلا سکتا ہے۔"

تینوں کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ سپاہی نے پھر کہا، "میں تمھیں ایک مشورہ دیتا ہوں۔ یہ لڑکی اب بے سہارا ہو گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ایک اچھی بیوی ثابت ہو گی۔"

سپاہی جانے کے لیے مُڑا۔ راشد نے کہا، "دوست، تم بھی اس دنیا میں تنہا ہو۔ میری درخواست ہے کہ تم ہمارے ساتھ ہی رہو۔"

سپاہی نے راشد کی بات مان لی۔ راشد نے اس نیک سیرت لڑکی سے شادی کر لی۔ وہ اپنے ساتھ بہت سی اشرفیاں لے آیا تھا۔ اس لیے ان کی زندگی آرام اور سکون سے گزری۔

کام یابی

کام یابی کسی ایک خاص شخص کی ملکیت اور میراث نہیں ہے۔ ہر وہ شخص جو کام یابی حاصل کرنا چاہتا ہے کام یاب ہو سکتا ہے۔ برنارڈ شا نے کہا ہے: "لوگ اپنی ناکامیوں کی ذمے داری ہمیشہ اپنے حالات کے سر ڈالتے ہیں، لیکن میں حالات کا قائل نہیں ہوں۔ جو لوگ اس دنیا میں کام یابی حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ہمیشہ موافق حالات کی جستجو میں رہتے ہیں اور حالات کو ساز گار بنا لیتے ہیں۔ آپ بھی ناساز گار اور ناموافق حالات کو ساز گار بنا سکتے ہیں۔"

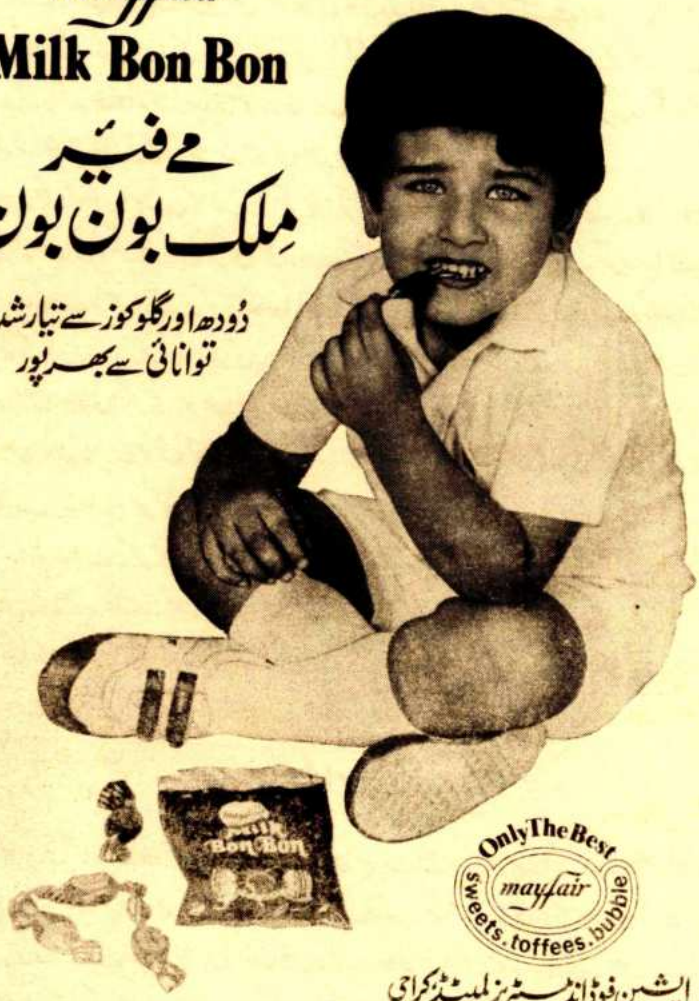

mayfair
Milk Bon Bon
مے فیئر
مِلک بون بون
دُودھ اور گلوکوز سے تیار شدہ
توانائی سے بھرپور
Milk Bon Bon
Only The Best
mayfair
sweets. toffees. bubble
ایشین فوڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کراچی

Adarts

سلسلہ وار ناول
ٹکڑا نمبر ایک

وارث کی تلاش

مناظر صدیقی

"امّی! مجھے گھوڑا دلوا دیجیے نا۔ دیکھیے نا۔ یہاں کھیلنے کے لیے میرا کوئی ساتھی بھی تو نہیں، اگر مجھے آپ نے گھوڑا ابھی نہ دلایا تو میں مر جاؤں گا۔ دلا دیجیے نا!" اُس نے آنسو بھری آنکھوں سے اپنی امّی سے کہا۔

"طارق! تم اگر اسی طرح مرتے رہے تو لوگ تمھیں جھوٹا چوہا کہنے لگیں گے، کیوں کہ وہ ذرا سی چوٹ لگنے سے ایسا لگتا ہے جیسے مر گیا ہو، لیکن پھر زندہ ہو جاتا ہے۔ اب بتاؤ کیا تمھیں چوہا بننا پسند ہے؟" طارق کی امّی نے پھولوں کا گل دستہ بناتے ہوئے کہا۔

"لیکن امّی آپ یہ بھی تو سوچیے کہ گھوڑا ہم سب کے فائدے کی چیز ہے۔ گاؤں ہمارے مکان سے کتنی دُور ہے۔ کوئی چیز لینی ہوتی ہے تو ہمیں گاؤں جانا پڑتا ہے۔ میری سائکل پر وہاں جانا کتنا مشکل ہے۔ راستے میں سڑک کچّی ہے، میری سائکل پھنس جاتی ہے۔ گھوڑا ہوگا تو میں اس پر بیٹھ کر گاؤں سے سودا لا دیا کروں گا۔" طارق نے اپنے خیال میں بڑی معقول دلیل پیش کی۔

"میرے بچّے! تم سودا لانے کے لیے پریشان نہ ہو۔ اوّل تو تمھارے ابّو سارا سودا اکھٹّا لے آتے ہیں۔ اگر کبھی ضرورت ہوتی ہے تو میں خود لے آتی ہوں۔ آخر ہمارے پاس دو موٹریں ہیں۔ پرانی ہی سہی، لیکن ہیں تو!" اس کی امّی نے مسکرا کر کہا اور طارق سوچنے لگا کہ گھوڑا خریدنے کے لیے امّی کو کیسے راضی کیا جائے۔

طارق کے ابّو یوں تو کراچی جیسے بڑے شہر کے رہنے والے تھے۔ وہیں انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کی تھی، لیکن انھیں شہر کی زندگی پسند نہ تھی۔ جب طارق کے دادا کا انتقال ہوگیا تو انھوں نے اپنی جائداد بیچ کر ٹھٹھہ سے کچھ دُور دولت پور نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں تھوڑی سی زمین خرید لی تھی۔ یہاں انھوں نے اپنی زمین پر سبزیاں اُگانی شروع کر دی تھیں۔ کچھ پھلوں کے درخت بھی لگا لیے تھے۔ شروع شروع میں طارق کے ابّو اور طارق کی امّی ہی اپنے باغ میں کام کرتے تھے۔ کچھ دِنوں کے بعد جب طارق کے بڑے بھائی ذرا بڑے ہوگئے تو وہ بھی اپنے امّی اور ابّو کا ہاتھ بٹانے لگے۔ اس باغ سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ آسانی سے گزر بسر ہو جاتی تھی۔ کچھ دِنوں کے بعد درختوں سے پھل توڑنے اور سبزیوں کے پودوں میں پانی ڈالنے کے لیے انھوں نے گاؤں کے کچھ آدمیوں کو بھی کام پر لگا لیا۔ اس طرح ان کے پاس خاصا وقت بچ گیا، لیکن طارق کے ابّو کو بے کار بیٹھے رہنا بالکل پسند نہ تھا۔ اتفاق سے انھیں دِنوں قریب کے گاؤں میں ایک بڑے بینک کی شاخ قائم ہوئی۔ طارق کے ابّو نے کوشش کی تو انھیں اس بینک میں ملازمت بھی مل گئی۔ اب انھوں نے ایک موٹر گاڑی خرید لی تھی۔ یہ گاڑی ایسی تھی جس میں وہ سبزیاں وغیرہ شہر بھی پہنچا دیتے اور اپنے بینک بھی چلے جاتے۔ انھوں نے طارق کی امّی کو بھی موٹر چلانا سِکھا دی۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے ایک اور موٹر خرید لی تھی، لیکن اس وقت دونوں موٹریں پرانی ہو چکی تھیں۔ پھر بھی کام کے قابل تھیں۔ کبھی کبھی یہ چلتے چلتے بند ہو جاتیں۔ یوں تو طارق کے امّی اور ابّو دونوں ہی تھوڑی بہت مرمّت کر لیتے تھے۔

پھر بھی بعض اوقات اچانک موٹر خراب ہو جانے سے بہت وقت برباد ہوتا تھا۔ طارق کی سمجھ میں اس وقت یہی بات آئی کہ موٹروں کی خرابی کا بہانہ بنا کر امّی کو گھوڑا خریدنے کے لیے آمادہ کیا جائے۔

"امی موٹریں تو اکثر خراب ہو جاتی ہیں اور آپ لوگوں کو تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔ گھوڑا تو کبھی خراب نہیں ہوتا۔"

امّی نے کہا، "میں تمھاری باتیں خوب سمجھتی ہوں۔ تمھیں یاد ہے تم نے تین سال پہلے اسی طرح سائکل خریدنے کی ضد کی تھی۔ اس وقت ہم نے تمھیں سائکل دِلا دی تھی، لیکن اس وقت تمھارے ابّو کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ تمھیں گھوڑا دِلا دیں۔ تمھیں اگر گھوڑا خریدنا ہے تو تمھیں اس کے لیے خود پیسے جمع کرنے ہوں گے۔"

"پھر تو مجھے نوکری کرنی پڑے گی۔" طارق نے کہا۔

"تمھاری عمر ابھی صرف تیرہ سال ہے۔ تمھیں ابھی نوکری کہاں ملے گی؟" امّی نے کہا۔

"تو پھر میرے پاس گھوڑے کے لیے پیسے کیسے جمع ہوں گے؟"

"ہاں! یہ تو واقعی سوچنے والی بات ہے۔" امّی نے بہ ظاہر کچھ سوچتے ہوئے کہا، "ایک ترکیب ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تم باغ کی صفائی کرتے، مرغیوں کو دانہ ڈالتے اور منّو کو سنبھالتے میں میری مدد کرو تو میں تمھارا جیب خرچ کچھ بڑھا دوں گی۔ ابّو کے کمرے کی صفائی کا وعدہ کرو تو میں ابّو سے سفارش کر دوں گی کہ وہ بھی تمھارا جیب خرچ بڑھا دیں۔ ایک سال تک تم اپنا تمام جیب خرچ جمع کرتے رہو تو تمھارے پاس کچھ پیسے جمع ہو جائیں گے۔ اس وقت تک تمھاری عمر بھی ۱۴ سال ہو چکی ہو گی۔ پھر اگر پیسے کم پڑے تو میں ابّو سے سفارش کروں گی کہ باقی پیسے وہ ملا دیں، لیکن شرط یہ ہے کہ تم اپنی تعلیم پر بھی پوری توجہ دو گے۔ اگر امتحان میں فیل ہوئے تو تمھارے جمع کیے ہوئے پیسے بھی ضبط اور گھوڑا بھی غائب۔ ایک بات اور رہے یعنی گھوڑے کی سواری کرنا آسان کام نہیں۔ اتنے دِنوں میں تمھیں گھوڑے کی سواری بھی سیکھنی ہو گی۔"

طارق نے امّی کی تمام شرطیں منظور کر لیں۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ گھوڑے کی سواری کیسے سیکھے گا اور اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ اتنے سارے کام کیسے کرے گا۔

طارق امی کی شرطیں قبول کر کے دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ ایک سال کے بعد اس کے پاس بھی گھوڑا آ جائے گا۔ اسی وقت ابّو کی کار آتی ہوئی نظر آئی۔ حال آنکہ یہ ابّو کے آنے کا وقت نہیں تھا۔ طارق کو ابّو کے اس وقت آنے پر حیرت تو ہوئی، لیکن وہ گھوڑا خریدنے کے سلسلے میں امّی کے وعدے سے اتنا خوش تھا کہ یہ سب کچھ بھول کر ابّو کے پاس پہنچ گیا تاکہ انھیں بھی بتا سکے کہ امّی نے اس سے کیا وعدہ کیا ہے۔ ابّو نے اس کی بات سُنی تو مسکرا دیے۔ اتنی دیر میں امّی بھی کار کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ انھوں نے اتنی جلدی آنے کی وجہ پوچھی تو ابّو نے بتایا کہ جب وہ بینک جا رہے تھے تو راستے میں پرانی حویلی کے مالک خداداد خاں صاحب اُنھیں سڑک کے کنارے بے ہوش پڑے ہوئے ملے تھے۔ انھوں نے خداداد خاں صاحب کو اپنی موٹر میں ٹھٹھے کے ہسپتال پہنچا دیا۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ خاں صاحب پر نمونیہ کا شدید حملہ ہوا ہے۔ وہ دوپہر تک بے ہوش تھے۔ ڈاکٹروں کو ان کی جان بچنے کی امید بہت کم ہے۔

خداداد خاں صاحب کا نام سُن کر طارق چونکا۔ اسے خاں صاحب سے بڑی نفرت تھی۔ گاؤں بھر میں وہ انتہائی کنجوس مشہور تھے۔ بات بھی کچھ ایسی تھی۔ ان کی حویلی دُور دُور تک مشہور

تھی۔ لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ بہت مال دار آدمی ہیں۔ ان کے پاس لاکھوں رُپیہ ہے، لیکن وہ اپنی ذات پر ایک پائی بھی خرچ نہیں کرتے۔ ان کی حویلی پر برسوں سے رنگ نہیں کیا گیا تھا۔ کبھی حویلی کے چاروں طرف خوب صورت باغ تھا، لیکن اب تو وہ جنگل سا معلوم ہوتا تھا۔ وہ جب بھی باہر نکلتے تو ایک پھٹا پرانا کوٹ پہنے ہوتے۔ جس پر جما ہوا میل دُور سے نظر آتا۔ وہ خاصے بوڑھے تھے۔ جب اپنا پرانا کوٹ اور سر پر پرانا ہیٹ لگائے باہر نکلتے تو طارق کو ایسا معلوم ہوتا جیسے کھیتوں میں چڑیوں کو بھگانے کے لیے کھڑا کیا جانے والا ڈراؤنا کھیتوں سے نکل کر آ گیا ہو۔ وہ کسی کو اپنی حویلی کے قریب بھی نہیں آنے دیتے۔ کوئی ان کی زمین پر آ جاتا تو سخت ناراض ہوتے۔ ایک مرتبہ طارق کھیلتے کھیلتے ان کی زمین پر چلا گیا تھا تو وہ اتنی زور سے چلّائے تھے کہ طارق سہم کر رہ گیا تھا۔ اب ان کی بیماری کی خبر سُن کر طارق کو خاں صاحب کی وہ ڈانٹ یاد آ گئی۔ اس نے ابّو سے کہا:

"ابّو! آپ نے اس کنجوس بڈھے کو ہسپتال کیوں پہنچایا۔ وہیں پڑا رہنے دیتے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کیا کرو۔" طارق کے جملے سے ابّو سخت ناراض تھے، لیکن انھوں نے غصّہ ضبط کرتے ہوئے طارق کو سمجھایا، "خداداد خاں صاحب ہمارے پڑوسی ہیں اور تمھیں شاید نہیں معلوم کہ وہ ہمیشہ سے ایسے نہیں ہیں جب ہم یہاں آئے تھے تو خاں صاحب کی بیوی زندہ تھیں۔ وہ دونوں اکثر ہمارے گھر آتے تھے۔ تمھارے بڑے بھائی شاہد ایک مرتبہ بیمار پڑ گئے تھے۔ تم اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت خاں صاحب اور ان کی بیوی نے شاہد کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیے تھے۔ وہ دونوں بہت ملن سار تھے۔"

"تو اب وہ دُنیا سے الگ تھلگ کیوں رہتے ہیں؟" طارق نے پوچھا۔ اس مرتبہ ابّو کے بجائے امّی نے جواب دیا:

"ایک دن خاں صاحب کی بیوی کو سانپ نے کاٹ لیا۔ شاید وہ پہلے ہی ان کی کرسی پر چڑھ کر گدّی کے نیچے بیٹھ گیا تھا۔ خاں صاحب کی بیوی جیسے ہی کرسی پر بیٹھیں سانپ نے انھیں کاٹ لیا۔ خاں صاحب فوراً اپنی کار میں اپنی بیوی کو لے کر ہسپتال کے لیے روانہ ہو گئے، لیکن اتفاق سے کار راستے میں خراب ہو گئی۔ اس علاقے میں دوسری کاریں بھی نہیں تھیں۔ انھیں سڑک پر انتظار کرنا پڑا کہ شہر کی طرف سے کوئی کار یا دوسری گاڑی آ جائے تو وہ اپنی بیوی کو ہسپتال

لے جائیں۔ بڑی دیر کے بعد ایک گاڑی آئی، لیکن اس وقت تک سانپ کا زہر بدن میں پھیل چکا تھا۔ ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعے سے خداداد خاں کو بہت رنج ہوا انھوں نے اپنی کار وہیں چھوڑ دی۔ دوبارہ کبھی اسے استعمال نہیں کیا۔ وہ کار آج تک وہیں پڑی ہوئی ہے۔ اب تو صرف اس کا ڈھانچا رہ گیا ہے۔ بیوی کے انتقال کے بعد وہ کئی مہینے تو گھر سے نکلے ہی نہیں۔ سب لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ مہینوں کپڑے نہیں بدلتے۔ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گئے ہیں۔ چڑچڑے بھی ہو گئے ہیں۔ ہم سب کو ان سے ہمدردی ہے۔ اسی لیے ان کے غصّے کو بھی سب لوگ برداشت کرتے ہیں۔"

امّی کی زبانی خداداد خاں صاحب کی کہانی سُن کر طارق کو بھی افسوس ہوا۔ تھوڑی دیر کے لیے تو وہ گُم سُم ہو گیا، لیکن اچانک اس کی نظر راحت محل پر پڑی تو وہ وہاں کئی آدمیوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ طارق کے ابّو کی جہاں زمین تھی وہاں صرف تین عمارتیں تھیں۔ تینوں خاصی بڑی تھیں۔ ان میں سب سے چھوٹی عمارت طارق ہی کا مکان تھا اور سب سے بڑی عمارت راحت محل۔ خداداد خاں کی حویلی کو لوگ پرانی حویلی کہتے تھے۔ شاید وہ اس علاقے کی سب سے پرانی عمارت تھی۔ راحت محل کے ساتھ کئی ایکڑ زمین تھی۔ زمین تو پرانی حویلی کے ساتھ بھی تھی اور طارق کے مکان کے ساتھ بھی۔ لیکن راحت محل کی زمین بہت بڑی تھی۔ یہ عمارت عام طور پر خالی پڑی رہتی تھی، لیکن آج وہاں کئی آدمی چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر طارق نے امّی سے کہا،

"امی وہ دیکھیے آج تو راحت محل میں کئی آدمی نظر آ رہے ہیں۔"

"ہاں! راحت محل کراچی کے ایک مال دار تاجر سیٹھ کریم نے خرید لیا ہے۔ سُنا ہے وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو یہیں رکھیں گے، کیوں کہ شہر میں اس کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ ان کا لڑکا بھی تمھاری عمر کا ہے۔ تمھیں کھیلنے کے لیے کسی ساتھی کی ضرورت تھی۔ وہ اب تمھیں مل گیا۔" امّی نے بتایا۔

"تو پھر میں اپنے نئے دوست سے مل آؤں؟" طارق نے اجازت مانگی۔

"ضرور مل آؤ، لیکن منّو کو سنبھالنے کی ڈیوٹی نہ بھولنا، ورنہ تمھارے پاس گھوڑا خریدنے کے لیے پیسے جمع نہیں ہوں گے۔" امّی نے اجازت دے دی۔

ہمدرد نونہال، ستمبر ۱۹۸۶ء

مُنّو طارق کا چھوٹا بھائی تھا۔ اتنا چھوٹا کہ ابھی اس کی زبان میں توتلاہٹ باقی تھی، لیکن تھا بہت ذہین۔ طارق نے مُنّو کو ساتھ لیا اور راحت محل کی طرف چل دیا۔ راستے میں اُس نے مُنّو کو سمجھایا کہ دونوں بہت امیر آدمی کے بیٹے سے ملنے جا رہے ہیں اس لیے مُنّو کو چاہیے کہ کوئی شرارت نہ کرے۔

دونوں جب راحت محل پہنچے تو وہاں کئی ملازم نظر آئے۔ کوئی صفائی کر رہا تھا، کوئی درختوں میں پانی ڈال رہا تھا۔ ایک آدمی ایک گھوڑے کی مالش کر رہا تھا۔ وہاں دو گھوڑے اور کھڑے تھے۔ وہ دونوں جیسے ہی اصل عمارت کے پاس پہنچے تو عمارت سے ایک دُبلا پتلا لڑکا باہر نکلا۔ وہ قد میں طارق سے کچھ چھوٹا تھا، لیکن عمر شاید طارق کے برابر ہی تھی۔ طارق پہچان گیا کہ یہی سیٹھ کریم کا بیٹا ہے۔ اس نے اپنا تعارف کرایا: "میرا نام طارق ہے۔ میرے والد کا نام زاہد رشید ہے۔ میں آپ کے پڑوس میں رہتا ہوں۔ ہمارے کھیتوں اور باغ کا نام زاہد فارم ہے۔ یہ میرا چھوٹا بھائی مُنّو ہے۔ ہم لوگ اسے پیار سے مُنّو کہتے ہیں ورنہ اس کا اصلی نام متین ہے۔"

"مجھے حبیب کہتے ہیں۔ میں سیٹھ کریم کا لڑکا ہوں۔ اس مکان میں میں اپنے اتالیق کے ساتھ رہوں گا۔ ابّو اور امّی تو آج شام واپس کراچی چلے جائیں گے۔ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، کیوں کہ میں سوچ رہا تھا کہ شاید کراچی کی طرح یہاں بھی مجھے کھیلنے کے لیے کوئی ساتھی نہیں ہو گا۔" دُبلے پتلے لڑکے نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں طارق اور حبیب میں گہری دوستی ہو گئی۔ طارق نے حبیب کو گاؤں کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ اس نے پرانی حویلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ ایک بوڑھے آدمی خداداد خاں کی ملکیت ہے۔ وہ ان دِنوں ہسپتال میں بیمار پڑے ہیں۔ میرے ابّو نے آج ہی بے ہوشی کی حالت میں انھیں ہسپتال میں داخل کرایا ہے۔ شاید کوٹھی ابھی تک کھُلی پڑی ہو۔ طارق نے ارادہ ظاہر کیا کہ چل کر اس کوٹھی کے دروازے بند کر دیتے چاہییں، کیوں کہ یہ ایک نیکی کا کام ہے۔ ہمیں پڑوسی کی حیثیت سے اپنے پڑوسی کے مکان کی حفاظت کرنی چاہیے۔

حبیب کو بھی یہ بات پسند آئی کہ پڑوسی کے مکان کی حفاظت کے لیے دونوں جا کر کوٹھی کے دروازے بند کر دیں۔ چناں چہ مُنّو کو حبیب کے ملازموں کی نگرانی میں چھوڑ کر دونوں دوست پرانی حویلی کی طرف چل پڑے۔

(جاری ہے)

تعلیم اک پیہم عمل ہے
پاکستان نے تعلیم کے شعبے میں زبردست ترقی کی ہے۔
ہمارے سائنسدان، فنی مہارت اور پیشہ ورانہ صلاحیت رکھنے والے ذہین افراد
جدید علوم سے آراستہ ہو کر آج ملک کی ترقی و خوشحالی میں نمایاں کردار انجام دے رہے ہیں۔
یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ بھی مستحق طلبہ کو قرض حسنہ کی سہولت دے کر اعلیٰ تعلیم
کے شعبے میں اپنا ناچیز کردار ادا کر رہا ہے۔
یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ
خدمت کے لئے کوشاں

"مجھے ضروری کام سے اسلام آباد جانا ہے"
اس جملے کو انگریزی میں .....
ارے ماسٹر صاحب، جلدی کیجیے۔ اسلام آباد کی پرواز کا وقت ہو چکا ہے۔ اگر جہاز نکل گیا تو آپ کا ضروری کام رہ جائے گا۔
لڑکے! تمھیں کوئی بیماری نہیں ہے۔ درجہ حرارت بھی نارمل ہے۔ تو پھر تم میرے پاس کس لیے آئے ہو؟
ڈاکٹر صاحب! میں تو فون کرنے کی اجازت لینے آیا تھا، مگر آپ نے مجھے دیکھتے ہی معائنہ شروع کر دیا۔

اخبارِ نونہال

طاقت ور بلب

جاپان کی ایک فرم نے ۵۰ کلو واٹ طاقت کا ایک ایسا بلب تیار کیا ہے جس کی روشنی میں چھے سو گز دُور بیٹھ کر بھی اخبار آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے۔ اس بلب کا محیط ۲۱۔ انچ اور لمبائی ۳۶ انچ ہے۔ اس کی طاقت عام بلبوں سے ۲۰۰ گنی زائد ہے۔

مرسلہ: سیدہ زینب رافیہ زیدی، کراچی

دُکان دار کمپیوٹر

امریکا میں گاہکوں کو جلد نمٹانے کے لیے ایک ایسا کمپیوٹر ایجاد ہوا ہے جو اوپر سے گزرنے والی ہر شے کی قیمت نوٹ کر لیتا ہے اور جب آخری چیز بھی اس کے اوپر سے گزر جاتی ہے تو کمپیوٹر حساب بنا کر پرچی گاہک کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ یہ کمپیوٹر ہر شے کا سرطرفہ جائزہ لیتا ہے اور قیمت فوراً ٹائپ کر دیتا ہے۔ آخر میں میزان لکھنے کے بعد شکریہ کے الفاظ بھی ٹائپ کر دیتا ہے۔

مرسلہ: محمد صابر حسین، حیدر آباد

سب سے بڑی انعامی رقم

پیرس کے ۲۵ سالہ خانساماں سرج اور ویٹرس لوئیسا نے ایک لاٹری کے ذریعہ سے ایک کروڑ فرانک سے زیادہ کا انعام حاصل کیا۔ یہ انعامی رقم دنیا میں اب تک دی جانے والی سب سے بڑی رقم ہے۔

مرسلہ: شازیہ اسلام زبیری، کراچی

مچھلیاں خود ملاحوں کے گھروں میں آجاتی ہیں

آرناس فرانس کا ایک ایسا علاقہ ہے جس میں دریائے لوئی بہتا ہے۔ یہاں کے ماہی گیروں کو مچھلیاں پکڑنے کے لیے کانٹا لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی، کیوں کہ دریا کی سطح اور مکانوں کی بنچھ ایک جیسی ہے اس لیے مچھلیاں تیرتی ہوئی خود ملاحوں کے گھروں میں آجاتی ہیں۔

مرسلہ: عشرتاج وارثی، اسلام آباد

سب سے بڑا گھنٹہ گھر

دنیا کا سب سے بڑا گھنٹہ گھر بیل فرے ہے، جو ماسکو کے ریڈ اسکوائر کے قریب واقع ہے۔ اسے ۱۷۳۷ء میں بنایا گیا تھا۔ اس میں لگے ہوئے گھنٹے کا وزن دو سو ٹن ہے۔ گیارہ ٹن کا ایک ٹکڑا بناتے وقت اس سے علاحدہ ہو گیا تھا، جو آج بھی وہیں پڑا ہے۔ اس پر زار ایلیکسی اور زارینہ کی تصاویر کندہ ہیں۔ اس کے اوپر چاندی کی نقش نگاری بھی کی گئی ہے۔

مرسلہ: محمد عبدالصمد، سانگھڑ

سب سے چھوٹی تصویر

پاکستان کے بین الاقوامی شہرت یافتہ فن کار جناب اے زیڈ شمع راؤ نے یوم آزادیٔ پاکستان ۱۹۸۳ء کے موقع پر دنیا کی مختصر ترین پینٹنگ بنائی تھی۔ اس پینٹنگ میں انھوں نے چاول کے دانے پر پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ، مسور کے دانے پر قائداعظم کی تصویر، رائی کے دانے پر علامہ اقبال کی تصویر اور لوبیا کے دانے پر پاکستان کا پرچم بنایا تھا۔ جناب شمع راؤ اس سے پہلے متعدد ملکی اور غیر ملکی سربراہوں اور شخصیات کے پورٹریٹ (تصویریں) بنا کر انعامات اور تعریفی اسناد حاصل کر چکے ہیں۔

مرسلہ: سید امین الدین، اسلام آباد

جہاں چلے، رواں چلے
شاہ سنز کی نئی گولڈفنش آٹو کریٹ پینسل

پینسل کی کہانی
خود اس کی زبانی

پیارے بچّو! کیا آپ کو معلوم ہے کہ مجھے سب سے پہلے کس نے اور کب تیار کیا؟ ۱۷۹۵ء کی بات ہے۔ ایک فرانسیسی باشندے نے سب سے پہلے میرا سکہ دریافت کیا۔ اس سکے میں گریفائٹ اور کلے کا مخلول شامل ہوتا ہے جسے گرم بھٹی میں ایک ہزار فارن ہائٹ کے درجہ حرارت پر گرم کیا جاتا ہے۔ اس گریفائٹ میں کاربن کی مقدار ۹۰ فیصد ہوتی ہے جبکہ کلے اسے مضبوطی سے جوڑنے کے لیئے استعمال ہوتی ہے۔ رنگین پنسلوں میں موم، تیل اور مختلف رنگ شامل کئے جاتے ہیں پنسلوں میں استعمال ہونیوالی لکڑی کیلیفورنیا اور راںڈوئیشیا سے درآمد کی جاتی ہے

پاکستان میں ان پنسلوں کی تیاری کے لیئے **شاہ سنز** کا نام سرفہرست ہے۔ ان کی پنسلیں عالمی معیار کے مطابق تیار کی جاتی ہیں۔ ان کا سکہ مضبوط اور رواں ہوتا ہے۔
شاہ سنز کی نئی آٹو کریٹ پنسل کا تو جواب نہیں۔
ایک بار آزمانے کے بعد آپ اسے بار بار استعمال کریں گے،
دفتروں میں، اسکولوں میں، آرٹسٹ،
انجنیئرز، طالب علم سب ہی اسے استعمال کرتے ہیں۔

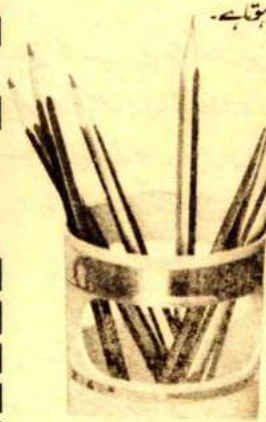

شاہ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ڈی ۸۸ - ایس۔ آئی۔ ٹی۔ ای۔ کراچی
فون: ۲۹۳۴۵۱، ۲۹۳۴۵۲

Midas Khi

ساحلی جنگلات

ڈاکٹر سہیل برکاتی

پاکستان کو اللہ نے جہاں اور بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے وہاں ۵۲۷ میل لمبے ساحل کی شکل میں ایک بیش بہا خزانہ بھی دیا ہے۔ سمندر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں مسلمانوں کو سمندر اور اس سے متعلق علوم کی طرف متوجہ کیا۔ سمندر سے غذا اور استعمال کی دوسری چیزیں حاصل کرنے کی طرف راغب کیا۔ عربوں نے قرآن سے راہ نمائی حاصل کرتے ہوئے جہاز رانی کے فن میں خوب ترقی کی۔

جغرافیائی لحاظ سے پاکستان منطقہ حارہ میں واقع ہے۔ دنیا کے اس حصّے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ ایسے جنگلات پائے جاتے ہیں جن کے نشوونما کے لیے سمندری پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کو "کرنا کے جنگلات" (MANGROVES) کہا جاتا ہے۔ جس طرح سمندر کے ساحل پر پانی کبھی آگے آجاتا ہے اور کبھی پیچھے چلا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ جنگلات پانی میں ڈوبتے اور اُبھرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ یہ جنگلات خالص سمندری پانی کے مقابلے میں اس علاقے میں زیادہ ہوتے ہیں جہاں بارش کا پانی یا شہر کے ندی نالوں کے راستے سے آنے والا پانی سمندر میں آکر گرتے ہیں اور پانی کی نمکیت کو کم کرتے ہیں۔ کرنا کے جنگلات شمالی اور جنوبی نصف کرہ میں ۳۲ درجہ عرض البلد تک پھیلے ہوئے ہیں۔ برّاعظم آسٹریلیا میں یہ جنگلات البتہ ۳۸ درجہ عرض البلد تک پائے جاتے ہیں۔

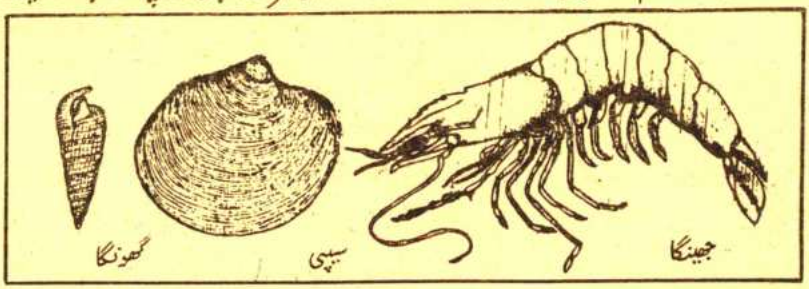

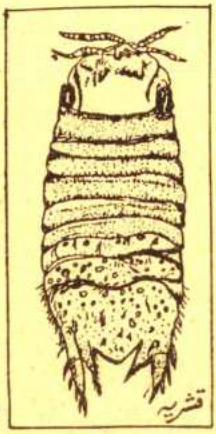

قشریہ

پاکستان کے دو صوبوں سندھ اور بلوچستان کی سرحد بن سمندر سے ملتی ہیں، لیکن کرنا کے جنگلات زیادہ تر سندھ کے ساحل پر واقع ہیں۔ ایک سروے کے مطابق یہ جنگلات ۲۴۹،۴۸۶ ہیکٹر پر پھیلے ہوئے ہیں۔ بلوچستان میں یہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کرنا کے جنگلات میں مختلف انواع کے درخت پائے جاتے ہیں۔ پاکستان میں یوں تو آٹھ قسم کے درخت ملے ہیں، لیکن جو قسم کثرت سے نظر آتی ہے اس کا نباتاتی نام (AVICENNIA MARINA) ہے۔ مقامی لوگ اسے تیمر (TIMER) کہتے ہیں۔

کرنا کے جنگلات ابتدا ہی سے انسان کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ خاص طور پر ساحلِ سمندر کے قریب رہنے والے لوگ ان پر مکمل انحصار کرتے ہیں۔ آگ جلانے اور گھر بنانے کے لیے لکڑی، مویشیوں کے لیے چارا، کھانے کے لیے سمندری جانور (جھینگا، مچھلی وغیرہ) اس کے علاوہ مختلف بیماریوں کا علاج بھی ان درختوں سے کیا جاتا تھا۔ سمندری شکار پر جانے کے لیے کشتیاں بھی ان درختوں کی لکڑیوں سے بنتی تھیں۔

کرنا کے جنگلات، کی اصل اہمیت اس میں آباد بے شمار قسم کے حیوانات اور نباتات سے ہے، جن کی وجہ سے یہ علاقہ نہایت زرخیز بن گیا ہے۔ درختوں کے پتّے جب نیچے گرتے ہیں تو خُرد بینی جراثیم ان کو نہایت قیمتی غذا میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ندی نالوں کے ذریعہ سے آنے والے غیر نامیاتی اجزا یہاں پہنچ کر نامیاتی مرکبات میں تبدیل ہو جاتے ہیں، جن سے اس علاقے کی غذائی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جھینگے، مچھلیاں اور دوسرے اہم سمندری جانور اس علاقے میں خاص طور سے خوراک حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ سمندری جھینگے اور مچھلیاں دوسرے ملکوں کو برآمد کر کے ہم کثیر تعداد میں زرمبادلہ حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح یہ جنگلات ہمارے ملک کی معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

کرنا کے جنگلات کو موجودہ دَور میں ایک اور اہم کام میں استعمال کیا جا رہا ہے، یعنی

سمندری جانوروں کی آبی کاشت کے لیے۔ آبی کاشت کا مطلب ہے کہ جانوروں کو مطلوبہ مقدار اور موسم میں حاصل کرنے کے لیے مصنوعی طریقے سے پالنا اور نشوونما کرنا۔ کرنا کے جنگلات اس مقصد کے لیے بہت مفید پائے گئے ہیں، کیوں کہ ایک تو یہ سمندر کے قریب ہوتے ہیں، اس لیے سمندر کے پانی کو آسانی سے تالابوں میں لایا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تالاب بنانے کے لیے تمام چیزیں کرنا کے جنگلات میں مل جاتی ہیں۔ پھر علاقے کی زرخیزی کی وجہ سے جانوروں کا نشوونما بھی تیز ہوتا ہے۔ اس وقت دنیا کے کئی ملکوں میں بحری جانوروں کی آبی کاشت ہو رہی ہے۔ ان میں مچھلیوں، جھینگوں، صدفی حیوانوں، کیکڑوں اور بحری نباتات کی کئی قسمیں شامل ہیں۔

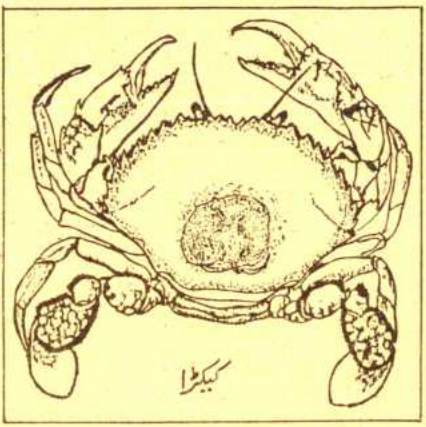
کیکڑا

ہمارے ملک میں جامعہ کراچی میں سندھ کے کرنا پر بڑی تفصیل سے تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ ابتدائی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہاں ۱۲۰ قسم کے غیر فقری جیوان پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق حیوانات صدفیہ (MOLLUSCS) سے ہے۔ دوسرے نمبر پر قشریہ آتے ہیں۔ کچھ جانور ایسے بھی پائے گئے ہیں جو کرنا کے درختوں میں ہی رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ درخت میں داخل ہو جائیں تو ساری زندگی وہیں گزار دیتے ہیں۔ یہ درخت میں مسلسل آگے بڑھتے رہتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے جسم کی لمبائی میں بھی اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ جانور درختوں کے لیے نقصان دہ ہیں، کیوں کہ درختوں کو اندر سے کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ ان کو "بحری دیمک" کا نام بھی دیا گیا ہے۔

کرنا کے جنگلات کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ یہ سمندری جھینگوں کی پرورش کے لیے بہت ضروری ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا کے کئی ممالک میں کرنا کے علاقے کو جھینگوں کی کاشت کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ فلی پین میں ۱۷۲۰۰۰ ہیکٹر علاقہ جھینگوں کی پرورش

کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ ہماری تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ معاشی اہمیت کے جھینگوں کی کئی قسمیں کرنا اور اس کے قریب کے کم گہرائی والے علاقوں میں زندگی کا کچھ حصّہ گزارتی ہیں۔ یہاں انھیں اچھی غذا کے ساتھ موسم کی شدّت اور سمندر کی تیز موجوں سے تحفّظ بھی ملتا ہے۔

سمندر کے ساحلی علاقوں میں واقع کرنا کے جنگلات سے جو بحری حیوانات غذا کے طور پر کھانے کے لیے نکالے جاتے ہیں۔ ان میں جھینگوں اور مچھلیوں کے علاوہ کیکڑے اور صدفی جانور (سیپیاں) بھی شامل ہیں۔ کیکڑوں کا سوپ کراچی کے بعض ہوٹلوں میں ملتا ہے اور بہت مزے دار ہوتا ہے۔ اسی طرح سیپیوں کی تین قسمیں بھی لوگ بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ البتہ ہمارے ہاں ان کا عام رواج نہیں ہے۔

یہ کرنا کے جنگلات سے متعلق چند خاص باتیں تھیں جو آپ نے پڑھی ہیں۔ ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کرنا کے جنگلات کسی ملک کی معیشت کے لیے کتنے اہم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان جنگلات کی خصوصی نگہ داشت، منصوبہ بندی اور ان میں کثافت کی روک تھام کے لیے اقدامات کی ضرورت ہے تاکہ ان سے اچھی طرح فائدہ اُٹھایا جا سکے۔

---

۸۱ لاکھ پونڈ کی تصویر

مشہور عالم مصور وان گاگ کی بنائی ہوئی ایک تصویر ۸۱ لاکھ پونڈ (یعنی پاکستانی ۱۶ کروڑ ۵۰ لاکھ رُپے) میں فروخت ہوئی۔ روزنامہ "مرر" کے مطابق کسی بھی آرٹسٹ کی بنائی ہوئی تصویر کی یہ سب سے بڑی قیمت ہے جو آج تک ادا کی گئی ہے۔

برف کی قوت

۱۹۵۱ء میں جرمنی کا ایک بڑھئی لکڑی کی ایک چھت کی مرمت کر رہا تھا۔ یکایک آسمان سے ایک برف کا چھے فیٹ لمبا برچھی جیسا نوکیلا ٹکڑا آیا اور بڑھئی کی پشت کے آر پار ہوتا ہوا چھت میں دھنس گیا۔

مُسکراتی تحریریں

مجتبیٰ حُسین

ہم اس بار ہندُستان کے مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے مضامین کے چند دِل چسپ ٹکڑے پیش کر رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کا شمار اس وقت ہندُستان کے مقبول مزاح نگاروں میں ہوتا ہے اور ان کی نصف درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام تکلّف برطرف ہے۔ وہ اردو کے مشہور و مقبول مزاح نگار اور صحافی ابراہیم جلیس مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ انھوں نے اپنا تعارف مندرجہ ذیل الفاظ میں کرایا ہے:

مجھ سے ملیے

"مجھ سے ملیے! مجھے مجتبیٰ حسین کہتے ہیں۔ مجھ سے مل کر آپ کو واقعی خوشی ہو گی یا نہیں، یہ میں نہیں جانتا، لیکن چوں کہ آپ رسماً یہ جملہ کہنے کے عادی ہیں کہ "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"، اسی لیے مجھے یقین ہے کہ آپ کو مجھ سے مل کر خوشی ہی ہو گی۔ میری زندگی کے دیگر احوال یہ ہیں کہ میں ۱۵۔ جولائی ۱۹۳۶ء کو اس دنیا میں پہلی بار پیدا ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک مسلسل زندہ ہوں اور اندیشہ ہے کہ آیندہ بھی کئی برسوں تک زندہ رہوں گا۔ مجھ جیسے سنجیدہ مزاج آدمی کو خواہ مخواہ مزاح نگار بنانے کی ذمے داری میرے بڑے بھائی جناب محبوب حسین جگر اور ایڈیٹر "سیاست" جناب میر عابد علی خاں پر عائد ہوتی ہے۔ انھی بزرگوں اور سرپرستوں کے حکم کی تعمیل میں، میں نے ۱۲۔ اگست ۶۲ء کو دن کے ٹھیک ساڑھے دس بجے سے مزاح نگاری کا آغاز کیا اور یہ نان اسٹاپ سلسلہ تادمِ تحریر جاری ہے۔ لوگ پیٹ کے لیے روتے ہیں اور میں پیٹ کے لیے ہنسنے لگا اور اب تک ہنستا جا رہا ہوں۔"

نکیے کا شعر

ہمیں یاد ہے کہ ہمارے ایک دوست کو ادھورے خواب دیکھنے کی بیماری تھی۔ وہ تھوڑا سا خواب

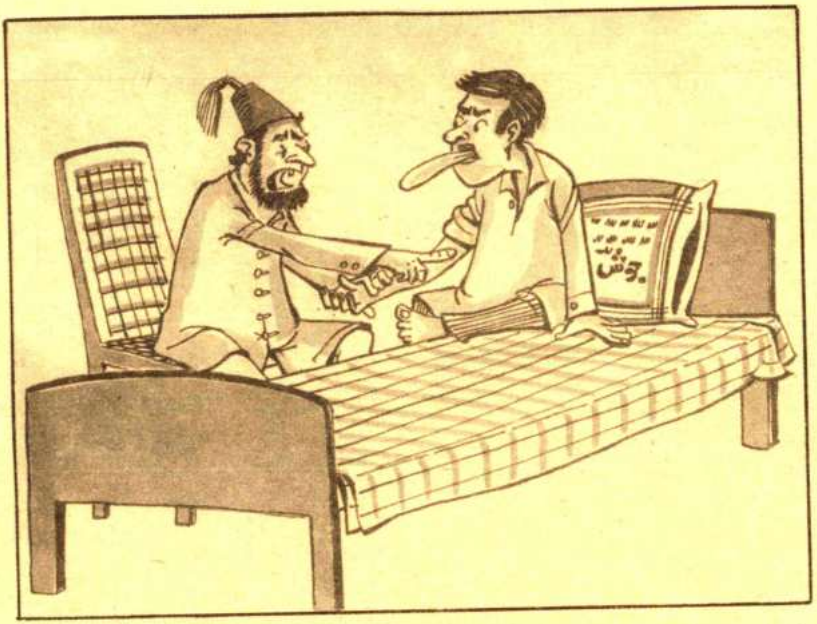

دیکھتے کہ بجلی فیل ہو جاتی اور وہ نیند سے چونک پڑتے۔ ایک دن بولے، "بھئی عجیب بات ہے کہ مجھے ادھورے خواب نظر آتے ہیں۔ آخر پورے خواب کیوں نظر نہیں آتے۔ میں خوابوں کے "ٹریلر" دیکھتے دیکھتے عاجز آ گیا ہوں۔" ہم نے ان کے بستر کا معائنہ کیا تو دیکھا کہ تکیہ پر ایسا شعر لکھا ہوا ہے کہ 'بحر' سے خارج ہے۔ اس پر ہم نے کہا، "بھئی اس کا اصل راز یہ ہے کہ تم ایسے تکیے پر سوتے ہو جس پر بے بحر شعر لکھا ہوا ہے اور اس تکیے کی کرامت سے تمھارے خواب بھی بحر سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اس شعر کو بدلو تو تمھارے خوابوں کی صحت بھی بہتر ہو جائے گی۔"

یہ تو ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ ہمارے ایک اور دوست کا قصہ ہے کہ انھیں عرصے سے بلڈ پریشر کی شکایت تھی۔ جب وہ بستر پر سو جاتے تو ان کا بلڈ پریشر آسمان سے باتیں کرنے لگتا۔ جب ابلیہ بیتھی سے فائدہ نہ ہوا تو ایک حکیم صاحب کی خدمات حاصل کیں۔ حکیم صاحب نے ان کا بہ غور معائنہ کیا۔ زبان اتنی باہر باہر نکلوائی کہ وہ ہانپنے لگے، مگر اسی اثنا میں حکیم صاحب کی نظر تکیے پر پڑی اور وہ تکیے کی جانب لپکے، شعر کو غور سے پڑھا اور تنک کر بولے:

"اس تکیے کو ابھی یہاں سے ہٹائیے۔ بلڈ پریشر کی اصل جڑ تو تکیہ ہے۔ واہ صاحب وا!

کمال کر دیا آپ نے۔ آپ کو بلڈ پریشر کی شکایت ہے اور آپ نے شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کا شعر تکیے پر طبع کروا رکھا ہے۔ جانتے ہو جوش کی شاعری میں کتنا جوش ہوتا ہے۔ جوش کے شعر پر آپ سو جائیں گے تو دورانِ خون نہیں بڑھے گا تو اور کیا ہو گا؟ اس تکیے کو اسی وقت یہاں سے ہٹا دیجئے۔ خبردار جو آئندہ سے آپ نے جوش کے تکیے پر سر رکھا۔ اگر شعروں پر سونا ایسا ہی ضروری ہے تو داغ کے غلاف پر سو جائیے، جگر کے غلاف کو اپنے سر کے نیچے رکھیے۔ ان شعرا کا کلام آپ کے بلڈ پریشر کو کم کر دے گا۔ آپ کو فرحت ملے گی۔ بھوک زیادہ لگے گی۔ آپ کے جسم میں خون کی مقدار میں اضافہ ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ۔"

حکیم صاحب کے اس مشورے کے بعد ہمارے دوست نے نہ صرف "جوش کا غلاف" بدل دیا بلکہ اب وہ جوش کے کلام کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی خوف محسوس کرتے ہیں کہ کہیں پھر بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق نہ ہو جائے۔

ہم اس دھوبی کے شکر گزار ہیں جو گھاٹ پر کپڑے دھو رہا تھا۔ ہم نے اس دھوبی کو دیکھا کہ وہ ایک کپڑا پانی سے نکالتا ہے، اسے کھولتا ہے، پھر اپنی عینک آنکھوں پر لگاتا ہے۔ کپڑے پر کوئی عبارت پڑھتا ہے اور پھر اس کپڑے کو پتھر پر زور زور سے پٹخنے لگتا ہے۔ ہم نے اس کی اس حرکت کا بہ غور مشاہدہ کیا تو پتا چلا کہ وہ بعض کپڑے تو زور سے پٹختا ہے اور بعض کپڑے نہایت آہستگی اور سلیقے سے دھوتا ہے۔ ہم نے پوچھا، "بھئی، تم بعض کپڑے زور سے پٹختے ہو اور بعض نہایت آہستگی سے۔ آخر یہ کیا راز ہے؟"

وہ بولا، "صاحب! یہ دراصل تکیے کے غلاف ہیں اور میں تکیے کے ہر غلاف کو دھونے سے پہلے اسے کھولتا ہوں اور اس پر لکھا ہوا شعر پڑھتا ہوں۔ اگر شعر مجھے پسند نہ آئے تو اس غلاف کو زور زور سے پتھر پر پٹختا ہوں یعنی ادبی اصطلاح میں ہوٹنگ کرتا ہوں اور اگر اتفاق سے کوئی شعر پسند آئے تو اسے نہایت سلیقے سے دھوتا ہوں کہ اچھا شعر ساری قوم کی امانت ہوتا ہے۔"

ڈاکیا نما شاعر

راجندر سنگھ بیدی، جنھوں نے دو سال تک ڈاک خانہ میں ملازمت کی تھی اور غالباً ڈاک خانے کی اسی ملازمت نے انھیں ادیب بننے پر اُکسایا تھا۔ بھئی جہاں سارے رسالے اور کتابیں

آتی ہوں، وہاں ایک آدمی ادیب نہیں بنے گا تو کیا جوہری بنے گا، مگر ہم ابھی تک اس نتیجے پر نہیں پہنچے ہیں کہ لوگ ادیب بننے کے لیے ڈاک خانے میں ملازم ہوتے ہیں یا ڈاک خانے میں ملازم ہونے کی وجہ سے ادیب بن جاتے ہیں ہمیں تو موخر الذکر بات زیادہ امکانی نظر آتی ہے، کیوں کہ ہم ایک پوسٹ مین کی داستان سے شخصی طور پر واقف ہیں جو پہلے تو صرف رسالے تقسیم کیا کرتے تھے، مگر بعد میں رسالوں کی تقسیم کے ساتھ اپنی غزلیں بھی تقسیم کرنے لگے۔ چناں چہ اب وہ آتے ہیں اور ہمارا خط حوالہ کرنے سے پہلے کہتے ہیں، "اگر آپ کو اپنے خط کی ضرورت ہے تو آپ کو میری ایک تازہ غزل سماعت کرنی ہو گی۔" اور ہمیں اپنا خط حاصل کرنے کے لیے چار و ناچار ان کی غزل سننی پڑتی ہے۔ اگر کبھی ہمارے نام منی آرڈر آجائے تو سمجھیے کہ وہ دن ہمارے لیے روزِ قیامت سے کم نہیں ہوتا، کیوں کہ انھوں نے منی آرڈر کی رقم کے تناسب سے غزلیں سنانے کی شرح مقرر کر رکھی ہے۔ اگر دس رُپے کا منی آرڈر آئے تو پانچ رُپے فی غزل کی شرح سے ہمیں دو غزلیں سُننی پڑتی ہیں۔ ایک بار تو ہمیں تین سو رُپے بہ ذریعہ منی آرڈر ملے تھے اور آپ بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ من جُملہ ۶۰ غزلوں کی سماعت تک ہماری قوّتِ سماعت کا کیا حال ہوا ہو گا۔ ہم صرف اتنا کہہ دیتے ہیں کہ جب ان پوسٹ مین نما شاعر صاحب نے غزلیں ختم کیں تو ہمارے کانوں سے خون بہ رہا تھا اور کئی دِنوں تک ہمارے کانوں میں صرف غزلوں کی گونج سُنائی دیتی رہی۔ اب تو ہم نے ان پوسٹ مین نما شاعر سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنے اعزا و اقربا اور دوست احباب کو لکھا ہے کہ وہ خط نہ لکھا کریں۔ اگر کسی عزیز کے انتقال کی خبر بھی دینی ہو تو اس کی اطلاع ہمارے کسی دوست کو دے دی جائے، کیوں کہ ہمیں اپنے عزیز کا بلا علم و اطلاع مرنا پسند ہے، لیکن پوسٹ مین نما شاعر کی غزلیں سننا پسند نہیں اور کسے معلوم کہ یہی غزلیں ایک دن ہماری موت کا سبب بن جائیں۔

شاعر، انڈے، لاٹھی چارج

علامہ کی سب سے بڑی خوبی، جو دراصل ایک خرابی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ شاعری کرتے تھے، لیکن مرحوم کی قوّتِ ارادی کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے مرتے دم تک شاعری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور نزع کے عالم میں بھی تیمار داروں کو اپنی نامکمل غزل کا مقطع سُنا

کر مر گئے۔ اسے علامہ کی فرض شناسی نہ کہیں تو کیا کہیں کہ انھوں نے اپنی ایک غزل بھی نامکمل نہ چھوڑی۔ علامہ نے ۸۰ برس کی عمر پائی اور انھوں نے ۸ ہزار غزلیں کہیں، جن پر ۸ لاکھ افراد نے ہوٹنگ کی، مگر مرحوم ایسے حوصلہ مند، نڈر اور جری انسان واقع ہوئے تھے کہ اگر ۸ کروڑ افراد نے بھی ہوٹنگ کی ہوتی تو وہ ٹس سے مس نہ ہوتے۔ بات دراصل یہ تھی کہ علامہ بڑے ظریف الطبع واقع ہوئے تھے اور ہر سنجیدہ بات کو مذاق میں ٹال جاتے تھے۔ مثلاً ایک مشاعرے میں جب سامعین نے ان پر انڈے پھینکے تو انھوں نے سارے انڈے ہاتھوں میں جھیل لیے اور گھر جا کر ان انڈوں کی پڈنگ پکوائی۔ پھر جب دوسری بار مشاعرے میں شرکت کرنے گئے اور لوگوں نے ان پر انڈے نہ پھینکے تو علامہ بپھر گئے اور سامعین سے شکایت کرنے لگے، "حضرات! اگر آپ لوگوں نے انڈے نہ پھینکے تو میں غزل نہیں سناؤں گا۔" اس پر منتظمین مشاعرہ نے فوراً بازار سے انڈے منگوائے اور جب دو چار انڈے پھینکے گئے تو علامہ نے غزل کا سلسلہ شروع کیا، جو صبح تک جاری رہا۔ اس کے بعد علامہ نے ایک معمول سا بنا لیا کہ جب بھی کسی مشاعرے میں جاتے تو لوگوں سے کہتے کہ آج مجھ پر آلو پھینکے جائیں،

کیوں کہ آج آلو کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔"

علامہ کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ انھیں اپنا کلام سنانے کا عارضہ لاحق تھا۔ اگر کوئی نئی غزل ہوتی (جو اتفاق سے ہر روز ہو جایا کرتی تھی) تو سارے محلّے کو سنانے کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب علامہ گھر سے نکلتے تو سڑکوں پر بھگدڑ مچ جاتی اور لوگ گلیوں میں بھاگ جاتے۔ دُکان دار اپنی دُکانیں بند کر دیتے اور مائیں اپنے بچّوں کو اُٹھا کر سینے سے چمٹا لیتیں۔ غرض دیکھتے ہی دیکھتے سڑک ویران ہو جایا کرتی تھی مگر علامہ کا یہ عارضہ اکثر اوقات ملک و قوم کے لیے بڑا کارگر ثابت ہوتا تھا، مثلاً ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مقامی کالج کے طلبہ نے ہڑتال کی اور جلوس نکالا۔ ایک مقام پر جلوس مشتعل ہو گیا اور پولیس پر سنگ باری کرنے لگا۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا، مگر جلوس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ جب صورتِ حال بہت نازک ہو گئی تو سب انسپکٹر پولیس کے ذہن میں اچانک ایک ترکیب آئی۔ وہ سیدھا علامہ کے گھر بھاگا اور انھیں اپنے ساتھ لے آیا۔ اِدھر طلبہ کی سنگ باری بہ دستور جاری تھی کہ اچانک مائیکروفون پر اعلان ہوا:

"خواتین و حضرات! اب آپ علامہ نارسا سے ان کی تازہ غزل سماعت فرمائیے۔"

مائیکروفون پر یہ اعلان ہونا تھا کہ طلبہ اپنے سر پر پاؤں اور پاؤں پر سر رکھ کر بھاگنے لگے۔ اور ابھی علامہ نے اپنی غزل کا مطلع ہی سنایا تھا کہ مطلع صاف ہو گیا۔ طلبہ تو طلبہ پولیس کی ساری جمعیت بہ شمول سب انسپکٹر پولیس مقامِ حادثہ سے غائب تھی۔

علامہ نے زندگی بھر میں ایک شعر بھی ایسا نہیں کہا جو بحر سے خارج نہ ہو۔ ہر مصرعہ دوسرے مصرعہ سے ایک ہاتھ چھوٹا ہوتا تھا یا بڑا اور جب لوگ اس کی شکایت کرتے کہ غزل کے سارے مصرعے بحر سے خارج ہیں تو وہ اس کے جواب میں یہ دلیل پیش کرتے کہ "میاں، جب انسان کے ایک ہاتھ کی پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں تو ایک غزل کے دس مصرعے کس طرح برابر ہو سکتے ہیں۔ قدرت کی تخلیق خود بحر سے خارج ہے۔ خدا نے سب کو یکساں پیدا نہیں کیا۔"

دھوبی

کسی منچلے نے دھوبی کی تعریف یوں کی ہے کہ "دھوبی وہ شخص ہوتا ہے جو کپڑے کی مدد سے

پتھر کو توڑنا چاہتا ہے۔ چناں چہ جب بھی میرے کپڑے دُھل کر آتے ہیں تو یہ گمان گزرتا ہے کہ ضرور دھوبی نے میرے کپڑوں کی مدد سے کئی پتھر توڑ ڈالے ہیں۔ تب ہی تو نئے قمیض کے کالر منھ پھاڑے دیتے ہیں اور پتلون کے پائنچے جھالر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ میرے ایک پاجامے کے ساتھ تو میرے دھوبی نے بڑا بُرا سلوک کیا تھا، یعنی جب میں نے پاجامے کا بہ غور جائزہ لیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس پاجامے میں دو پائنچوں کی بجائے صرف ایک پائنچہ موجود ہے۔ میں نے پوچھا، "بھائی، میرے پاجامے میں ہمیشہ دو پائنچے ہوا کرتے تھے، اب صرف ایک پائنچہ کیوں رہ گیا ہے؟"

وہ بولا، "حضور، فکر نہ کیجیے۔ اگلی بار آپ کو دوسرا پائنچہ بھی مل جائے گا۔" لیکن آج تک مجھے دوسرا پائنچہ نہ مل سکا۔ پھر دھوبی کے ہاں سے کپڑے بھی بڑی مشکل سے آتے ہیں۔ اس کے لیے باضابطہ بیرویاں کرنی پڑتی ہیں۔ تب کہیں دھوبی اپنے گدھے کے ساتھ آپ کے در غربت پر نمودار ہوتا ہے۔ پھر کپڑوں کے دیر سے دھونے کے ہزاروں بہانے دھوبی نے تراش رکھے ہیں۔ برسات کا موسم ہو تو کہتا ہے کہ بارش بہت ہو رہی ہے۔ گرمی کا موسم ہو تو کہتا ہے کہ حضور گھاٹ پر پانی نہیں ہے۔ ایک بار تو اس نے سردی کے موسم میں دیر سے کپڑے لانے کی وجہ یوں بیان کی کہ "صاحب، آپ نے اس بار گرم کپڑے دھونے کے لیے نہیں دیے۔ اس لیے میں انھیں وقت پر نہ دھو سکا۔"

میں نے پوچھا، "کپڑوں کے دیر سے دُھلنے کا گرم کپڑوں سے کیا تعلق ہے؟"

وہ بولا، "صاحب، سردی بہت ہے۔ جب تک کوئی گرم کپڑا نہ پہن لوں اس وقت تک کپڑے نہیں دھو سکتا، لہٰذا آپ آئندہ سے اس بات کا خیال رکھیں کہ سردی میں جب بھی کپڑے دھونے کے لیے دیں اُن میں گرم کپڑے ضرور شامل ہوں، ورنہ آپ کو کپڑے جلدی نہیں ملیں گے۔"

کھانا، کپڑا، مکان اور غالب

ایک صاحب سے پوچھا گیا کہ قبلہ، ضروریاتِ زندگی میں کون کون سی اشیا شامل ہوتی ہیں؟ انھوں نے کہا، "کھانا، کپڑا، مکان، غالب اور دیوانِ غالب!" صاف ظاہر ہے کہ یہ صاحب غالب کے طرف دار تھے اور اس حد تک طرف دار تھے کہ خود غالب کی ذات کو "دیوانِ غالب" سے جُدا

کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔

پھر ہم نے دیکھا کہ ان صاحب نے غالب سے اپنی طرف داری جتانے کے لیے "کلیاتِ میر" پر بھی دیوانِ غالب کا ٹائیٹل چڑھا رکھا ہے اور محض ٹائیٹل کے دھوکے میں میر کے کلام کو بھی غالب کا کلام سمجھتے ہیں اور اس سلسلے میں قطع کلام کرنے کا کوئی موقع عنایت نہیں کرتے، کیوں کہ ان صاحب کی نظر میں اردو شاعری نے صرف ایک ہی شاعر پیدا کیا ہے اور وہ ہے غالب۔ ان سے ایک بار پوچھا گیا کہ جناب دالا، اردو کے تین بڑے شعرا کے نام تو بتائیے؟ موصوف نے کہا، "غالب، مرزا غالب اور مرزا اسد اللہ خاں غالب"۔ اس پر ہم نے یہ فرض کرتے ہوئے کہ آگے ان کی دال نہ گلے گی، پوچھا کہ اب لگے ہاتھوں چوتھے بڑے شاعر کا نام بھی بتائیے"۔ تو کہنے لگے، "نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب"۔ غرض کہ غالب سے ان کا تعلق خاطر بھی "غبارِ خاطر" سے کچھ کم نہیں۔

انھی صاحب کا ذکر ہے کہ ایک بار وہ "کلیاتِ میر" میں سے جس پر "دیوانِ غالب" کا ٹائیٹل چڑھا ہوا تھا اپنے تئیں غالب کا کلام پڑھ رہے تھے کہ اچانک کسی شعر پر پھڑک اُٹھے اور کہنے لگے، "واہ سبحان اللہ، کیا شعر کہا ہے غالب نے"۔ ہم نے کہا، "ہم بھی تو سُنیں کون سا شعر ہے؟ فرمانے لگے:

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اس شعر کو سنتے ہی ہماری رگِ ظرافت پھڑک اُٹھی اور ہم نے پہلے تو ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ٹٹول کر ان کی دکھتی رگ پکڑ لی اور کہا، "جناب، یہ شعر غالب کا نہیں میر کا ہے"۔ یہ سُنتے ہی انھوں نے اپنی دکھتی رگ ہمارے ہاتھ سے چھڑا لی اور تنک کر بولے، "بالکل غلط، یہ شعر کسی طرح بھی میر کا نہیں ہو سکتا، کیوں کہ میر صاحب تو روتے روتے سو گئے ہیں۔ بھلا سوتے سوتے وہ کس طرح شعر کہہ سکتے ہیں۔ یہ شعر غالب کا ہے اور ۹۹ فی صد غالب کا ہے"۔

چار کیلو غزلیں

اِدھر جب سے دنیا تجارت کے چنگل میں پھنس گئی ہے اس وقت سے ہر شے ترازو میں

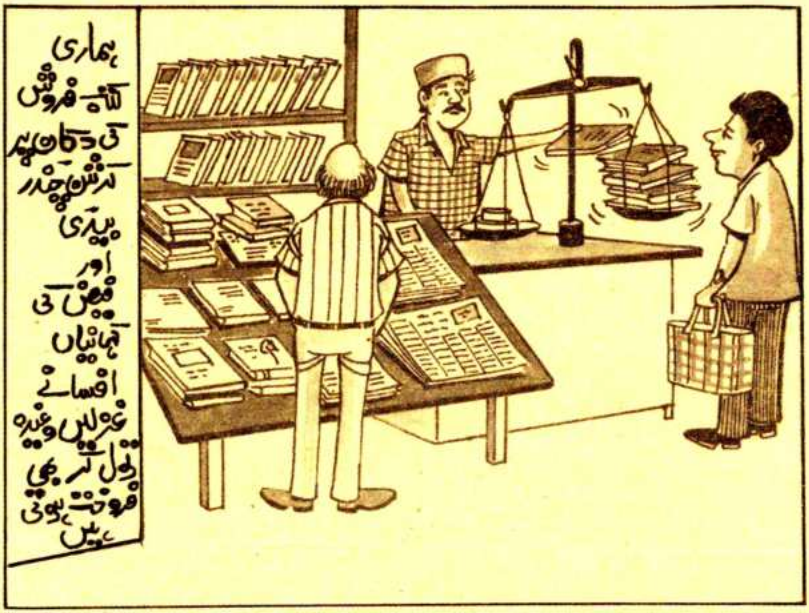

تُلنے اور تجارت کے سانچے میں ڈھلنے لگی ہے۔ ہمیں اس نوجوان کی بات اب بھی یاد ہے، جس نے ایک کتب فروش کی دُکان پر کھڑے ہو کر کتب فروش سے کہا تھا:

"جناب والا، مجھے کرشن چندر کے دو کیلو افسانے، راجندر سنگھ بیدی کی ڈیڑھ کیلو کہانیاں اور فیض کی چار کیلو غزلیں دیجیے۔"

اس پر کتب فروش نے ہماری آنکھوں کے سامنے کرشن چندر اور بیدی کی کہانیوں کے مجموعے ترازو میں تول کر دیے اور فیض کی غزلوں کے بارے میں فرمایا، "حضور والا، میں آپ کو فیض احمد فیض کی چار کیلو غزلیں دینے کے موقف میں نہیں ہوں، کیوں کہ فیض کا سارا ادبی سرمایہ صرف دو کیلو غزلوں پر مشتمل ہے۔ یقین نہ آئے تو "دستِ صبا، نقشِ فریادی اور زندان نامہ" کو تول کر دیکھ لیجیے۔"

UNION INTRODUCES ANOTHER QUALITY PRODUCT

TOFFEES
REAL CHEWY CANDY

UNION The Biggest name in wholesome taste

Midas Khi

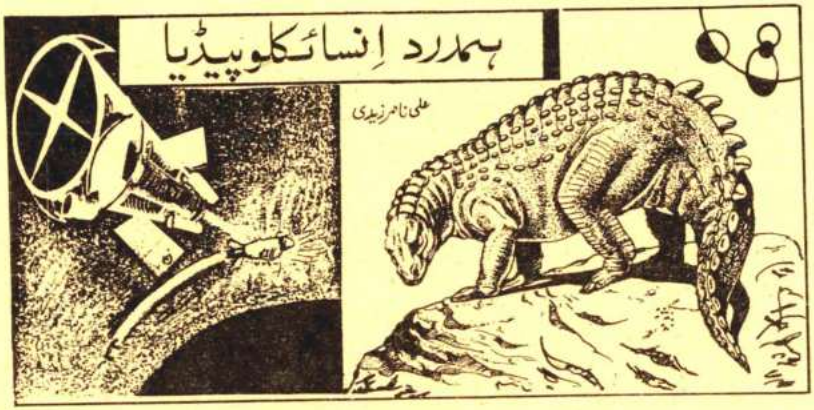

س: انسان کے جسم میں وہ کون سا عضو ہے جو ہوا نہ ملنے کے باعث کام چھوڑ دیتا ہے اور انسان کو تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ محمد اجمل، خانیلہ

ج: ہماری زندگی کا دارومدار سانس لینے اور ہوا پر ہے۔ ہم کھائے پیے بغیر تو کچھ دن زندہ رہ سکتے ہیں، لیکن ہوا یا اوکسی جن کے بغیر چند منٹ بھی نہیں جی سکتے۔ وہ عضو جو ہوا کو براہِ راست قبول کرتا ہے ہمارے پھیپڑے ہیں۔ وہ ہوا کے بغیر کام نہیں کر سکتے۔

س: انسان کو جماہی کس طرح آتی ہے اور کیوں آتی ہے؟ منیر حسین منگی، لاڑکانہ

ج: ہمیں زندہ رہنے کے لیے ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہوا کی کمی سستی کا باعث بنتی ہے۔ قدرت نے یہ نظام رکھا ہے کہ جب کبھی ہمارے جسم میں کم ہوا یا اوکسی جن جائے تو خود بخود ہمارا منھ کھل جاتا ہے اور ہم ایک ساتھ بہت سی ہوا اندر لے جاتے ہیں۔ یہ جماہی ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ سستی یا غنودگی کے وقت ہی جماہیاں آتی ہیں۔ اور جماہی لینے کے بعد ہمیں قدرے سکون ملتا ہے۔

س: ٹیلے فون سے آواز کس طرح دوسری جگہ پہنچ جاتی ہے؟

محمد ارشد قریشی، ٹنڈو جام

ج: یاد رکھیے ٹیلے فون میں آپ کی آواز تاروں پر کبھی سفر نہیں کرتی، بلکہ جب آپ بولتے ہیں

تو آپ کی آواز برقی ارتعاشات میں تبدیل ہو جاتی ہے اور آپ کی آواز کے مطابق یہ ارتعاشات یا لہریں تاروں پر ہوتی ہوئی دوسری جگہ پہنچ جاتی ہیں جہاں کان پر لگا ہوا آلہ انھیں پھر آواز کی لہروں میں تبدیل کر دیتا ہے اور یوں آپ وہی آواز، وہی الفاظ، وہی زبان سُن لیتے ہیں۔

س: کہتے ہیں سمندر کی لہریں چاند کے اثر سے پیدا ہوتی ہیں، مگر یہ عمل کس طرح واقع ہوتا ہے؟
رابعہ صدیقی، نواب شاہ

ج: سمندر پر عام طور سے جو لہریں اُٹھتی ہیں اُن میں چاند کا کوئی دخل نہیں ہوتا، البتہ چاندنی راتوں میں جو لہریں بلند ہوتی ہیں اور ساحل پر چڑھ آتی ہیں اور جنھیں مدوجزر یا جوار بھاٹا کہتے ہیں وہ چاند کی کشش سے پیدا ہوتی ہیں۔ چاند ہماری زمین کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہے اور ہم سے کوئی ڈھائی لاکھ میل دُور ہے۔ زمین اپنی کشش سے اُسے اپنے چاروں طرف گھماتی رہتی ہے، لیکن جس طرح زمین کی کشش چاند پر پڑتی ہے، اُسی طرح چاند بھی زمین پر اپنی کشش ڈالتا ہے۔ خشکی پر تو اس کشش کا کوئی اثر نہیں ہوتا، البتہ پانی کھنچ جاتا ہے جسے ہم جوار بھاٹا کہتے ہیں۔

س: زمین خلا میں ہے اور زمین پر تہائی سے زیادہ پانی ہے تو پھر پانی نیچے کیوں نہیں گرتا؟
شازیہ کنول، نواب شاہ

ج: زمین بہت بڑی ہے۔ اسی لحاظ سے اس کی کشش بھی زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چیز زمین کی طرف گرتی ہے۔ خلا میں دُور دُور کوئی دوسرا جسم اتنا بڑا نہیں ہے کہ اُس کی کشش ہمارے سمندروں کے پانی کو کھینچ لے۔ چاند کی وجہ سے لہریں کچھ اُونچائی تک اُٹھتی ہیں، لیکن پھر گر جاتی ہیں۔ زمین اپنی زبردست کشش سے سمندروں کے پانی کو اپنے ساتھ لگائے رکھتی ہے۔ کہیں جانے نہیں دیتی۔

س: پورے ملک میں اتنی بجلی کہاں سے آتی ہے اور کس طرح پیدا کی جاتی ہے؟
عبدالقیوم، قاضی احمد، نواب شاہ

ج : بجلی کو بہت دُور پہنچانے میں نقصان ہوتا ہے، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ بجلی جہاں استعمال ہو رہی ہو، پیدا بھی اُس کے قریب ہی کہیں ہو رہی ہو۔ ہمارے ملک میں جا بجا بجلی گھر لگے ہوئے ہیں، جن میں ایک مشین ہوتی ہے جسے ٹربائن کہتے ہیں۔ اُسے آبشار یا اونچائی سے گرتے ہوئے پانی سے گھمایا جاتا ہے۔ ٹربائن کے گھومنے سے تاروں کا بہت بڑا لچھا، یعنی آرمیچر مقناطیس کے قُطبین کے درمیان گھومتا ہے اور یوں قدرتی طور پر بجلی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہیں کہیں سوئی گیس سے پانی گرم کر کے اور بھاپ پیدا کر کے اُس سے ٹربائن کو گھمایا جاتا ہے۔ یہ اسٹیم ٹربائن ہوتی ہے، لیکن بجلی پیدا کرنے کا سب سے ارزاں ذریعہ گرتا ہوا پانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بجلی اُن پہاڑی ملکوں میں وافر اور سستی ہے جہاں آبشاروں کی افراط ہے، مثلاً ناروے اور سوئیڈن وغیرہ۔

س : سورج صبح اور شام کو دوپہر کی بہ نسبت بڑا کیوں نظر آتا ہے۔ ذرا وضاحت سے بتایئے۔
محمد رمضان طاہر، بہاول پور

ج : صبح اور شام کو سورج کی کرنیں ٹیڑھی آتی ہیں۔ وہ ہماری آنکھ پر نسبتاً بڑا زاویہ بناتی ہیں اس لیے سورج صبح و شام کے وقت نسبتاً زیادہ بڑا نظر آتا ہے۔

س : پودے سورج کی روشنی میں کس طرح اپنی خوراک تیار کر لیتے ہیں؟
عاشق حسین شہزاد، کمالیہ

ج : دھوپ تمام جان داروں کے لیے ضروری ہے۔ پودے اپنی جڑوں کے ذریعہ سے مٹی سے پانی اور غذا حاصل کرتے ہیں۔ اس غذا کو پودے کے لیے کارآمد بنانے کے لیے دھوپ ضروری ہے۔ پودے اپنے پتّوں کے ذریعہ سے دھوپ جذب کر کے نشوونما پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو پودے کمروں کے اندر رکھے ہوتے ہیں وہ اچھی طرح نہیں بڑھتے۔

س : سولر جنریٹر (SOLAR GENERATOR) کیا ہوتا ہے؟ محمد محبوب الرحمان، کراچی
ج : وہ مشین جو دُھوپ کی مدد سے بجلی پیدا کرے سولر جنریٹر کہلا سکتی ہے۔ دھوپ کو

شیشوں کے ذریعہ سے ایک جگہ جمع کر کے اُس سے پانی کھولایا جاتا ہے اور بھاپ سے جنریٹر چلا کر بجلی پیدا کر لی جاتی ہے۔ اس انتظام کو ہم سولر جنریٹر کہہ سکتے ہیں۔

س: جب روٹی کو چولھے پر سینکتے ہیں تو اُس میں گرم گیس بھر جاتی ہے، جب کہ روٹی تمام اطراف سے بند ہوتی ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ روٹی میں گرم گیس کس طرح بھر جاتی ہے؟

محمد حفیظ انجم، مظفر گڑھ

ج: روٹی کو جب توے پر ڈالا جاتا ہے تو اُس کا آٹا گیلا ہوتا ہے اور اُس میں نمی موجود ہوتی ہے۔ جلد ہی اُسے پلٹ دیا جاتا ہے۔ اب بھی اُس میں پانی کی نمی باقی ہوتی ہے۔ جب اُسے چولھے کے اندر یا توے پر لٹکا کر سینکا جاتا ہے تو یہ نمی باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس سے روٹی پھول جاتی ہے اور خشک ہو جاتی ہے۔

س: کہا جاتا ہے کہ مچھلی کھانے کے بعد دودھ نہیں پینا چاہیے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

عاصمہ اعجاز، کراچی

ج: ہم نے بھی آپ کی طرح یہ سُنا ہے کہ مچھلی کھانے کے بعد دودھ پی لینے سے جسم پر سفید داغ پڑ جانے کا خطرہ رہتا ہے، لیکن اس بات کا کوئی سائنسی ثبوت نہیں ہے، البتہ تجربہ یہ ہے کہ بعض قسم کی مچھلی ایسی ہوتی ہے کہ اس کے بعد دودھ استعمال کیا جائے تو نقصان ہو جاتا ہے، اس لیے احتیاط کر لینا اچھا ہے۔ کوئی ضروری ہے کہ آپ مچھلی کھا کر دودھ پئیں، نہ پیجیے۔

س: کاربن کیا ہے اور کس طرح بنتا ہے؟ ام کلثوم گوندل، ملتان

ج: کاربن کوئلا ہوتا ہے اور زمین میں قدرتی طور پر اب سے لاکھوں سال پہلے بنا۔ اس وقت زمین پر کسی قسم کی آبادی نہیں تھی اور زبردست طوفان آتے تھے۔ بڑے بڑے درخت زمین کے نیچے دب کر رہ گئے اور مٹی کے دباؤ سے کاربن میں تبدیل ہو کر رہ گئے۔ یہی وہ کوئلا ہے جسے نکال نکال کر ہم استعمال کر رہے ہیں۔ کاربن بجلی کا اچھا موصل ہوتا ہے۔ اس کی سلاخیں مختلف کاموں کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔

برسات کا سماں

سلیم فاروقی

لو آگیا ہے یارو! برسات کا زمانا پھر تن گیا فلک پر بادل کا شامیانا
ہے بچّوں، بچّیوں کی خوشیوں کا کیا ٹھکانا اب خوب کھیلنے کا ہاتھ آ گیا بہانا

مغرب سے دیکھیے وہ کالی گھٹا اُٹھی ہے
اب روشنی فضا کی مدّھم سی ہو رہی ہے

کیا کیا مزے کے گھر میں پکوان پک رہے ہیں بچّوں کے بھولے بھالے چہرے دمک رہے ہیں
گودی میں تاجور کی اَجّو ہمک رہے ہیں تازہ کچوریوں پر کیسے لپک رہے ہیں

آموں کا ڈھیر دیکھو! للچا رہا ہے سب کو
آموں کو دیکھ کر ہی لطف آ رہا ہے سب کو

ٹھنڈی ہوائیں سب کے دل کو لبھا رہی ہیں سکھیاں سہیلیاں سب ملہار گا رہی ہیں
شاخوں پہ ننھی چڑیاں خوشیاں منا رہی ہیں کچھ گیت گا رہی ہیں، کچھ چہچہا رہی ہیں

کالی گھٹا نے آکر رِم جھم کا راگ چھیڑا
اب ختم ہو چکا ہے گرمی کا سب بکھیڑا

سوکھی زمیں نے پائی پانی سے شادمانی کس جوش پر ہے دیکھو دریاؤں کی روانی
وہ ندیاں کہ جن میں ٹخنوں تلک تھا پانی اب بن گئی ہیں وہ بھی پانی کی راج دھانی

دریاؤں کے کنارے میلے لگے ہوئے ہیں
خوشیوں بھرے سمندر گویا اُمڈ رہے ہیں

اس رُت کا آؤ ہم بھی کچھ لطف تو اُٹھائیں باغوں کی سیر کر لیں، کھیتوں میں گھوم آئیں
ندی کا رنگ دیکھیں، دریا میں پھر نہائیں چیزیں مزے کی کھائیں پھر مل کے گنگنائیں

لو آگیا ہے یارو! برسات کا زمانا
پھر تن گیا فلک پر بادل کا شامیانا

مفید گھریلو ٹوٹکے

رشید الدین احمد

* اکثر اوقات بخار کے بعد منہ آجاتا ہے جس کی وجہ سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ گرم اور نمکین غذائیں بُری لگتی ہیں۔ ہونٹ اور منہ پک سے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ایک پیالی پانی میں چائے کا نصف چمچہ کھانے کا سوڈا (سوڈیم بائی کاربونیٹ) گھول کر کُلیاں کرنے سے بہت جلد آرام ہو جاتا ہے۔ یہ عمل دن میں ۲۔۳ بار کیا جا سکتا ہے۔

* ہم اپنی غذا سے ریشے خاص طور پر بھوسی کو بڑی تیزی سے خارج کر رہے ہیں۔ شہروں میں سفید آٹے کی روٹی کا رواج بڑھ رہا ہے۔ اس کی وجہ سے نت نئی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ آٹے کی بھوسی پیٹ کے لیے بے حد مفید ہوتی ہے اور قبض کی صورت میں آنتوں کے عمل کو تیز کر دیتی ہے، جس سے قبض کی شکایت دُور ہو جاتی ہے۔ عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ بے چھنے آٹے کی روٹی کھائی جائے۔

* اگر آپ کے کان میں کوئی کیڑا یا بھنگا چلا جائے تو کان کا رُخ تیز روشنی کی طرف کر دیجیے۔ اکثر صورتوں میں کیڑا تیز روشنی کی طرف لپکتا ہے۔ وہ اس طرح آپ کا کان چھوڑ دے گا، بشرطے کہ وہ کان کے میل سے نہ چپک گیا ہو۔ ایسی صورت میں معالج سے مدد لیجیے۔

* اگر چیچڑی آپ کی جلد سے چمٹ گئی ہو تو اُسے کھینچ کر نکالنے کی کوشش نہ کیجیے۔ اس سے نجات کی بہترین صورت یہ ہے کہ اس پر ناخنوں کی پالش یا ویزلین اچھی طرح لگا دیں۔ چیچڑی تھوڑی دیر بعد چھوٹ جائے گی۔

* آپ کو اگر کسی کیڑے نے کاٹا ہو یا کسی زہریلے درخت کے رگڑے جانے سے جلد میں تکلیف ہو تو متاثرہ جگہ کو قابلِ برداشت گرم پانی سے دھاریے یا گرم پانی میں بھگویا ہوا کپڑا رکھیے۔ اس عمل سے بہت جلد آرام آجائے گا۔

* نہانے یا تیرنے کے دوران اکثر اوقات کان میں پانی چلا جاتا ہے، جس سے کان میں درد ہوتا ہے۔ بعض اوقات کان کا اندرونی حصّہ سُوج بھی جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی تدبیر تو

یہ کیجیے کہ کسی صاف سُتھرے کپڑے یا روئی وغیرہ سے کان کو خشک کر لیجیے، پھر صاف اُبلے ہوئے ٹھنڈے آدھی پیالی پانی میں ۳۰ قطرے سفید سرکے شامل کر کے کان میں دو بوند بس ڈالیے۔

* آپ نے اکثر محسوس کیا ہو گا کہ آپ آنکھ میں دوا ٹھیک طور پر نہیں ڈالتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں دوا کے قطرے آنکھ کے بجائے گال اور پپوٹوں پر ٹپک جاتے ہیں۔ اس کی ایک بہترین صورت یہ ہے کہ آنکھ کی دوا کو ریفریجریٹر میں رکھا جائے۔ ٹھنڈے قطرے خود بتا دیں گے کہ آپ نے دوا ٹھیک طور پر ڈالی ہے یا نہیں۔

* اکثر لوگ شکایت کرتے ہیں کہ گولیاں اور کیپسول وغیرہ کے نگلنے میں انھیں تکلیف ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کھانے کی نالی میں گولی پھنس بھی جاتی ہے۔ اس سے بچنے کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ گولیاں اور کیپسول وغیرہ کھڑے ہو کر کھائے جائیں اور اوپر سے نصف پیالی پانی پی لیا جائے۔ انھیں نگلنے کے بعد تقریباً ڈیڑھ منٹ تک کھڑے رہیں۔ اس عرصے میں وہ معدے میں اُتر جائیں گی۔ لیٹنے یا بیٹھنے کی صورت میں ان کے غذا کی نالی میں پھنس جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

* اگر آپ کے دانت میں درد ہو تو اوّلین تدبیر یہ ہے کہ دانت کو صاف کر لیا جائے۔ غذا کے ذرّات دانتوں کے درمیان پھنس کر درد پیدا کرتے ہیں۔ کسی مضبوط دھاگے سے دانت صاف کر کے نیم گرم پانی سے اچھی طرح کُلّی کر لیں۔ اکثر صورتوں میں صرف اسی تدبیر سے فائدہ ہو جاتا ہے۔

* اکثر لوگ ہوائی، سمندری اور کار اور بس کے سفر میں چکّر اور متلی کی شکایت کرتے ہیں۔ اس سے بچنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ آپ باہر کی طرف نہ دیکھیں۔ اگر دیکھنا بھی ہو تو دُور دیکھیں۔ اس کے علاوہ سفر کے آغاز پر سونٹھ کا سفوف دو تین چٹکی پھانک لیں۔ امریکا اور برطانیہ وغیرہ میں یہ سفوف کیپسول میں بھی ملتا ہے۔ ان ملکوں کے ماہرین کے مطابق یہ قدرتی دوا تمام ڈاکٹری دواؤں سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔

* کام کے دوران بیٹھ کے درد سے بچنے کے لیے اپنی کمر بالکل سیدھی رکھیے اور اپنی میز وغیرہ پر مت جُھکیے۔

* گلے کی خراش ایک خاصی عام شکایت ہے۔ اکثر لوگ اس کا علاج کھانسی کی گولیوں سے کرتے ہیں۔ پالتو جانور بھی اس کا ایک اہم سبب ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ کے گھر میں کتّے، بلّی یا پرندے پلے ہوں اور گھر والوں کو گلے کی خرابی کی شکایت رہتی ہو تو اپنے جانوروں کا معائنہ معالجِ حیوانات سے ضرور

کروائیے۔ تازہ تحقیق کے مطابق ایسے گھروں میں گلے کی تکلیف کی چالیس فی صد وجہ پالتو جانور ہوتے ہیں۔ ان کا گلا ٹھیک رہے گا تو گھر والے بھی ٹھیک رہیں گے۔

* لائی سین (LYSINE) ایک عام غذائی جُز ہے۔ یہ ایک اہم امینو ایسڈ ہے، جسم کی تعمیر میں یہ بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی کمی سے چکّر کے علاوہ خون کی کمی کی شکایت ہوتی ہے۔ یہ اہم غذائی جُز منھ کے آبلوں کا بہترین علاج ہے۔ ماہرین کے مطابق اسے روزانہ ۳۰۰ سے ۱۲۰۰ ملی گرام کی مقدار میں استعمال کرنے سے نملہ (HERPES) کو فائدہ ہوتا ہے اور بخار کی وجہ سے منھ پک جانے کی شکایت بھی دُور ہو جاتی ہے۔ یہ ان امراض کی دوا نہیں ہے بلکہ یہ صرف ان کے جراثیم کا زور توڑ دیتا ہے۔ پاکستان میں یہ شربت اور گولیوں کی صورت میں مل جاتا ہے۔

* موچ اور چوٹ کی صورت میں زیادہ بہتر علاج یہ ہے کہ متاثرہ مقام کی پہلے ٹھنڈے پانی یا برف وغیرہ سے ٹکور کی جائے۔ اس کے بعد اس کی سِنکائی کی جاسکتی ہے۔ اس عمل سے درد اور ورم کم ہو جاتا ہے۔ متاثرہ حصّے کے پٹھے ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور درد کی ٹیس کم ہو جاتی ہے۔

* چوٹ کے مقام کو سینکنے سے درد دُور ہو جاتا ہے، چوں کہ اس حصّے میں حرارت کی وجہ سے دورانِ خون تیز ہو جاتا ہے، اس لیے جسم کی ٹوٹی پھوٹی بافتیں زیادہ تیزی سے جُڑ جاتی ہیں، مگر چوٹ لگنے کے فوری بعد سینکنا نہیں چاہیے۔ ایسی صورت میں ورم اور خون بہنے میں اضافے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

* اگر آپ کی جِلد دھوپ سے جھلس گئی ہو اور آپ درد بھی محسوس کر رہے ہوں تو اس سے نجات کے لیے متاثرہ مقام پر چھے گھنٹے تک برف کے پانی کی گدّیاں رکھنی چاہییں۔ درد سے نجات کے لیے آپ دوا بھی کھا سکتے ہیں۔

* اگر آپ بے خوابی کا شکار ہوں تو اس سے نجات کی ایک مفید اور بہترین صورت یہ ہے کہ اپنی غذا میں نمک کی مقدار گھٹا دیجیے۔ زیادہ نمک بے خوابی کا باعث ہوتا ہے۔

* ہچکی کا ایک علاج یہ بھی ہے کہ تھوڑی پسی ہوئی سیاہ مرچ ناک میں چڑھا کر چھینکا جائے۔ چھینک سے ہچکی رُک جائے گی۔

* اگر آپ اپنے اعصاب کو کھنچا ہوا محسوس کر رہے ہوں تو کھلی ہوا میں کھڑے ہو کر اپنے کاندھوں کو اوپر اُٹھائیے اور چار پانچ گہرے سانس لے کر کاندھوں کو نیچے گرا دیجیے۔ اس سے آپ کے کاندھوں، گردن اور سر کے اعصاب کو بڑا سکون ملے گا۔

عجیب و غریب اتفاقات

طاہر جاوید، کراچی

مگر بچ نہ سکا

۳۰۔ جون ۱۹۷۶ء کو ایک ۵۹ سالہ شخص کریک مُور اپنی کار میں گھر جا رہا تھا۔ سبز بائی وے پر اس کی کار کا ٹائی راڈ ٹوٹ گیا۔ کار بے قابو ہو کر ٹیلے فون کے کھمبے سے جا ٹکرائی۔ کریک مُور کو حیرت انگیز طور پر کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ چند لمحوں بعد وہ اپنی پچکی ہوئی کار کے قریب کھڑا ہوا ٹریفک پولیس کو حادثے کی تفصیلات بتا رہا تھا کہ اچانک وہی کھمبا ایک دھماکے سے اس پر آگرا اور کریک مُور کی موت واقع ہو گئی۔

بجلی کے وار

۱۹۱۸ء کا ذکر ہے کہ بیلجیم کے شہر فلینڈر میں سمر فورڈ نامی ایک شخص پر بجلی گری اور وہ فوجی ملازمت کے قابل نہ رہا۔ اس واقعے کے چھے سال بعد سمر فورڈ وانکور کے مقام پر مچھلی کا شکار کھیل رہا تھا۔ یہاں پر ایک بار پھر بجلی گری اور اس بار اس کا دایاں حصّہ مفلوج ہو گیا۔ پورے دو سال تک علاج ہوتا رہا۔ طویل مدت تک علاج کے بعد وہ تھوڑی بہت چہل قدمی کے قابل ہو گیا، مگر پہلے ہی روز جب وہ باہر نکلا تو اس پر پھر بجلی گری۔ اب کے سمر فورڈ بری طرح بیمار پڑا اور دو سال تک علاج کرانے کے باوجود انتقال کر گیا۔ ۱۹۳۴ء کی ایک طوفانی رات کا واقعہ ہے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اچانک بجلی کڑکی اور زبردست جھماکے کے ساتھ ایک قبر پر گری۔ یقین کریں وہ قبر بھی میجر فورڈ کی تھی۔

بے وفائی کا انجام

چیکوسلاواکیہ کے شہر پراگ کی ایک عورت ویرا زرمیک کو معلوم ہوا کہ اس کا شوہر اس

سے بے وفائی کر رہا ہے۔ ویرا کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ بجھی بجھی رہنے لگی۔ ایک روز انتہائی مایوسی میں اپنے مکان کی تیسری منزل سے چھلانگ لگادی۔ اس کا شوہر جھل قدمی کے بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ ویرا کا بھاری بھرکم جسم اس کے اوپر گرا۔ ویرا کے تو چند معمولی چوٹیں آئیں، لیکن اس کا شوہر فوراً مر گیا۔

ایک تیر دو شکار

لاس اینجلز کی ۱۹ سالہ شیرون اپنے دوست ڈیوڈ سے گفت گو کر رہی تھی۔ ڈیوڈ بہت اداس تھا۔ باتیں کرتے کرتے اس نے یکایک اپنا ریوالور نکال لیا اور اس سے پیش تر کہ شیرون کچھ سمجھ پاتی ڈیوڈ نے ریوالور اپنی کنپٹی سے لگا کر ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی ڈیوڈ کا بھیجا پھاڑتی ہوئی قریبی واٹر ہیٹر سے ٹکرائی اور ٹکرانے کے بعد تقریباً تیس ڈگری کا زاویہ بناتی ہوئی مڑی اور پیچھے کھڑی شیرون کے سر میں پیوست ہو گئی۔ دونوں اسی وقت مر گئے۔

۳۰ کا ہندسہ

شہزادہ بسمارک نے تین اسکولوں میں تعلیم حاصل کی، تین ملکوں کے سفیر رہے، تین بادشاہ کے زیرِ اثر رہے، تین جنگوں میں لڑے، امن کے تین معاہدوں پر دستخط کیے، ان کے تین نام تھے: بسمارک، شوئین، ہازن۔ انھیں تین خطابات سے نوازا گیا: کاؤنٹ، ڈیوڈ اور پرنس۔ ان پر تین بار قاتلانہ حملہ ہوا۔ انھوں نے تین بار استعفا دیا۔ ان کے تین بچے تھے۔

انعام بھی سزا بھی

اینام (ہند چینی) کے ایک غریب مچھیرے کو دریائے ہیو میں شاہ "گیالونگ" کا سر تیرتا ہوا ملا۔ یہ بادشاہ ۱۸۰۲ء سے ۱۸۲۰ء تک اینام کا حکم راں تھا اور اس کے مقبرے کو چند مخالفین نے تباہ کر کے لاش کو غائب کر دیا تھا۔ مچھیرا انعام کی توقع دل میں لیے سیدھا محل پہنچا اور مقدس سر موجودہ بادشاہ کے حضور پیش کیا۔ اسے ایک اعلا عہدے سے نوازا گیا۔ اس کے بچّوں کو شاہی پناہ میں لے لیا گیا۔ اور ان کے لیے بھاری وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ مچھیرے کے نام پر ایک یادگاری پگوڈا نکال دیا گیا اور اس کا سر قلم کر دیا گیا، کیوں کہ اس نے اپنے ناپاک ہاتھوں سے مقدس شاہ کے مقدس سر کو چھونے کی جسارت کی تھی۔

تقریر کی تقدیر

مُرتضیٰ علی حسن، کراچی

یہ اُن دِنوں کا ذکر ہے جب میں گورنمنٹ کالج میں سیکنڈ ایئر کا طالبِ علم تھا۔ پڑھائی میں دل چسپی لینے کی وجہ سے کالج کے لڑکوں اور اساتذہ سے جان پہچان تھی۔ اکثر لڑکے میرے پاس پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ اگست کا مہینہ تھا۔ یوم آزادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ کالج کو رنگ برنگی جھنڈیوں اور روشنیوں سے خوب سجایا گیا تھا۔ کالج کی انتظامیہ نے ۱۴۔ اگست کو ایک پروگرام بھی کرنے کا فیصلہ کیا تھا، جس میں بیت بازی، مباحثہ اور مضمون نویسی کے علاوہ تقریری مقابلہ بھی شامل تھا۔ ابھی پروگرام میں کچھ دن باقی تھے کہ کچھ طالب علم ساتھی میرے پاس آئے اور انھوں نے اصرار کیا کہ میں تقریری مقابلے میں اپنا نام لکھوا دوں۔ میں نے انھیں ہر چند ٹالنے کی کوشش کی، لیکن وہ میری ایک نہ مانے اور مجھے مجبوراً منتظم صاحب کو اپنا نام دینا پڑا۔ تقریر کا عنوان تھا: "اتحاد میں پاکستان کی ترقی ہے"۔

ابتدا میں کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ تقریر شروع کس طرح کی جائے۔ پھر آہستہ آہستہ بات سمجھ میں آنے لگی۔ میں نے سوچا کہ اپنی تقریر میں پاکستان کی حالت کا دردناک نقشہ کھینچوں گا۔ افلاس، غربت، پس ماندگی اور فیشن پرستی کی طرف اشارہ کروں گا اور پھر پوچھوں گا اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ ان تمام وجوہ کو دُہراؤں گا جو اکثر مقرر بیان کرتے ہیں، مثلاً غیر اسلامی حکومت، مغربی تہذیب اور غلط تعلیمی پالیسی وغیرہ۔ پھر ان سب کو باری باری غلط قرار دوں گا اور اصل وجہ بتاؤں گا کہ اس کی اصل وجہ مسلمانوں میں نِفاق ہے۔ ہم پاکستانیوں میں اتحاد کی کمی ہے۔ آخر میں اتحاد کی تلقین کروں گا اور تقریر کو اس شعر پر ختم کروں گا ؎

آ عندلیب مِل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گُل پکار، میں چلّاؤں ہائے دِل

پھر میں نے تقریر کا ایک خاکہ بنا لیا جو کچھ اس طرح تھا: (۱) تمہید۔ اشعارِ حالی (بلند

اور دردناک آواز سے) (۲) پاکستان کی موجودہ صورت حال (د) افلاس (ب) سماجی پس ماندگی (ج) فیشن پرستی اور اس کے نتائج (۴) اس کے اسباب۔ کیا اس کی وجہ غیر اسلامی حکومت ہے؟ نہیں۔ کیا اس کی وجہ مغربی تہذیب ہے؟ نہیں۔ کیا اس کی وجہ بے روزگاری اور پس ماندگی ہے؟ نہیں۔ کیا اس کی وجہ غلط تعلیمی پالیسی ہے؟ نہیں۔

تو پھر کیا وجہ ہے؟ (وقفہ۔ جس کے دوران حاضرین پر مسکراتے ہوئے ایک نظر ڈالنا اور تالیاں بجنے کا انتظار کرنا)

(۴) پھر اصل وجہ بتانا کہ مسلمانوں میں اتحاد کی بڑی کمی ہے۔ (تعلیمی اداروں میں فسادات وغیرہ کا ذکر رقت انگیز آواز میں کرنا اور تالیوں کے لیے کچھ دیر رُک جانا۔) (۵) اختتام۔ طلبہ کو نصیحتیں، خصوصاً اتحاد کی تلقین (ایک شعر) (اس کے بعد انکساری سے اپنی نشست پر بیٹھ جانا اور لوگوں کی داد کے جواب میں ایک ایک لمحے کے بعد حاضرین کو سلام کرنا۔)

خاکے کو تیار کرنے کے بعد مقابلے کی تاریخ تک اس پر بار بار نظر ڈالتا رہا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بولنے کی مشق کرتا رہا۔ خاص طور پر نمبر ۳ کے مطابق مسکرانے کی مشق۔

۱۴۔ اگست کو خوب تیار ہو کر کالج پہنچا، جہاں ساتھیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور کالج کے ہال میں پہنچا دیا۔ قومی ترانے کے بعد باقاعدہ پروگرام کا آغاز ہوا۔ دوسرے پروگراموں کے بعد تقریری مقابلہ شروع ہوا۔ اتفاق دیکھیے کمپیئرنگ میرے ایک نہایت جگری دوست کر رہے تھے۔ جب میرا نمبر آیا تو انھوں نے کچھ اس طرح میرا تعارف کرایا:

"معزز حاضرین! آج ہمارے کالج کے ایک بہت ہی ذہین اور لائق طالب علم نے اس تقریری مقابلے میں شرکت کی ہے وہ....."

تقریر کا ذکر سنتے ہی میں نے اپنی تقریر کے تمہیدی فقروں کو یاد کرنے کی کوشش کی، لیکن اس وقت ذہن اس قدر گڑبڑا گیا کہ نوٹ دیکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو نوٹ ندارد۔ ہاتھ پاؤں میں ایک دم لرزہ طاری ہو گیا۔ دل کو سنبھالا کہ ٹھیرو ابھی اور بھی جیبیں ہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ رعشے کے عالم میں تمام جیبیں دیکھ ڈالیں، لیکن کاغذ کہیں نہ ملا۔ تمام ہال آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا۔ دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیا۔ ہونٹ خشک ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ دس بارہ مرتبہ تمام جیبوں کو ٹٹولا، لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ جی چاہا کہ زور زور سے رونا شروع کر دوں۔ بے بسی کے عالم میں ہونٹ کاٹنے لگا۔ ادھر کمپیئر صاحب میرے بارے میں مبالغہ آمیز بیان دے رہے تھے: "کالج ان پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے اور....."

الٰہی! اب میں کیا کروں؟ ایک تو پاکستان کا نقشہ کھینچنا ہے۔ نہیں اس سے پہلے یہ بتانا ہے کہ ہم کتنے نالائق ہیں، نہیں جاہل ہیں۔ نہیں پہلے..... میرا دوست کہہ رہا تھا: "یہ باتیں تو سب ہی جانتے ہیں، لیکن تقریر کرنے میں جو ملکہ ان کو حاصل ہے وہ....." ہاں تو وہ تقریر کیسے شروع ہوتی ہے؟ میں نے سوچا۔ مسلمانوں کے اتحاد پر چند نصیحتیں ضرور کرتی ہیں، لیکن وہ تو آخر میں ہیں۔ بیچ میں مسکراتا کہاں تھا؟ آواز آئی، "میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ آپ کے دل پر گہرا اثر چھوڑیں گے اور آپ کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے شکریہ....."

دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہو رہی تھی۔ کمپیئر صاحب نے مجھ سے کچھ کہا، مجھے الفاظ بالکل سنائی نہ دیے۔ بس اتنا محسوس ہوا کہ تقریر کا وقت سر پر آن پہنچا ہے اور مجھے اپنی نشست پر سے اٹھنا ہے، چناں چہ میں ایک نامعلوم طاقت کے زیرِ اثر اٹھا، کچھ لڑکھڑایا، پھر سنبھل گیا۔ میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ میں بے ہوشی سے ذرا ہی دُور تھا۔ تقریر کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ ایک

کہانی بھی تھی درمیان میں لومڑی اور بگلے کی کہانی۔ نہیں، ٹھیک ہے لکڑی کا گٹھا..... "سب لوگ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سہارے کے لیے میز کو پکڑ لیا۔ میرا دوسرا ہاتھ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ وہ بھی میں نے میز پر رکھ دیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میز بھاگنے کو ہے اور میں اُسے روکے کھڑا ہوں۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور مسکرانے کی کوشش کی۔ گلا خشک تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے کہا:

"پیارے ہم وطنو!" آواز خلافِ توقع بہت ہی باریک اور منحنی سی نکلی۔ ایک دو شخص ہنس دیے۔ میں نے گلے کو صاف کیا۔ پھیپھڑوں پر ایک دم جو زور ڈالا تو آواز بہت بلند ہو گئی۔ اس پر لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ہنسی تھمی تو میں نے کہا:

"پیارے ہم وطنو!" اس کے بعد ذرا دم لیا اور پھر کہا "پیارے ہم وطنو!" کچھ یاد نہ آیا کہ اس کے بعد کیا کہنا ہے۔ بیسیوں باتیں دماغ میں چکر لگا رہی تھیں، لیکن زبان تک ایک نہ آتی تھی۔ "پیارے ہم وطنو!" اب کے لوگوں کی ہنسی سے میں جھنّا گیا۔ اپنی توہین پر بڑا غصّہ آیا۔ ارادہ کر لیا کہ اس دفعہ جو بھی منھ میں آیا کہہ دوں گا۔ ایک دفعہ تقریر شروع کر دوں تو پھر کوئی مشکل نہ رہے گی۔

"پیارے ہم وطنو! بعض لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان کی آب و ہوا خراب ہے، یعنی ایسی ہے کہ پاکستان میں بہت سے نقص ہیں..... سمجھے آپ؟ (وقفہ.....) نقص ہیں، لیکن یہ بات جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اگرچہ درست نہیں!" (قہقہہ) حواس معطّل ہو رہے تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر تقریر کا سلسلہ کیا تھا۔ یک لخت "لومڑی اور بگلے کی کہانی" یاد آئی اور راستہ کچھ صاف ہوتا ہوا دکھائی دیا۔

"ہاں تو بات دراصل یہ ہے کہ ایک جنگل میں ایک لومڑی اور ایک بگلا رہتے تھے۔ جو باوجود خراب آب و ہوا اور غیر اسلامی حکومت کے ....!" (زور کا قہقہہ) یہاں تک پہنچ کر محسوس ہوا کہ بات کچھ بے ربط سی ہو رہی ہے۔ میں نے کہا چلو وہ لکڑی کے گٹھے کی کہانی شروع کر دیں! "مثلاً آپ لکڑیوں کے ایک گٹھے کو لیجیے۔ لکڑیاں اکثر مہنگی ملتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں افلاس بہت زیادہ ہے۔ گویا چوں کہ اکثر لوگ بہت غریب ہیں اس لیے گویا لکڑیوں کا گٹھا یعنی آپ دیکھیے نا کہ اگر..... (بلند اور طویل قہقہہ)

حضرات! اگر آپ نے اتحاد قائم نہ کیا تو آپ کی قوم تباہ ہو جائے گی۔ نحوست منڈلا رہی ہے۔ (قہقہے، شور و غوغا ..... "اسے باہر نکالو ہم نہیں سنتے۔") علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

گنوا دی ہم نے اسلاف سے جو میراث پائی تھی
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(آواز آئی، "کیا بکتا ہے۔") خیر اس بات کو جانے دیجیے۔ بہرحال اس بات میں تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ ؎

آ عندلیب مل کر کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

اس شعر نے دورانِ خون تیز کر دیا۔ ساتھ ہی لوگوں کا شور بھی زیادہ ہو گیا، چناں چہ میں بڑے جوش سے بولنے لگا:

"جو قومیں اس وقت بیداری کے آسمان پر چڑھی ہوئی ہیں اُن کی زندگیاں لوگوں کے لیے شاہ راہیں ہیں اور ان کی حکومتیں چار دانگِ عالم کی بنیادیں ہلا رہی ہیں۔ (لوگوں کا شور اور ہنسی اور بھی بڑھ گئی) دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ زندگی کے وہ تمام شعبے ......"

لوگوں کا شور اور قہقہے اتنے بلند ہو گئے کہ میں اپنی آواز بھی نہ سُن سکتا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ابھی میں نے کچھ کہنے کے لیے منھ کھولا ہی تھا کہ کوئی سفید سی چیز گولی کی طرح آئی اور سیدھی میرے منھ کے اندر چلی گئی۔ ابھی میں اس کے متعلق غور کر ہی رہا تھا کہ میرے اوپر ٹماٹروں اور سنگتروں کی بارش شروع ہو گئی، لیکن میں نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ "حضرات! تم یاد رکھو! تم تباہ ہو جاؤ گے! کالے بادل گھٹاؤں کی صورت میں تمھاری طرف بڑھ رہے ہیں۔! تم لکڑی کا گھٹا ہو اغر.... غوں...."

لیکن بوچھاڑ بڑھتی ہی گئی تو میں نے اس نامعقول مجمع سے فرار ہونا ہی مناسب سمجھا۔ اسٹیج سے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور ہوا کی مانند دروازے سے باہر ہو گیا۔ ہال کے تمام افراد میرے پیچھے لپکے۔ میں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا، بلکہ سیدھا بھاگتا چلا گیا۔ وقتاً فوقتاً بعض نامناسب جملے میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ ان کو سُن کر میں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی اور سیدھا گھر کا رُخ کیا۔ اس دن کے بعد سے آج تک مجھے نہ کالج والوں نے کسی پروگرام میں مدعو کیا اور نہ مجھ میں خود کسی پروگرام میں حصہ لینے کی خواہش پیدا ہوئی۔

ایک ذہین چیونٹی

ڈاکٹر شمیم حنفی

بہت، بہت، بہت زمانہ گزرا، جب زمین نئی نئی تھی۔ ایک ننھی سی چیونٹی برف سے ڈھکے ایک میدان میں گئی۔ برف پر چلنا اس کے لیے مشکل تھا۔ اس نے برف سے کہا: "اے برف تم بہت طاقت ور ہو! میرے پاؤں تم پر اُٹھ نہیں پاتے۔ اس حال میں چلنا کٹھن ہے۔ اے برف! دنیا میں کوئی بھی تم سے زیادہ طاقت ور نہیں ہو گا!"

برف کو یہ سُن کر بہت خوشی ہوئی۔ اس نے کہا: "میں طاقت ور ہوں، لیکن دنیا میں مجھ سے زیادہ طاقت ور لوگ بھی ہیں۔ سورج مجھ سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ جب سورج چمکتا ہے تو میں پگھل جاتی ہوں!"

اب چیونٹی سورج کے پاس گئی۔ بولی: "اے سورج! تم بہت طاقت ور ہو۔ تم دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور ہو۔ تم چاہو تو ایک پل میں میرے پاؤں سے لپٹی ساری برف پگھلا دو!"

سورج نے کہا: "ہاں میں طاقت ور ہوں، لیکن دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ طاقت ور لوگ موجود ہیں۔ بادل مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اگر میرے سامنے آجائے تو میں چھپ جاتا ہوں۔ مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا!"

اب چیونٹی بادل کے پاس گئی۔ بولی: "اے بادل تم اتنے طاقت ور ہو کہ سورج کو بھی چھپا

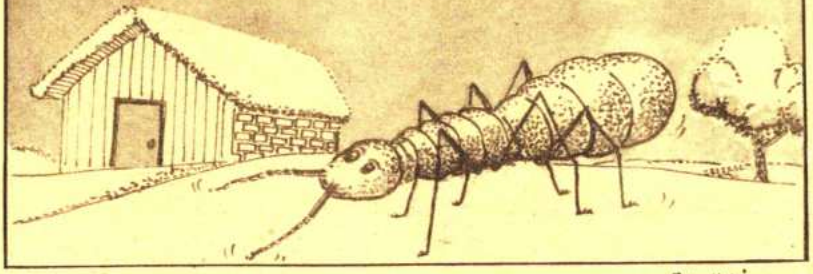

سکتے ہو جو میرے پاؤں سے لپٹی ہوئی برف کو پگھلا سکتا ہے۔ تم دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور ہو۔"

بادل نے کہا، "میں طاقت ور ہوں، لیکن مجھ سے بھی زیادہ طاقت ور ہوتی ہے آندھی۔ آندھی چاہے تو مجھے اپنے ساتھ اُڑا لے جائے۔"

اب چیونٹی آندھی کے پاس گئی۔ بولی، "اے آندھی! تم بہت طاقت ور ہو۔ تم چاہو تو بادل کو اُڑا لے جاؤ جو سورج کو چھپا سکتا ہے۔ سورج جو میرے پاؤں سے لپٹی برف کو پگھلا سکتا ہے۔ تم دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور ہو!"

آندھی نے کہا، "ہاں! میں طاقت ور تو ہوں، لیکن دیوار مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے۔ میں اُس سے لاکھ سر ٹکراؤں، اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ سچ تو یہ ہے دیوار مجھے توڑ کر رکھ دیتی ہے۔"

اب چیونٹی دیوار کے پاس گئی۔ کہا، "اے دیوار! تم بہت طاقت ور ہو۔ تم آندھی کا زور توڑ سکتی ہو جو بادل کو اُڑا لے جاتی ہے۔ بادل جو سورج کو چھپا لیتا ہے۔ سورج جو میرے پاؤں سے لپٹی برف کو پگھلا سکتا ہے۔ تم دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور ہو۔"

دیوار نے کہا، "ہاں اے چیونٹی! میں طاقت ور ہوں، لیکن مجھ سے زیادہ طاقت ور تو چوہا ہے۔ چوہا اپنے دانتوں سے کُتر کُتر کر مجھ میں سوراخ کر دیتا ہے۔ میں اُسے روک نہیں پاتی۔"

اب چیونٹی چوہے کے پاس گئی۔ بولی، "اے چوہے! تم بہت طاقت ور ہو۔ تم دیوار میں سوراخ کر سکتے ہو، جو آندھی کا زور توڑ سکتی ہے۔ آندھی جو بادل کو اُڑا لے جاتی ہے۔ بادل جو سورج کو ڈھک لیتا ہے۔ سورج جو میرے پاؤں سے لپٹی برف کو پگھلا سکتا ہے۔ برف، جو مجھے ٹھیک سے چلنے نہیں دیتی۔ تم دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور ہو!"

چوہے نے کہا، "میں طاقت ور ہوں، لیکن مجھ سے زیادہ طاقت ور بلّی ہے جو مجھے جب چاہے ہڑپ کر جائے میں اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا!"

اب چیونٹی بلّی کے پاس گئی۔ کہا، "اے بلّی! تم بہت طاقت ور ہو۔ تم چوہے کو ہڑپ کر سکتی ہو، جو دیوار میں سوراخ کر سکتا ہے۔ دیوار جو آندھی کا زور توڑ سکتی ہے۔ آندھی جو بادل کو اُڑا لے جاتی ہے۔ بادل جو سورج کو ڈھک لیتا ہے۔ سورج جو میرے پاؤں سے لپٹی برف کو پگھلا سکتا ہے۔ برف جو مجھے ٹھیک سے چلنے نہیں دیتی۔"

بلّی نے کہا، "ہاں ٹھیک ہے۔ میں طاقت ور ہوں، لیکن شیر مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے۔ شیر مجھے پکڑ سکتا ہے۔ پکڑ لے تو مجھے چیر پھاڑ کر رکھ دے۔"

اب چیونٹی شیر کے پاس گئی۔ بولی، "اے شیر! تم دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور ہو۔ تم بلّی کو ہڑپ کر سکتے ہو، جو چوہے ہڑپ کر سکتی ہے، جو دیوار میں سوراخ کر سکتا ہے، جو آندھی کا زور توڑ سکتی ہے، جو بادل کو اُڑا لے جاتی ہے، جو سورج کو ڈھک سکتا ہے، جو میرے پاؤں سے لپٹی برف کو پگھلا سکتا ہے، جو مجھے چلنے نہیں دیتی۔"

شیر نے کہا، "میں بہت طاقت ور ہوں، لیکن سب سے زیادہ طاقت ور نہیں۔ مجھ سے زیادہ طاقت ور تو انسان ہے۔ وہ تیر کمان سے میرا شکار کر سکتا ہے اور میں کچھ بھی نہیں کر پاتا!"

اب چیونٹی انسان کے پاس گئی۔ بولی، "اے انسان! تم بہت طاقت ور ہو۔ تم شیر کا شکار کر سکتے ہو، جو چاہے تو بلّی کو چیر پھاڑ کر رکھ دے، جو چوہے کو ہڑپ کر جاتی ہے، جو دیوار میں سوراخ کر دیتا ہے، جو آندھی کا زور توڑ دیتی ہے، جو بادل کو اُڑا لے جاتی ہے، جو سورج کو ڈھک لیتا ہے، جو میرے پاؤں سے لپٹی برف کو پگھلا سکتا ہے۔ جو مجھے ٹھیک سے چلنے نہیں دیتی۔"

انسان نے کہا، "میں بہت طاقت ور ہوں، لیکن سب سے زیادہ طاقت ور نہیں۔ مجھ سے بھی زیادہ طاقت ور تو اللہ ہے جس نے مجھے بنایا ہے!"

اب چیونٹی اللہ کے پاس گئی۔ بولی، "اللہ تعالیٰ! تم سب سے زیادہ طاقت ور ہو کہ تم نے انسان کو بنایا، جو شیر کا شکار کرتا ہے، جو بلّی کو ہڑپ کر سکتا ہے، جو چوہوں کو کھا جاتی ہے، جو دیوار میں سوراخ کر سکتے ہیں، جو آندھی کا زور توڑ دیتی ہے، جو بادل کو اُڑا کر جب چاہے لے جائے، جو سورج کو ڈھک سکتا ہے، جو میرے پاؤں سے لپٹی برف کو پگھلا سکتا ہے، جو مجھے ٹھیک سے چلنے نہیں دیتی۔"

اللہ نے جواب دیا، "اے ننھی چیونٹی! تو کتنی ہوشیار ہے کہ ہوتے ہوتے آخر مجھ تک پہنچ گئی۔ ٹھیک ہے۔ میں سب سے زیادہ طاقت ور ہوں۔ میں نے انسان کو پیدا کیا۔ اے چیونٹی! تو سچ مچ بہت ذہین، بہت سمجھ دار ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو راستے میں کہیں گم ہو جاتی اور مجھ تک نہ پہنچ پاتی۔ مجھ تک پہنچنے کے لیے ایسا ہی صبر، ایسی ہی ہوشیاری اور تلاش ضروری ہے۔

سنگ دل کھلونے

معراج

بے بی اسما کے پاس بہت سے کھلونے تھے۔ یہ کھلونے ایک بڑے سے ڈبے میں رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کپتان گڈا بھی تھا، جو ملاحوں جیسی نیلی وردی اور سفید ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ وہ ہر وقت ہنستا اور مسکراتا رہتا تھا۔ وہ ہر وقت گاتا رہتا:

میں زندگی میں ہر دم ہنستا ہی رہوں گا
میں زندگی میں ہر دم ہنستا ہی رہوں گا

اس کا گانا سنتے سنتے سب کھلونے عاجز آ چکے تھے۔ بھالو نے بہت منّت سماجت سے کہا،

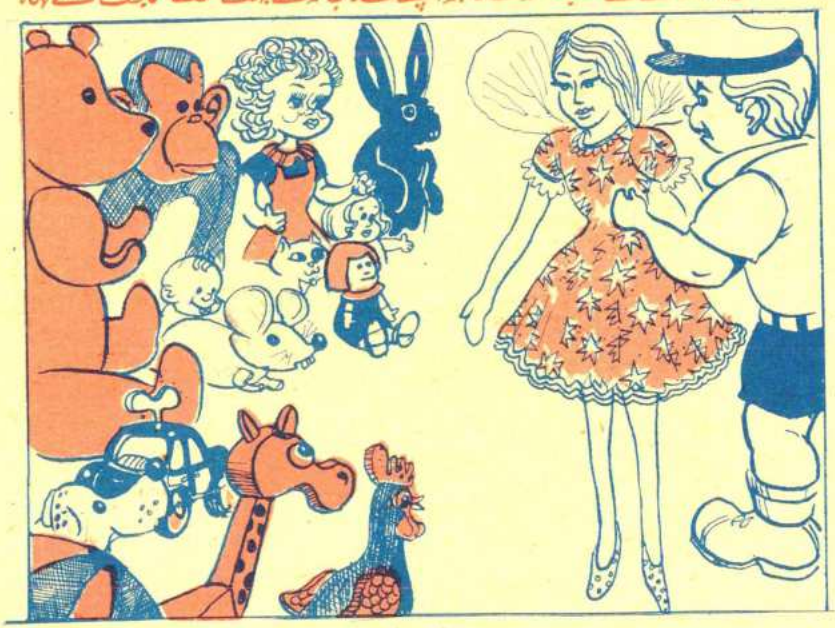

تم سب سنگ دل کھلونے ہو۔

"تم گانا بند کر دو۔ یہ بکواس سنتے سنتے میرے کان پک گئے ہیں۔"

بندر بولا، "بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ میں زندگی میں ہر دم ہنستا ہی رہوں گا۔ جیسے دنیا میں ہنسنے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں۔"

کپتان بولا، "زندگی کو ہنستے کھیلتے گزارنا چاہیے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟"

بھالو رنجیدہ ہو کر بولا، "میں کیسے ہنس سکتا ہوں؟ میرے بال جھڑتے جا رہے ہیں اور میں بدشکل ہوتا جا رہا ہوں۔"

ٹیڈی بولا، "میرے پاؤں میں سوراخ ہو گیا ہے اور اس میں سے لکڑی کا برادہ نکل رہا ہے۔"

سنہری بالوں والی گڑیا بولی، "میرا ایک جوتا کھو گیا ہے۔"

خرگوش اس لیے اُداس تھا کہ اس کی دُم ڈھیلی ہو کر لٹکنے لگی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کسی دن یہ ٹوٹ کر گر نہ جائے۔ ہر کھلونا اپنی اپنی جگہ فکر مند اور پریشان تھا۔ بس ایک کپتان تھا جو ہنستا مسکراتا رہتا تھا۔

سال گرہ کے موقع پر بے بی اسما کو ایک گڑیا تحفے میں ملی۔ یہ ایک بہت ہی ننھی منی سی خوب صورت پری تھی۔ اس کا مخمل کا فراک تھا۔ اس پر سنہری تارے جھل مل جھل مل کر رہے تھے۔ پریا اپنے پنجوں کے بل یوں کھڑی تھی جیسے ابھی ناچنا شروع کر دے گی۔ سنہری بالوں والی گڑیا اسے دیکھ کر نفرت سے بولی، "لو، ایک اور مسخری آ گئی۔"

بندر اور بھالو نے اسے دیکھا۔ انھیں بھی پریا ایک آنکھ نہ بھائی۔ ٹیڈی بولا، "اگر پریا سمجھتی ہے کہ وہ ہنس کر اور مسکرا کر ہمارا دل موہ لے گی تو یہ اس کی غلط فہمی ہے۔"

سنہری بالوں والی نے کہا، "اس کل مُنھی کو دُور دُور ہی رکھو۔ میں تو کہتی ہوں کہ اسے ڈبے میں آنے ہی نہ دو۔"

پریا بولی، "مجھے یہاں ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے ڈبے کے اندر آنے دو۔"

ٹیڈی بولا، "اگر تمھیں ڈبے کے اندر سونے کا شوق ہے تو اس کونے میں چلی جاؤ۔ وہاں کوئلے کا ڈبا پڑا ہے۔ تم اس کے اندر آرام سے بیٹھو۔"

بے چاری پریا ان کی باتوں میں آ گئی۔ وہ کوئلے کے ڈبے پر چڑھی اور اس کے اندر اُتر گئی، لیکن وہاں وہ گھبرانے لگی اور اکیلے بیٹھے بیٹھے ڈرنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ اس کا مخمل

جب کپتان کھلونا نگر آیا تو سب کھلونے اُسے دیکھتے رہ گئے۔

کا فراک سیاہ ہو گیا ہے۔ اس کے سنہری جوتوں پر بھی کالک لگ گئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں مَل مَل کر دیکھا۔ اپنا حلیہ دیکھ کر اُسے رونا آگیا۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی، میں تو بالکل کالی ہو گئی ہوں۔ کہیں میں بھالو تو نہیں بن رہی ہوں؟ اس نے اپنے آنسو پونچھے اور اس کے چہرے پر کوئلے کی سیاہی لگ گئی۔ وہ بے چاری کوئلے کے ڈبّے سے باہر نکلی۔ اسے ابھی تک یہ پتا نہیں تھا کہ یہ کوئلے کی سیاہی ہے۔

رات کے وقت کپتان نے رونے کی آواز سُنی تو اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے پریا کو گندے اور خراب حال میں دیکھا تو اسے بہت رحم آیا۔ اس نے پوچھا، "تمھیں کیا ہوا؟"

پریا نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ کپتان اُسی طرح مسکرا رہا تھا۔ پریا کے دل کو تسلّی ہوئی کہ کوئی تو کھلونا ایسا ہے جو اسے دیکھ کر ہنستا اور خوش ہوتا ہے۔

اُس نے کہا، "کھلونوں نے مجھے ڈبّے سے باہر نکال دیا۔ میں کوئلے کے ڈبّے میں سو گئی۔ مجھے

پتا نہیں تھا کہ میرے کپڑے اور ہاتھ پاؤں گندے ہو جائیں گے۔ اب میں کیا کروں؟"

کپتان گڈا بہت نرم دل تھا۔ اس نے کہا، "میں بھی پہلے تو تمھیں جن بھوت ہی سمجھا تھا لیکن اب معلوم ہوا کہ تم تو پری گڑیا ہو۔ کھلونوں نے تمھارے ساتھ بہت زیادتی کی کہ تمھیں باہر نکال دیا۔ میرے ساتھ آؤ، پہلے میں تمھارا ہاتھ منھ دُھلواتا ہوں۔"

کپتان گڈا ایک پیالی میں گرم پانی اور صابن کا ٹکڑا لے آیا۔ پہلے اُس نے پریا کے منھ ہاتھ دھلوائے۔ پھر اُس نے کہا، "یہ کھلونے کسی کو پسند ہی نہیں کرتے۔ وہ مجھ سے بھی نفرت کرتے ہیں۔ وہ اس بات سے چڑتے ہیں کہ میں گیت کیوں گاتا ہوں۔"

پریا مسکرا کر بولی، "اوہو، تم گانا بھی گا لیتے ہو؟ مجھے گیت بہت پسند ہیں۔ کیا تم مجھے گا کر سناؤ گے؟" کپتان مسکرا کر بولا، "کیوں نہیں۔ لو سنو۔"

میں زندگی میں ہر دم ہنستا ہی رہوں گا
میں زندگی میں ہر دم ہنستا ہی رہوں گا

پریا خوش ہو کر بولی، "واہ وا، تم تو بہت اچھا گا لیتے ہو۔" کپتان بولا، "شکریہ۔"

وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ بھالو، ٹیڈی، بندر، خرگوش اور دوسرے سب کھلونے اِدھر آ گئے۔ وہ سب بہت غصّے میں تھے۔

بھالو لال پیلا ہو کر بولا، "تم یہ بے سُرا گانا بند نہیں کرو گے؟"

کپتان بولا، "میں تمھارے لیے نہیں بلکہ پریا کے لیے گا رہا ہوں۔"

سنہری بالوں والی گڑیا بولی، "یہ چڑیل تمھیں پری نظر آتی ہے؟"

کپتان بگڑ کر بولا، "اس کا یہ حال بنانے میں کس کا ہاتھ ہے؟ یہ تم ہی ہو، تم سب نامہربان اور سنگ دل کھلونے ہو۔"

ٹیڈی بولا، "ہم اسے ناپسند کرتے ہیں۔ تم بھی کان کھول کر سُن لو کہ اگر تم نے اپنا گانا بند نہیں کیا تو ہم سب مل کر تمھارا بھُرکس نکال دیں گے۔"

پریا بولی، "میں تو یہاں رہنا ہی نہیں چاہتی۔"

کپتان نے کہا، "میں بھی تمھارے ساتھ ہی چلوں گا۔ آؤ کھلونا نگر چلتے ہیں۔ اگرچہ مجھے وہاں کا راستہ معلوم نہیں، لیکن ہم پوچھتے پوچھتے وہاں پہنچ ہی جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں کے

کھلونے یہاں والوں سے بہت زیادہ اچھے ہوں گے۔ خدا حافظ ڈبّے کے رہنے والو! اب تم مجھے کبھی نہ دیکھ سکو گے۔"

کپتان گڈا، پریا کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُترتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

کپتان گڈا اور پریا کھلونا نگر کی تلاش میں نکلے۔ انھیں راستے کا پتا نہیں تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ وہ کھلونا نگر کتنی دیر میں پہنچ سکتے ہیں؟ وہ باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ انھیں ایک سیہ ملا۔

سیہ نے کہا، "ارے تم لوگ یہاں کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

پریا بولی، "ہم کھلونا نگر جانا چاہتے ہیں۔ کیا تمھیں وہاں کا راستہ معلوم ہے؟"

سیہ بولا، "مجھے تو آج ہی پتا چلا ہے کہ کھلونا نگر بھی کوئی جگہ ہے۔" یہ کہہ کر سیہ چل دیا۔

کپتان گڈا اور پریا بہت مایوس ہوئے۔ کپتان بولا، "کوئی فکر نہ کرو۔ ہم کسی اور سے راستہ پوچھ لیتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد انھیں ایک چوہا ملا۔ کپتان بولا، "اے بھائی، ذرا ایک منٹ کے لیے سُننا۔"

چوہا رُک گیا اور گڈے کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اس نے پوچھا، "تم کون ہو؟ نہ تو تم چوہے نظر آتے ہو، نہ تم سیہ ہو۔ خرگوش بھی نہیں ہو....."

کپتان بولا، "ہم کھلونے ہیں۔ کھلونا نگر جانا چاہتے ہیں۔ کیا تمھیں وہاں کا راستہ معلوم ہے؟"

چوہا بولا، "کھلونا نگر کا راستہ تو میں نہیں جانتا۔ اگر تم چاہو تو میں تمھیں چوہا نگر کا راستہ بتا سکتا ہوں۔"

پریا اور کپتان اور آگے چلے۔ ایک جھاڑی کے پاس انھیں ایک خرگوش ملا۔

کپتان نے زور سے کہا، "ہیلو بھیّا خرگوش! کیا تمھیں کھلونا نگر کا راستہ معلوم ہے؟"

خرگوش کان کھجا کر بولا، "کھلونا نگر وہی تو نہیں جہاں بہت سے کھلونے رہتے ہیں؟"

کپتان نے کہا، "ہاں بھیّا، وہی، کیا تم اس کا راستہ بتا سکتے ہو؟"

خرگوش نے کہا، "اس جھاڑی کے پیچھے ایک بونا رہتا ہے۔ اُسے کھلونا نگر کا راستہ معلوم ہے۔"

اب وہ دونوں جھاڑی کے پاس پہنچے۔ وہاں کپتان زور زور سے آوازیں دینے لگا، "اے بھیّا! اے بھائی بونے!"

جھاڑی کے اندر سے آواز آئی، "مجھے کون بُلا رہا ہے؟" پھر جھاڑی کے اندر سے ایک بونا نکلا۔ اس نے پوچھا، "تم کیا چاہتے ہو؟"

کپتان اور پریا بولی، "ہمیں کھلونا نگر کا راستہ معلوم کرنا ہے۔"

بونا حیرانی سے بولا، "اوہو، کیا تم کھلونے ہو؟ یہ تو مجھے کھلونا نظر نہیں آتی ہے۔ یہ تو کوئی پری ہے۔"

کپتان بولا، "ہاں یہ پریا گڑی ہے۔"

بونے نے کہا، "کھلونا نگر کا راستہ بہت لمبا ہے۔ یہاں سے تھوڑی دُور اخروٹ کا درخت ہے۔ ایک بس روز وہاں سے کھلونا نگر جاتی ہے۔ شاید وہ بس کچھ دیر میں وہاں سے جانے ہی والی ہے۔"

دونوں نے بونے کا شکریہ ادا کیا۔ پھر وہ اخروٹ کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد کھلونا نگر کی بس بھی آ گئی۔ اس میں بہت سے کھلونے، پریاں اور بونے بیٹھے ہوئے تھے۔ کپتان اور پریا بھی ایک کونے میں سکڑ سمٹ کر بیٹھ گئے۔ بس ایک سوراخ میں داخل ہو گئی اور ایک زمین دوز راستے میں چلنے لگی۔ پہلے مکھن پور آیا۔ یہاں سب چوہے چوہیاں اُتر گئے۔ اگلا اسٹاپ کہانی پور تھا۔ یہاں سب پریاں اور بونے اُتر گئے۔ سب سے آخر میں کھلونا نگر کی بستی تھی۔ سب کھلونے کھلونا نگر میں جانے کے لیے بے تاب تھے۔ جوں ہی بس رُکی کھلونے چھلانگیں مارتے ہوئے بس سے اُترے۔ بستی کے باہر ایک لکڑی کا دروازہ تھا۔ ایک پولیس والا ہر کھلونے کی اچھی طرح دیکھ بھال کر کے جانے دیتا۔

جب وہ دروازے پر پہنچے تو پولیس والے نے انھیں روک لیا اور کہا، "اندر جانے کے لیے کھلونا ہونا ضروری ہے۔"

کپتان بولا، "ہم کھلونے ہی تو ہیں۔"

پولیس والا بولا، "یہ خاتون تو کھلونا نظر نہیں آتی۔ یہ تو کوئی پری ہے، اس لیے یہ کھلونا نگر میں نہیں جا سکتی۔"

دونوں میں بہت دیر تک بحث ہوتی رہی۔ آخر پولیس والا مان گیا اور اس نے انھیں کھلونا نگر میں جانے کی اجازت دے دی۔

یہاں سے بہت دُور کھلونوں کی بستی ہے، جس کا نام ہے کھلونا نگر۔ جب کپتان گڈا کھلونا

نگر میں آیا تو سب کھلونے اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ کپتان گڈا سفید قمیص، نیلی نیکر اور نیوی کی ٹوپی میں بہت ہی پیارا لگ رہا تھا۔ گلابی کوٹ والی گڑیا نے پوچھا، "تم کون ہو؟"

کپتان گڈا بولا، "میں کپتان ہوں۔"

گڑیا بولی، "کیا تم نے کبھی جہاز چلایا ہے؟"

کپتان گڈے نے کبھی جہاز کی شکل تک نہیں دیکھی تھی، لیکن گڈا تھا بہت شیخی باز۔ وہ فوراً بولا، "میری تو عمر ہی جہاز میں گزری ہے۔ تین دفعہ تو میرا جہاز بالکل تباہ ہو گیا۔ میں بہت مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکا۔ میری زندگی تو بہادری کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔"

اب دوسرے کھلونے سوچنے لگے کہ کپتان گڈا بہت دلیر اور بہادر ہے۔ ایک بھالو نے پوچھا، "ہمیں بھی کوئی اپنا کارنامہ سنائیے۔"

کپتان گڈے نے فوراً کہا، "ایک دفعہ میں اپنا جہاز چلا رہا تھا کہ طوفان آ گیا۔ میرا جہاز اُلٹ گیا اور میں سمندر میں ڈوبنے لگا۔"

بدقسمتی سے ننھی گڑیا کا پاؤں پھسل گیا۔

بھالو بے تابی سے بولا، "پھر؟ پھر کیا ہوا؟"

کپتان گڈے نے کہا، "میں نے ایک بڑی سی مچھلی کو پکڑا، ایک رسّی اس کی گردن میں باندھی اور اُچھل کر اس پر سوار ہو گیا۔

ایک چھوٹی سی گڑیا بولی، "تم تو سچ مچ بہت بہادر ہو۔"

گلابی کوٹ والی گڑیا نے بھی سر ہلا کر تائید کی۔ گڈے کپتان کا سینہ فخر سے تن گیا۔ گڈا کپتان بہت گپ باز تھا۔ وہ اپنی بہادری کی جھوٹی کہانیاں سُنایا کرتا اور سب گڈے اور گڑیاں بہت دل چسپی سے اس کی گپیں سُنا کرتے۔ اس نے کہا، "ایک دن میرا جہاز طوفان میں تباہ ہو گیا۔ میں تیرتے تیرتے ایسے جزیرے پر جا نکلا جہاں وحشی لوگ آباد تھے۔ جانتے ہو میں نے کیا کیا؟ میں نے ان سب کو پڑھنا لکھنا سکھایا۔ انھیں انسانوں کی طرح رہنا سہنا سکھایا۔ جب میں وہاں سے واپس آنے لگا تو سب لوگوں نے بہت منّت سماجت کی اور مجھے روکنا چاہا۔ بہت سے لوگ تو مجھے بادشاہ بنانے کے لیے تیار تھے۔"

بھالو نے پوچھا، "پھر کیا ہوا؟"

گڈا کپتان بولا، "بس پھر میں واپس آ گیا۔"

سب کھلونوں نے کپتان گڈے کی تعریف کی۔ بہت سے گڈے اور گڑیاں اپنے دل میں سوچنے لگے کہ کاش ہم بھی اتنے دلیر ہوتے، جہاز میں سمندر کی سیر کرتے اور جب جہاز سمندری طوفان میں پاش پاش ہو جاتا تو کسی جزیرے پر جا نکلتے، وہاں ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیتے جسے سُن کر لوگ اَش اَش کر اُٹھتے۔

کپتان گڈے نے جھوٹی کہانیاں سُنا سُنا کر کھلونوں پر ایسا رعب جمایا کہ سب کھلونے اس کے اشاروں پر چلنے لگے۔ ہوتے ہوتے کپتان گڈا ایسا بدمزاج ہو گیا کہ کھلونوں پر رعب جھاڑنے لگا۔ وہ بات بات پر کھلونوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتا۔ اگر گڈے یا گڑیاں اس کا حکم ماننے میں ذرا بھی دیر کرتے تو کپتان گڈا ان کی خوب خبر لیتا۔

پھر ایک کاٹھ (لکڑی) کی پتلی کھلونا نگر میں آئی۔ کپتان گڈے نے اسے گھور کر دیکھا اور بہت حقارت سے بولا، "تم لکڑی کی پتلی ہو۔ ٹھیک ہے نا؟ اس لیے تمھیں گڑیا نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات کان کھول کر سُن لو کہ میں کھلونوں کا سردار ہوں۔"

پتلی نے پوچھا، "وہ کیسے؟"

گلابی کوٹ والی گڑیا بولی، "کپتان گڈے نے دُور دراز کا سفر کیا ہے اور بہت سے بہادری کے کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ ایک دفعہ اس کا جہاز سمندری طوفانوں میں پاش پاش ہو گیا۔"

بھالو نے کہا، "کپتان ایک مچھلی پر سوار ہو کر کنارے تک پہنچا۔"

مُنّی سی گڑیا بولی، "اور کپتان صاحب نے بہت سے لوگوں کو ڈوبنے سے بچایا۔ وہ بہت بہادر ہیں۔"

پتلی نے پوچھا "تمھیں یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟"

بھالو بولا، "کپتان گڈے نے خود ہمیں بتایا ہے۔ وہ سچ مچ بہت بہادر ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ وہ ہمارے ساتھ رہنے کے لیے کھلونا نگر میں آ گیا ہے۔"

کپتان گڈا بولا، "تم وہاں اس کونے میں جا کر کھڑی ہو جاؤ۔ میں ہر ایک کو بتاتا ہوں کہ اس کی جگہ کون سی ہے؟"

پُتلی بولی، "تمھارا بہت شکریہ۔ مجھے یہ کونا پسند ہے اور میں یہیں رہوں گی۔"

جہاں پتلی کھڑی تھی۔ وہ کپتان گڈے کی جگہ تھی۔ وہ بہت غصّے ہوا۔ اس نے پتلی کو دھکا دے کر گرا دیا، لیکن پتلی فوراً کھڑی ہو گئی۔ کپتان گڈا اسے دھکا دے کر گرا دیتا، لیکن پتلی پھر کھڑی ہو جاتی۔

پتلی بولی، "سو سنار کی تو ایک لوہار کی۔"

یہ کہہ کر پتلی نے کپتان گڈے کے سر پر ایسا ہاتھ مارا کہ وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ کپتان گڈے کے ساتھی اس کی حمایت میں کھڑے ہو گئے۔ لکڑی کی پتلی سمجھ گئی کہ اب کچھ کہنا سُننا بے کار ہے۔

کپتان گڈا پھر کوئی کہانی سنانے لگا۔ سب کھلونے بہت دل چسپی سے اس کی کہانی سننے میں مصروف ہو گئے۔ کپتان گڈا بتا رہا تھا، "میں کوئی بھی جہاز چلا سکتا ہوں۔ اگر کوئی پانی میں ڈوب رہا ہو تو میں اپنی جان کی پروا کیے بغیر سمندر میں چھلانگ لگا دیتا ہوں۔"

بے چاری پتلی خاموش کھڑی رہی۔ وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ یہ کپتان تو بے حد جھوٹا، گپ

پتلی نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔

باز اور مکار ہے، لیکن کپتان کے خوشامدی دوستوں کی موجودگی میں، میں کچھ بھی تو نہیں کر سکتی۔

لکڑی کی پتلی بہت نیک دل تھی۔ جب کسی کو ضرورت پیش آتی وہ فوراً مدد کے لیے تیار ہو جاتی۔ وہ ہمیشہ اچھی اچھی باتیں کرتی۔ تھوڑے ہی دنوں میں سب کھلونے اسے پسند کرنے لگے۔ ایک دن سب کھلونے سیر و تفریح کے لیے گئے۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ اچانک ایک جھونکا آیا اور کپتان گڈے کی ٹوپی ہوا میں اُڑ گئی۔ ٹوپی لڑھکتی ہوئی سبدھی تالاب کی طرف جا رہی تھی۔

کپتان گڈا چلّانے لگا، "ارے میری ٹوپی۔ ارے میری ٹوپی۔ بھالو تم دوڑ کر اسے پکڑ لو۔"

بھالو اور ننھی منّی سی گڑیا ٹوپی کے پیچھے دوڑے۔ ٹوپی تیزی سے لڑھکتی ہوئی تالاب میں جا گری۔ کپتان گڈا چیخنے لگا، "ارے بھالو، تم چھلانگ لگا دو اور تیرتے ہوئے میری ٹوپی کو لے آؤ۔"

بھالو گہرے پانی میں چھلانگ لگانے سے ہچکچا رہا تھا۔ کپتان گڈا بولا، "بے وقوفوں کی طرح میرا منھ کیا دیکھ رہے ہو؟ جلدی سے پانی میں چھلانگ مارو اور میری ٹوپی لے کر آؤ۔"

کالٹھ کی پتلی بولی، "تم خود کیوں نہیں پانی میں کُود جاتے؟ پھر تم کپتان بھی تو ہو اور تیرنا بھی خوب جانتے ہو۔"

ننھی مُنّی گڑیا بہت عقل مند تھی۔ وہ ایک لمبی سی چھڑی لے آئی اور جُھک کر ٹڈپی کو پکڑنے لگی۔ بد قسمتی سے اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ غڑاپ سے پانی میں جا گری۔ "مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ میں ڈوبی جا رہی ہوں۔"

سب کھلونوں نے کپتان کی طرف پُر امید نظروں سے دیکھا۔ وہ کپتان کو بہت بہادر، دلیر اور ہمت والا سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کپتان اپنی جان کی پروا کیے بغیر پانی میں چھلانگ لگا دے گا اور ڈوبتی ہوئی گڑیا کی جان بچا کر اسے کنارے پر لے آئے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بھالو چیخ کر بولا، "دیر مت کرو، ورنہ ننھی گڑیا پانی میں ڈوب جائے گی۔"

کپتان ٹس سے مس نہ ہوا۔ تب بھالو نے کپتان گڈے کا کالر پکڑا اور اسے کھینچنے لگا۔ کپتان گڈے کی ڈر کے مارے گھگھی بندھ گئی۔

وہ ہکلاتے ہوئے بولا، "نہ، نہ۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں تیرنا نہیں جانتا۔"

گلابی کوٹ والی گڑیا بولی، "الماری سے کشتی نکال لو اور اسے چلاتے ہوئے بے بی گڑیا کے پاس پہنچ جاؤ۔ جلدی کرو، جلدی۔"

گڈا کپتان ہکلاتے ہوئے بولا، "میں۔ میں۔ میں ک ک ک کشتی نہیں چلا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ میں پانی میں ڈوب جاؤں۔ میں نہ تو کشتی چلانا جانتا ہوں اور نہ مجھے تیرنا آتا ہے۔"

پتلی بولی، "کچھ تو کرو۔ بے چاری بے بی گڑیا اب ڈوبنے ہی والی ہے۔"

کپتان گڈا پیچھے مڑا اور دوڑنے لگا۔

پتلی نفرت سے بولی، "بزدل، شیخی خورا، گپ باز۔"

پتلی نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور تیرتی ہوئی ننھی مُنّی گڑیا کے پاس پہنچی۔ وہ بولی، "جلدی سے میری کمر پکڑ لو۔ میں لکڑی کی بنی ہوئی ہوں اس لیے ڈوب نہیں سکتی۔ تم میرے ساتھ ساتھ تیرتی ہوئی کنارے پر پہنچ سکتی ہو۔"

بے بی گڑیا نے پتلی کی بات پر عمل کیا اور وہ تیرتی ہوئی تالاب سے باہر آ گئی۔ سب کھلونوں نے پتلی کی بہادری اور ہمت کی تعریف کی۔ بے بی گڑیا تو بار بار پتلی کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔

گلابی کوٹ والی گڑیا بولی، "بہادر اور دلیر گڈیا۔ تم سچ مچ بہت عظیم ہو۔"
پتلی اپنے گیلے بالوں کو جھٹک کر بولی، "ابھی کچھ دیر پہلے تم سب لوگ کپتان گڈے کی خوشامد اور چاپلوسی میں مصروف تھے۔"
گلابی کوٹ والی گڑیا بولی، "وہ نرا شیخی خورا اور گپ باز تھا۔ وہ بہادری کے جھوٹے قصے سُنایا کرتا تھا۔ تم نے تو سچ مچ ایک کارنامہ کر کے دکھا دیا ہے۔"
سب کھلونوں نے مل جُل کر لکڑی کی پتلی کو اپنی ملکہ بنا لیا۔
اب کپتان گڈے کی سُنیے۔ وہ شرم کے مارے اپنا منھ چھپائے چھپائے پھر رہا تھا۔ پتلی اُس کے پاس پہنچی اور بولی، "میں تمھارا مذاق نہیں اُڑاؤں گی۔ تم نے اپنی بہادری کے جھوٹے قصے سُنا سُنا کر اپنا رعب جما رکھا تھا۔ اب حقیقت ظاہر ہو جانے کے بعد سب کھلونے تم سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ اب اگر تم ان سے دوستی چاہتے ہو تو اپنی بُری عادتیں چھوڑ کر نیک عادتیں اختیار کرو۔ اس طرح منھ چھپائے چھپائے پھرنے سے بہتر ہے کہ تم کوئی بہادری کا کارنامہ سر انجام دے دو۔"
کپتان بولا، "بالکل ٹھیک، میں وعدہ کرتا ہوں۔"
اب کپتان گڈا اس انتظار میں ہے کہ اگر موقع ملے تو وہ سب کھلونوں پر اپنی بہادری ثابت کر دے۔
ایک دن پریا کچھ خریدنے کے لیے بازار گئی۔ راستے میں گھٹا چھا گئی اور بوندا باندی ہونے لگی۔ پریا بانو کے کپڑے بارش میں بھیگنے لگے اور وہ بارش سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگی۔ اتفاق سے بونا مسخرا بھی اُدھر آ نکلا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی سبز چھتری تھی۔ اس سے پریا کی پریشانی دیکھی نہ گئی۔ اس نے اپنی چھتری پریا کو دے دی۔
پریا بولی، "تمھاری مہربانی کا بہت بہت شکریہ۔ بھائی بونے تم گھر کیسے پہنچو گے؟"
بونا بولا، "ارے تم میری فکر نہ کرو، میں بہت تیز دوڑتا ہوں، یوں چٹکی بجاتے میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ اب تم جلدی سے یہ چھتری لے کر گھر جاؤ تم اسے کل واپس کر دینا۔"
یہ کہتے ہی بونا تیزی سے بھاگا۔ پریا چھتری لے کر گھر پہنچی۔ اس کا میاں، کپتان گڈا بہت بے چینی سے پریا کا انتظار کر رہا تھا۔

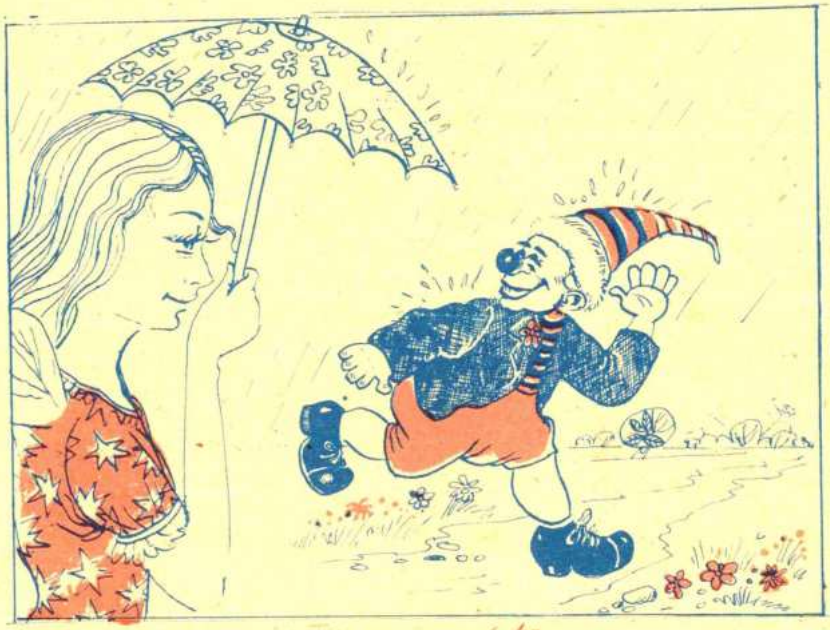

"تم فکر نہ کرو، میں بہت تیز دوڑتا ہوں۔"

وہ چھتری دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بولا، "واہ وا، کتنی پیاری چھتری ہے۔ تم نے یہ کہاں سے لی ہے؟"

پریا بولی، "یہ چھتری مجھے بونے گڈے نے دی ہے۔ میں اسے کل واپس کر دوں گی۔"

اگلے دن پریا بونے گڈے کے گھر پہنچی۔ گھر کا دروازہ بند تھا۔ پریا سمجھی کہ بونا گڈا ابھی تک سو رہا ہے۔ اس نے بونے کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ اس لیے پریا چھتری کو دروازے کے پاس رکھ کر واپس چلی گئی۔

اس دن پریا اور کپتان نے بونے گڈے کو نہیں دیکھا۔ اگلے دن بھی انھوں نے بونے گڈے کو نہیں دیکھا تو انھیں بھی تشویش ہوئی۔ پریا گڈی بولی، "میں بونے کی خیریت معلوم کرنے جا رہی ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

پریا اور کپتان دونوں بونے کے مکان پر پہنچے اور زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ اندر سے کسی نے بہت دھیمی اور کم زور آواز میں کہا،

"دروازہ کھلا ہے۔ اندر چلے آیئے۔"

وہ دونوں اندر پہنچے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ بونا مسخرا بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ وہ بہت کم زور اور بیمار نظر آ رہا تھا۔ پریا نے پوچھا، "تمھاری طبیعت کیسی ہے؟"

بونا بہت آہستہ سے بولا، "پرسوں میں بارش میں بھیگ گیا تھا۔ اس لیے سردی لگنے لگی۔ میں گرم گرم چائے پی کر بستر پر لیٹ گیا اور کمبل اوڑھ کر سو گیا۔ کل صبح میں بالکل بھلا چنگا تھا۔ میں نے بستر سے اُٹھنا چاہا، لیکن پتا نہیں کیا ہوا کہ میں اپنے اندر جا بی نہ بھر سکا۔ شاید میری چابی خراب ہو گئی ہے۔ ہائے میں اب کیا کروں؟"

بے چارہ بونا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کپتان نے سہارا دے کر بونے کو بٹھایا۔

پریا بولی، "تم بستر سے اُٹھ نہیں سکتے، اس لیے تم نے کل صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہو گا۔"

بونا سسکیاں لے کر بولا، "ہاں۔"

پریا بھاگی ہوئی باورچی خانے میں گئی۔ اس نے انڈوں کا آملیٹ بنایا۔ پھر وہ چائے بنانے لگی۔ ادھر کپتان بونے کو تسلی دیتا رہا۔ ایک چابی بونے کی کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ کپتان نے بونے کو چابی دینے کی بہت کوشش کی، لیکن نہ معلوم کیوں چابی نہ گھوم سکی۔

بونا بولا، "میں خود سیکڑوں بار کوشش کر چکا ہوں، لیکن چابی پوری طرح گھومتی ہی نہیں۔"

کپتان نے چابی باہر نکال کر غور سے دیکھی وہ بولا، "اوہو، دیکھو تو اس پر زنگ لگ گیا ہے۔"

بونا بولا، "ہو سکتا ہے کہ چابی پانی میں بھیگ گئی ہو۔ گیلے لوہے میں جلدی زنگ لگتا ہے۔ ہائے اب میں کیا کروں؟ کیا مجھے اب کبھی چابی نہ دی جا سکے گی؟ کیا میں ہمیشہ یوں ہی رہوں گا؟"

کپتان گڈا بولا، "کوئی فکر نہ کرو۔ میں تمھارے لیے دوسری چابی لے آؤں گا۔ یہ لو پریا تمھارے لیے چائے بنا لائی ہے۔"

پریا نے میز پر ناشتا لگا دیا۔ کپتان اور پریا نے بونے کو ناشتا کرنے میں مدد دی۔ بونا کئی وقت سے بھوکا تھا۔ جب وہ سیر ہو کر کھا چکا تو کپتان بولا، "اچھا دوست اب میں چلتا ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ مجھے دوسری چابی ضرور مل جائے گی۔"

کپتان اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ بونا بہت رحم دل ہے۔ اس نے اپنی چھتری پریا کو دے دی اور خود بارش میں بھیگتا رہا۔ اس لیے اس کی چابی میں زنگ لگ گیا۔ میں اس نیک دل بونے کی مدد ضرور کروں گا۔ کپتان ایک پولیس والے کے پاس پہنچا۔ اس نے کہا، "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کھلونوں کی چابیاں کہاں ملتی ہیں؟"

پولیس والے نے کہا، "تم تھانے میں جا کر معلوم کرو۔ لوگ گری پڑی چابیوں کو تھانے میں جمع کروا دیتے ہیں۔ اگر کسی چابی کا مالک نہ ملے تو اسے ایک بہت بڑے صندوق میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اگر کسی کھلونے کو نئی چابی کی ضرورت ہو تو وہ ان چابیوں میں سے لے سکتا ہے۔"

کپتان تھانے پہنچا۔ اس نے ایک موٹے سے پولیس والے کو دیکھا جو اپنا ہاتھ اوپر نیچے ہلا رہا تھا۔ کپتان نے پوچھا، "تم یہ کیا کر رہے ہو؟"

پولیس والا بولا، "میں گاڑیوں کو رُکنے یا چلنے کا اشارہ دیتا ہوں۔ جب تک میری چابی

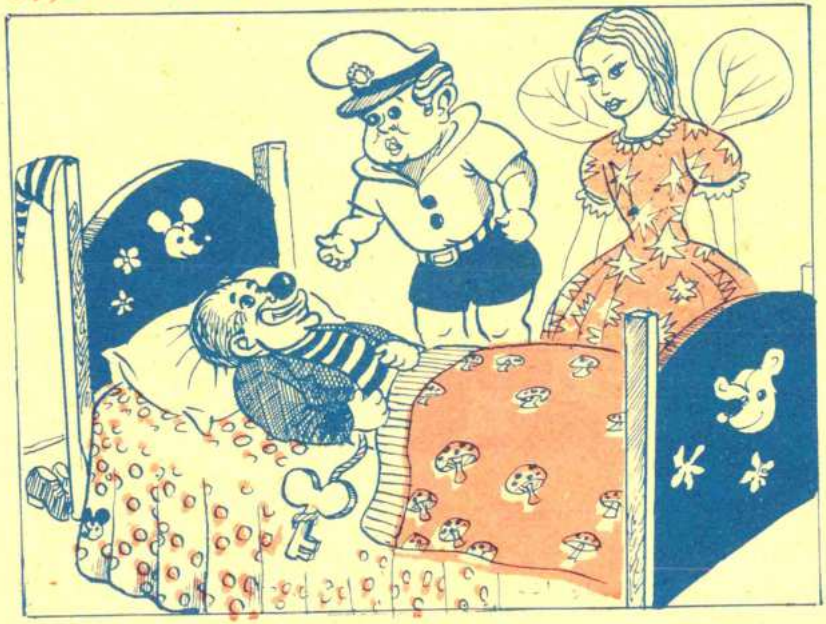

بونا مسخرا بستر پر لیٹا بہت کم زور نظر آ رہا تھا۔

ختم نہیں ہو گی میں اپنا ہاتھ یوں ہی ہلاتا رہوں گا۔ تم ذرا ایک دو منٹ انتظار کرو۔ میری چابی ختم ہونے ہی والی ہے۔"

جب پولیس والے نے ہاتھ ہلانا بند کر دیا تو کپتان نے اپنی جیب سے زنگ والی چابی نکالی اور بولا، "کیا تمھارے پاس کوئی اس طرح کی چابی ہو گی؟"

پولیس والے نے ایک بڑے صندوق کو کھولا۔ یہ چابیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے یہ چابیاں میز پر پھیلا دیں۔ کپتان نے ایک ایک چابی دیکھ ڈالی، لیکن اسے بوتے کی چابی جیسی کوئی چابی نہ مل سکی۔ پولیس والا بولا، "مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کو اپنی ضرورت کی چابی نہ مل سکی۔"

کپتان بولا، "یہ تو بہت بُرا ہوا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ بے چارا بوتا اب ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو کر رہ گیا۔"

پولیس والے نے کہا، "کوشش کرتے رہیے۔ خدا نے چاہا تو آپ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب

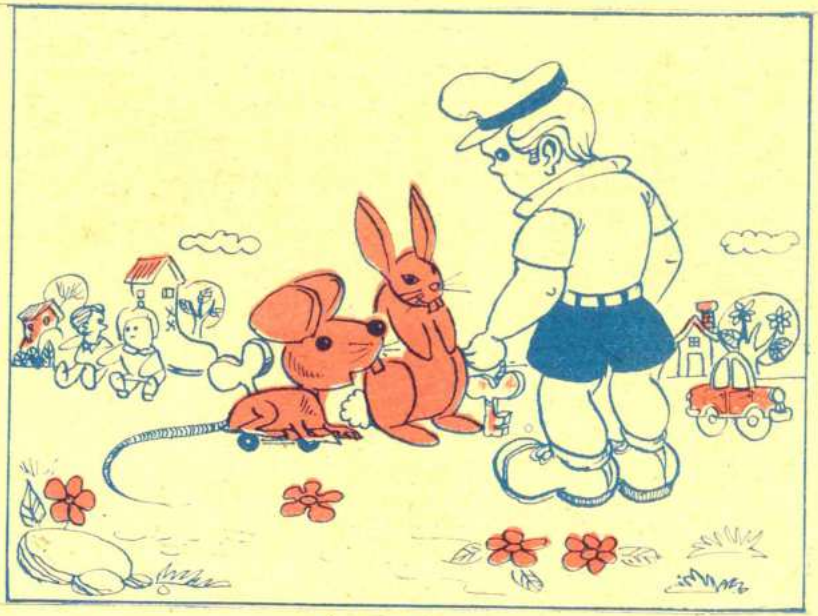

کپتان چوہا اور خرگوش سے جا ٹکرایا۔

ہو جائیں گے۔" کپتان پولیس تھانے سے باہر نکلا۔ وہ خیالوں میں کھویا ہوا چلا جا رہا تھا کہ بے خبری میں وہ چوں چوں چوہا اور فی چن خرگوش سے جا ٹکرایا۔

چوں چوں چوہے نے پوچھا، "بھیّا، کیا بات ہے؟ تم بہت پریشان نظر آتے ہو؟"

کپتان نے پوری بات سُنائی۔

چوں چوں چوہا بولا، "میرے ساتھ بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ میں بھی تھانے گیا اور وہاں کی چابیوں کو کھنگالا، لیکن مجھے کوئی چابی ٹھیک نہیں لگی۔"

"کپتان نے پوچھا، "پھر کیا ہوا؟"

فی چن خرگوش ہنس کر بولا، "آگے کی بات مجھ سے سنیے۔ میں ان صاحب زادے کو ایک گھڑی ساز کے پاس لے گیا۔ اتفاق سے ایک چابی انھیں ٹھیک لگ گئی۔ یہ چابی تھی ایک گھڑی کی، چناں چہ یہ ہر گھنٹے کے بعد گھڑی کی طرح ٹن ٹن کرتے ہیں۔ دو چار منٹ میں ان کا گھنٹہ بجنے ہی والا ہے۔"

وہ یہ بتا ہی رہا تھا کہ چوں چوں چوہے سے گھنٹہ بجنے کی آواز آنے لگی۔ ٹن ٹن۔ ٹن ٹن۔ ٹن ٹن۔ کپتان بولا، "میں بھی گھڑی ساز کے پاس جاؤں گا۔ شاید بونے کی چابی وہاں مل جائے۔"

چوں چوں چوہا اور فی چن خرگوش اسے اپنے ساتھ گھڑی ساز کی دُکان پر لے گئے۔ بونے کی چابی لمبوترے سی تھی۔ گھڑیوں کی چابیاں اس سے بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ کپتان بولا، "چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ کسی گھڑی کی چابی بونے کو نہیں لگ سکی۔ ورنہ وہ بھی ہر گھنٹے بعد ٹن ٹن ٹن کرتا۔" جب کپتان دُکان سے باہر نکلا تو وہ بہت پریشان اور رنجیدہ تھا۔ وہ سوچنے لگا، "اب کیا کروں؟ میں کس منھ سے بونے گڈے کو جا کر خبر سناؤں کہ اس کی چابی نہیں مل سکی اور اب وہ ہمیشہ مفلوج بنا رہے گا۔"

اس نے خرگوش اور چوہے کو اللہ حافظ کہا اور اپنے گھر کی طرف چلا۔ راستے میں اسے لکڑی کے سپاہیوں کا سردار ملا۔ سردار نے اپنی تلوار ہلا کر کپتان کو خوش آمدید کہا۔ تلوار سورج کی روشنی میں چم چم چمک رہی تھی۔ سردار نے پوچھا، "دوست کیا بات ہے؟ تم بہت پریشان دکھائی دیتے ہو۔" کپتان نے سردار کو زنگ آلود چابی دکھائی اور بونے کے متعلق بتایا کہ اب وہ نہ چل پھر سکتا ہے اور نہ کوئی کام کاج کر سکتا ہے۔"

سردار نے کہا، "یہ کون سا مشکل کام ہے۔ لاؤ یہ چابی مجھے دو۔ میں اسے چٹکی بجاتے میں ٹھیک کروا دوں گا۔ تم یہاں ٹھیرو۔ میں ابھی دو منٹ میں واپس آتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ کپتان کچھ کہتا، سردار اس کے ہاتھ سے چابی لے کر قلعے کے اندر چلا گیا۔ اس نے چیخ کر کچھ حکم دیا۔ اِدھر کپتان اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ دیکھیے یہ لکڑی کا پُتلا چابی کو ٹھیک کر سکتا ہے یا نہیں؟

سردار ایک منٹ کے بعد ہی قلعے سے باہر نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں بونے کی چابی تھی۔ لیکن کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی پرانی چابی ہے؟ یہ تو چاندی کی طرح چمک رہی تھی چم چم چم۔

سردار نے کپتان کو چابی تھما کر کہا، "یہ لو، یہ رہی تمھاری چابی میرے سپاہی ہر روز میری تلوار چمکاتے ہیں، اسی لیے اس میں زنگ نہیں لگتا۔ اس کے علاوہ وہ ہر روز اپنی بندوقیں اور بٹن بھی چمکاتے ہیں، اس لیے میرے سپاہیوں کے لیے اس چابی کا زنگ دُور کرنا اور اسے چمکانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ امید ہے کہ اب تم بونے میں چابی بھر سکو گے۔"

کپتان نے سردار کا شکریہ ادا کیا اور تیزی سے دوڑتا ہوا بونے کے گھر کی طرف چلا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے اسے پَر لگ گئے ہوں۔ آخر وہ بونے کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے اس زور سے دروازہ کھولا کہ بونا بھی گھبرا گیا۔ کپتان نے چمکتی ہوئی چابی بونے کے سوراخ میں داخل کی اور اسے گھمانے لگا۔ گھر رر رر..... گھر رر رر.....

اس نے بہت آسانی سے بونے میں چابی بھر دی۔ بونا چھلانگ مار کر بستر سے اُترا اور کمرے میں ناچنے کُودنے اور قلابازیاں کھانے لگا۔ اس کی دل چسپ حرکتیں دیکھ کر کپتان اور پریا ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ بونے نے پوچھا، "تم نے یہ نئی چابی کہاں سے حاصل کی؟"

کپتان بولا، "یہ چابی نئی نہیں ہے، یہ تو وہی پرانی چابی ہے۔"

پھر اس نے شروع سے آخر تک ساری بات بتائی۔ بونے کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ وہ بولا، "سردار کتنا نیک دل ہے۔ میں ابھی جا کر اس کا شکریہ ادا کروں گا۔"

وہ تیزی سے دوڑتا ہوا سردار کے پاس پہنچا۔ سردار اپنے فوجیوں کو پریڈ کروا رہا تھا۔ بونا سپاہیوں سے ٹکراتا اور انھیں گراتا ہوا سردار کے پاس پہنچا اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ سردار اور اس کے سپاہی بونے گڈرے کو چلتا پھرتا دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

پھل صحّت کے لیے ضروری ہیں

ڈاکٹر سیّد اسلم ایف۔آر۔سی۔ایس

پھل غذا کا اور خصوصاً مقویات (جن میں حیاتین اور دھاتیں شامل ہیں) حاصل کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے اور ان کی قدرتی شیرینی قدرت کے فیاض ہاتھوں سے فطری تناسب سے ڈالی گئی ہے اور یہ شیرینی اسی لیے زود ہضم بھی ہے اور انسان کو پوری طرح راس بھی آتی ہے، بہ نسبت شکر کی بنی ہوئی مٹھائیوں کے، جو سراسر بیماری ہیں۔ پھل کھانے میں جو لطف ہے اس کی ابتدا لب و دندان سے ہوتی ہے کہ جب ان پھلوں میں دانت گڑتے ہیں تو دانتوں کو جِلا اور مسوڑوں میں نمو ہوتی ہے، پھر لذّتِ کام و دہن ہے اور اس کے بعد جب رگ و پے میں سرایت کرتی ہے تو تر و تازگی آتی ہے۔ ایک اضافی فائدہ ان کی قبض کشائی ہے کہ بعض لوگوں کے لیے اس میں بھی بڑی راحت ہے۔

کچھ پھلوں کے انفرادی فوائد ہیں مثلاً لیموں، نارنگی، سنگترہ اور چکوترے کا رس حیاتین اور دھاتوں سے بھرپور ہے، خصوصاً حیاتین سی ان میں وافر ہوتی ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ماضی میں جن جہازوں کے مسافروں کو تازہ رس والے پھل نہیں ملتے تھے، ان کے مسوڑوں سے خون رہتا تھا، ہڈیوں میں درد ہوتا تھا اور آج کل بھی وہ بوڑھے یا تنہا رہنے والے (جن کی مغرب میں اکثریت ہے) اگر ڈبوں کی غذاؤں پر گزارا کریں اور ان کو تازہ پھل اور سبزیاں نہیں ملیں تو حیاتین سی کی کمی ہو کر ان کو بھی یہی شکایت ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان رس والے متذکرہ بالا پھلوں کے گودے میں حیاتین بی ہوتی ہے جو رگوں کے نشوونما میں حصّہ لیتی ہے۔ یہ دل چسپ حقیقت ہے کہ امریکا میں پچھلے دس سال میں جس قدر حیاتین سی کا استعمال بڑھا ہے اسی قدر دل کے امراض میں کمی ہوئی ہے۔ اس حیاتین کی اچھی خاصی مقدار سبز مرچ میں بھی ہوتی ہے۔ حیاتین سی سے دانتوں کو جِلا اور قوّت ملے گی اور ان لوگوں کو بھی فائدہ ہوگا جو ہر وقت جسم میں درد کی شکایت کرتے رہتے ہیں اور جن کو مسواک کے بعد منھ سے خون آتا ہے۔ فولاد، خوبانی، کھجور، انجیر، آڑو اور کشمش میں ہوتا ہے۔ حیاتین بی ناشپاتی، کیلا، نارنگی

کی طرح کے رس دار پھلوں اور زیتون میں ہوتی ہے۔ کیلسیم انجیر میں ہوتا ہے۔ پوٹاشیم لیموں، خربوزہ، زیتون اور نارنگی کی جنس میں ہوتا ہے۔ پوٹاشیم والی غذا دل کے ان مریضوں کے لیے ضروری ہے جو پیشاب آور دوا استعمال کرتے ہیں۔

بعض خاص خاص تکلیفوں کے لیے پھل بے انتہا مفید ہیں، خصوصاً قبض کے لیے اور اس مقصد کے لیے ہر قسم کا پھل فائدہ مند ہے، خصوصاً پپیتا، انجیر، امرود، سیب، ناشپاتی، آڑو، شہتوت، خوبانی، انگور اور منقع، چوں کہ پھلوں میں پانی کی مقدار کثیر ہوتی ہے اور ان کا فضلہ بنتا ہے اس لیے ان کا اثر ملیّن ہے۔ مشہور ہے کہ پرانے زمانے میں فرانس کے لوگوں کو جب قبض ستاتا تھا تو وہ انگور کے باغوں میں جاکر دل کھول کر انگور کھاتے تھے، جس سے ان کا قبض رفع ہو جاتا تھا۔ بعض پھل احتیاط سے کھانے چاہییں۔ اگر کسی کا وزن زیادہ ہے تو جو پھل زیادہ میٹھے ہیں وہ وزن کو بڑھا دیں گے، مثلاً آم، انگور، کیلا، کھجور، چیکو اور شریفہ۔ اسی طرح جن کو شکر کی بیماری ہے ان کو بھی ان پھلوں سے احتیاط لازم ہے، گو طبیب کے مشورے اور اندازے سے ان پھلوں کی کوئی قاش کھائی جا سکتی ہے، لیکن پھر اس حساب سے دوسری نشاستہ دار غذا یعنی روٹی چاول کو کم کر دیا جائے۔ ترش پھلوں کو اگر کھانے سے قبل کھایا جائے مثلاً جنس نارنگی کو تو بھوک بڑھتی ہے اور کھانے کے بعد کھایا جائے تو منھ اور دانتوں کی صفائی ہو جاتی ہے۔ پھلوں کو کاٹ کر زیادہ دیر تک کھُلا رکھنا مناسب نہیں ہے، بلکہ کاٹنے کے فوراً بعد ہی کھا لیا جائے۔ اگر ٹھنڈا کرنا مقصود ہے تو سالم حالت میں ٹھنڈا کر لیا جائے۔ تربوز کھانے کے بعد جو اکثر بدہضمی کی وارداتیں ہوتی ہیں اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زیادہ عرصے تک کھُلا رہا ہے۔ بہتر ہے کہ سارا خاندان ساتھ بیٹھ کر اس کو ختم کر لے۔ کھانے کے بعد زیادہ مقدار میں پھل کھانے سے نفخ (اپھارہ) ہو سکتا ہے۔ اس لیے غذا اور پھلوں کو مختلف اوقات میں کھانا بھی اچھی بات ہے اور ان کے ساتھ فوراً پانی نہ پیا جائے بلکہ دو گھنٹے بعد پینا چاہیے۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ پھل ضرور کھائے جائیں، چاہے وہ ناشپاتی یا پھیکے خربوزے ہی کیوں نہ ہوں۔

منّے ۔ مجھے بتاؤ وہ لڑکا کون ہے جس نے تمھاری ٹانگیں توڑنے کی دھمکی دی ہے۔
امّی! وہ تو مجھے بڑے زور کی دھمکی دیتا، مگر میں نے اس کا موقع نہیں دیا۔ یہ دیکھیے اس کی جرسی!

ماشاء اللہ تم صحت مند ہو۔ میرے گھر کی صفائی کر دیا کرو ......
نہیں بیگم صاحبہ، میں جیب کی صفائی کرنے کی سزا بھگت چکا ہوں، اب گھر کی صفائی میں کیا ملے گا؟

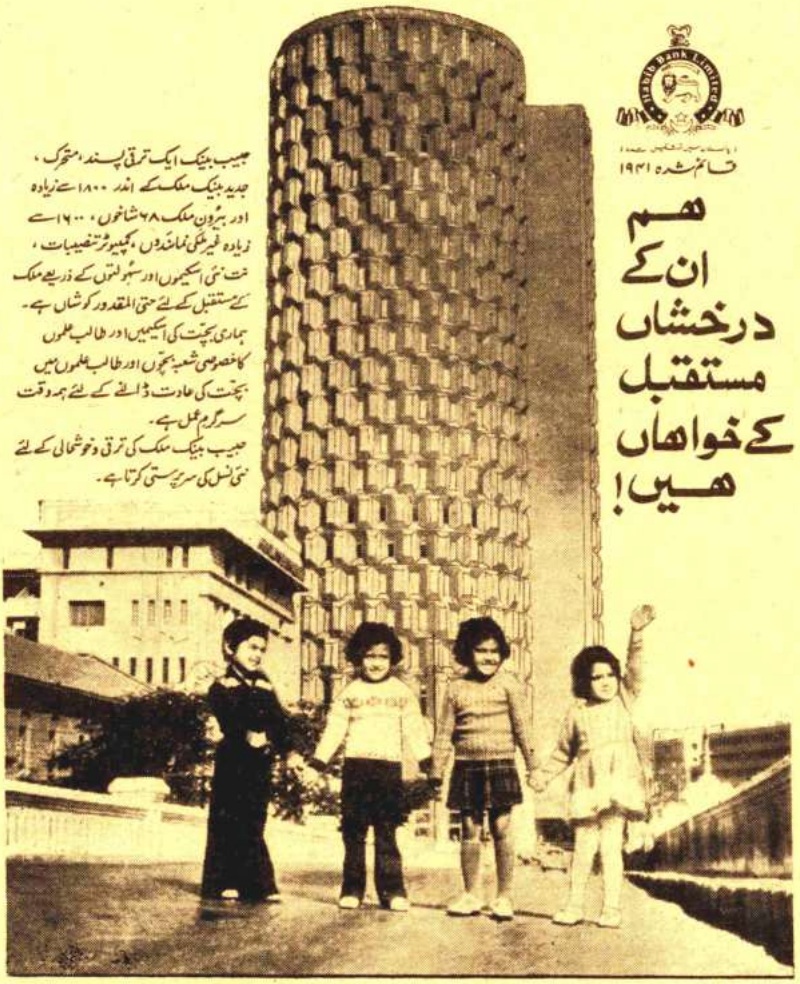

Habib Bank Limited
قائم شدہ ۱۹۴۱
ہم
ان کے
درخشاں
مستقبل
کے خواہاں
ہیں!
حبیب بینک ایک ترقی پسند، متحرک،
جدید بینک ملک کے اندر ۱۸۰۰ سے زیادہ
اور بیرونِ ملک ۶۸ شاخوں، ۱۶۰۰ سے
زیادہ غیر ملکی نمائندوں، کمپیوٹر تنصیبات،
نت نئی اسکیموں اور سہولتوں کے ذریعے ملک
کے مستقبل کے لئے حتی المقدور کوشاں ہے۔
ہماری بچت کی اسکیمیں اور طالب علموں
کا خصوصی شعبہ بچوں اور طالب علموں میں
بچت کی عادت ڈالنے کے لئے ہمہ وقت
سرگرم عمل ہے۔
حبیب بینک ملک کی ترقی و خوشحالی کے لئے
نئی نسل کی سرپرستی کرتا ہے۔
حبیب بینک لمیٹڈ
PID (I)/HBL/80/ 1 U
manhattan international

یادداشت کم زور ہے

س : عمر ۱۳ سال ہے۔ میں پڑھنے میں بہت کم زور ہوں، جو یاد کرتی ہوں کچھ دیر بعد بھول جاتی ہوں۔ میں درجہ نہم کی طالبہ ہوں۔ غزالہ کیفی، کراچی

ج : اللہ تعالیٰ ہماری غزالہ بیٹی کا ذہن تیز کرے۔ زیادہ پریشان نہ ہو بس پڑھنے پر زیادہ توجہ دو۔ یہ جان لو کہ علم انسان کا اور عورت کا سب سے بڑا زیور ہے۔ جس دن یہ نکتہ سمجھ میں آجائے گا شوق میں اضافہ خود بہ خود ہو جائے گا۔ پھر بھولنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ میرا حال تو یہ ہے کہ میں بڑی کوشش کر کے چیزوں کو بھولنا چاہتا ہوں، کیوں کہ مجھے اپنے ذہن میں اچھی اچھی باتیں جمع کرنی پڑتی ہیں۔

آنکھوں کے سامنے اندھیرا

س : عمر ۱۵ سال۔ میں جب بیٹھ کر اُٹھتا ہوں تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔
سید غلام عباس شاہ ہمدرد چاندنی، واں بھچراں

ج : یہ کم زوری کا واضح اظہار ہے۔ دماغ کی طرف خون کے دوران کی کمی کا اشارہ ہے۔ مطلب یہ بھی ہے کہ انسان اپنے ہاتھوں اپنی صحت کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس وارننگ کو سمجھنا چاہیے اور اپنی صحت کی حفاظت کا فیصلہ کرنا چاہیے اور یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا میں فقط صحت ہی ایک ایسی چیز ہے جسے رُپے پیسے سے نہیں خریدا جا سکتا۔ صحت انسان کے ضمیر سے بھی بلند و بالا چیز ہے۔ ضمیر فروشی تو ممکن ہے۔ کتنے ہی لوگ اپنے ضمیر فروخت کر کے بہ ظاہر

مالا مال ہیں، مگر صحت کا بازار نہیں لگ سکتا۔

سینے میں درد

س: عمر ۱۵ سال ہے۔ جب میں کچھ دُور دوڑتا ہوں تو میرے سینے میں شدّت کے ساتھ درد ہوتا ہے۔ محمد حسین شاد، ملتان

ج: آپ کو اپنے قلب کا معائنہ کرانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ قلب کی کوئی کواڑی (صمام) بند ہو یا وہاں کوئی غیر طبعی کیفیت، مثلاً پیدائشی سوراخ ہو۔ ویسے بھی دوڑنے کی مشق کو بھی آہستہ بڑھانا چاہیے اور یکایک کوئی سخت ورزش یا کھیل کھیلنا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

پیلے رنگ کا پیشاب اور نزلہ

س: عمر ۱۶ سال ہے۔ مجھے گزشتہ ۱۲ ماہ سے نزلہ رہتا ہے اور بہت گہرے پیلے رنگ کا پیشاب بھی آتا ہے۔ میں جسمانی کم زوری محسوس کرتا ہوں۔ ندیم، کراچی

ج: آپ کو زیادہ سے زیادہ پانی پینا چاہیے۔ جو لوگ پانی کم پیتے ہیں اُن کو بہت گہرے رنگ کا پیشاب بھی آتا ہے اور اُن کو نزلہ زکام بھی زیادہ ہو سکتا ہے۔ اعتدال سے انسان دنیا میں کامران ہوتا ہے۔

پیلے دانت اور پریشانی

س: میرے دانت بہت پیلے ہو رہے ہیں۔ ہر چند پیلاہٹ دُور کرنے کی کوشش کی، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہ شکایت تقریباً ہمارے سب گھر والوں کو ہے۔ عالیہ نزہت، سکھر

ج: ہو سکتا ہے کہ آپ کے دانتوں کا قدرتی رنگ زرد ہی ہو۔ اس میں پریشان ہونے کی آخر کیا بات ہے۔ ایک ہوتا ہے "سنونِ مجلّی"، کسی اچھے ہمدردِ انسان دواخانے سے لے لیں۔ یہ صندل کے بُرادے سے بنتا ہے اور صدف اس میں ہوتا ہے۔ اس سے دانت صاف ہو جاتے ہیں۔

زیادہ سوچنا اور سفید بال

س: کیا یہ صحیح ہے کہ زیادہ سوچنے سے بال سفید ہو جاتے ہیں۔ شبیر احمد قادری، اٹک

ج: یہ بات بالکل صحیح نہیں ہے۔ ہر شخص ہر وقت ضرور کچھ نہ کچھ سوچتا ہی رہتا ہے، مگر اس

کے بال کالے ہی رہتے ہیں۔ ہاں ایک بات ہے۔ جو انسان گہرائی میں جاکر سوچتا ہے اور ساتھ ہی اس کے دل و دماغ حالاتِ حاضرہ سے دُکھتے ہیں اور وہ ملک و ملّت کے مستقبل سے فکر مند ہوتا ہے اور رہتا ہے اُس کے بال سوچ سے ضرور سفید ہو سکتے ہیں۔ شدید خوف سے بال دِنوں میں سفید ہو جانے کی مثالیں بھی ملی ہیں۔

سوتے میں پسینہ

س: میرے بھانجے کی عمر ایک سال ہے۔ سوتے میں سَر میں بہت پسینہ آتا ہے۔ تکیہ بھیگ جاتا ہے۔ ویسے وہ صحت مند ہے۔ صدف محمود ڈار، فیصل آباد

ج: ایک چیز پر غور کر لینا چاہیے کہ بھانجے کے پیٹ میں کہیں کیڑے تو نہیں پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ اس کا ہاضمہ خراب ہو۔ ویسے شاید یہ کوئی سنگین مسئلہ نہیں ہے۔ پھر بھی اچھا ہے کہ کسی مقامی معالج سے مشورہ کر لیا جائے۔

ہارمونز کی کمی اور چھوٹا قد

س: کہا جاتا ہے کہ جسم میں قد بڑھانے والے خاص قسم کے ہارمونز پائے جاتے ہیں، جن کی کمی چھوٹے قد کا سبب بنتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر جسم میں قد بڑھانے والے ہارمونز کی کمی واقع ہو جائے تو اس کمی کو کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے؟ اشفاق خاں، کراچی

ج: کاسۂ سر میں ایک چھوٹا سا غُدّہ یا غدود (گلینڈ) ہے جو قد پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ غدّہ نخامیہ بڑا پیچیدہ ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا نظام افعال کیا ہے۔ اسی لیے مشورہ یہی دیا جاتا ہے کہ اس کے جاری و ساری فعل میں کوئی رُکاوٹ کھڑی نہ کی جائے۔ اس سے بڑے نقصانات کا دروازہ کُھل جاتا ہے، لہٰذا قناعت کی روش اختیار کرنی چاہیے۔ قد چھوٹا ہے تو اپنے علم و فکر سے اپنا قد بلند کرنا چاہیے۔

رنگین عینک اور ٹی وی

س: رنگین عینک لگا کر ٹی وی دیکھنے سے نقصان ہوتا ہے یا فائدہ؟

رئیس رحمت اللہ، خان پور

ج: میں تو ٹی وی دیکھنے کا قائل نہیں ہوں۔ بلاشبہ یہ سائنس کی بہترین ایجاد ہے، لیکن اس سے نکلنے والی شعاعیں بہرحال مضرِ صحت ہیں اور اس سے انسانی جسم کی متعدد تکلیفیں

پیدا ہو سکتی ہیں، ہوتی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ رنگین ٹی وی کی شعاعیں بلیک اینڈ وہائٹ سے زیادہ زور دار ہیں اور یہ شعاعیں اس قدر طاقت ور ہوتی ہیں کہ چار انچ موٹی دیوار میں داخل ہو کر پار ہو جاتی ہیں۔ اب ذرا غور کیجیے کہ جو لوگ ان کے مدِمقابل بیٹھتے ہیں ان کے جسم پر ان شعاعوں کا کیا اثر ہو رہا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ رنگین عینک ٹی وی سے نکلنے والی مضر شعاعوں کو نہیں روک سکتی۔ آپ کم سے کم ٹی وی سے ۱۰۔۱۲ فیٹ دُور بیٹھا کریں۔

چہرے پر دانے

س: میری عمر ۱۴ سال ہے۔ میرے چہرے پر دانے وغیرہ بہت نکلتے ہیں، جن کے داغ بعد میں چہرے پر رہ جاتے ہیں۔ اب میرے چہرے پر بہت سے داغ رونما ہو چکے ہیں۔ میرا رنگ سفید ہے، اس لیے یہ بہت بُرے لگتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا رنگ بالکل صاف ہو جائے۔

عبداللطیف شاہ، لاہور

ج: بالغ ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کے جسم میں تبدیلیاں قدرتی طور پر آتی ہیں۔ چہرے کے یہ دانے مہاسے اُن کا ایک مظہر ہیں۔ اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو اپنی غذا پر نظرِ ثانی کر لینی چاہیے اور گرم غذاؤں کو ترک کر کے ٹھنڈے مزاج کی چیزوں پر توجہ کرنی چاہیے۔ ایسے حالات میں اکثر و بیش تر دہی کی لسی مفید ہوتی ہے۔ ہر اگھیا (لوکی) کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا چاہیے۔ ہاں ہرے گھیے کا پانی ذرا سا دہی میں ملا کر چہرے کے نشانات پر لگانا چاہیے۔ اس سے یہ صاف ہو سکتے ہیں۔ وی۔ سی (وٹامن سی) بھی مفید ہوتا ہے۔ ۵۰۰ ملی گرام کی ایک ٹکیا روزانہ ۱۵۔۲۰ دن کھا لینی چاہیے۔

طب کی روشنی میں

سوالات بھیجنے والوں کے لیے

کالم طب کی روشنی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اندازہ آنے والے بے شمار خطوط سے ہو رہا ہے۔ اکثر نونہال اس قسم کے سوالات بھیج رہے ہیں جن کے جواب رسالے میں شائع نہیں کیے جا سکتے۔ ایسے نونہالوں کو چاہیے کہ وہ اپنا مکمل پتا ضرور لکھیں تاکہ انھیں خط کے ذریعہ سے ضروری مشورہ دیا جا سکے۔ مطب ہمدرد کے ماہر اطبا کسی معاوضے کے بغیر یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔ جو نونہال اپنے سوالات کے جلد جوابات چاہتے ہیں وہ بھی اپنا پتا ضرور لکھیں۔ اگر آپ رسالے میں جواب چاہتے ہیں تب بھی اپنا پتا ضرور لکھیے۔

دو پرانی چیزیں

مسعود احمد برکاتی

کوئی چیز جب پرانی ہو جاتی ہے تو دل سے اُتر جاتی ہے۔ یا تو ہم اُسے پھینک دیتے ہیں یا یونہی بے پروائی سے ڈال دیتے ہیں۔ یہ بات مادّی چیزوں کے بارے میں ہے، لیکن غیر مادّی چیزوں مثلاً کسی ہُنر یا فن کے لیے بھی یہ بات غلط نہیں ہے۔ بعض چیزیں کار آمد نہیں رہتیں تو لوگ اُن کو بھول جاتے ہیں۔ بعض ہُنر بھی کار آمد نہیں رہتے تو لوگ اُن کو سیکھنا چھوڑ دیتے ہیں، لیکن بعض ہُنر یا مشغلے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے فائدے باقی رہتے ہیں پھر بھی لوگ اُن کو بُھلا دیتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ فن یا ہُنر مفید تو ہیں، لیکن اُن کے بغیر بھی کام چل جاتا ہے۔ ایسی ہی دو پرانی چیزوں کو آج میں یاد دلانا چاہتا ہوں۔

یہ دونوں چیزیں مادّی نہیں ہیں، بلکہ ہُنر ہیں اور ان کا رواج آج بھی ہے بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ ہے بلکہ ان دونوں ہُنروں نے بڑی ترقی کی ہے اور آلات یا مشینوں سے بھی ان کی ترقی میں مدد ملنے لگی ہے، لیکن میں اُن کو پرانی یا بھولی ہوئی چیزوں میں اس لیے شمار کر رہا ہوں کہ پہلے کی طرح اب ان کا شوق نہیں رہا۔ اب ان ہُنروں کو لوگ صرف کمائی کے لیے سیکھتے ہیں، پہلے ان کو ذاتی شغلے اور ایک ذاتی خوبی کے طور پر بھی سیکھتے تھے۔

خوش نویس، خطّاط یا کاتب آج بھی ہیں اور بہت اچھا لکھنے والے ہیں۔ اُن کی قدر بھی بہت ہے اور قیمت بھی، یعنی وہ کما بھی خوب رہے ہیں، لیکن عام پڑھے لکھے آدمی کو اب خوش نویسی یا خوش خطی کا شوق نہیں رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب عام پڑھے لکھے آدمی کا خط اچھا نہیں رہا۔ زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ملے گی جن کو بدخط کہا جا سکتا ہے۔ پہلے ہر پڑھا لکھا آدمی نہیں تو اکثر تعلیم یافتہ لوگ خوش خط ہوتے تھے۔ خوش خطی کو خوبی سمجھا جاتا تھا اور یہ لازمی خوبی تھی۔ جس آدمی کا خط اچھا نہیں ہوتا تھا گویا اُس میں کوئی کمی یا کسر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بدخط آدمی دوسروں کے سامنے شرماتا تھا۔ خوش خطی ایک زیور کی طرح تھی کہ جس کے پاس ہے وہ دولت مند ہے اور خوش ہے۔

پہلے زمانے میں چھپائی اتنی عام نہیں تھی اور سستی بھی نہیں تھی۔ اس لیے کتابیں مشکل سے ملتی تھیں۔ بہت سے لوگ جن کو ان کی ضرورت کی کتاب میسّر نہیں آتی تھی یا وہ اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتے تھے وہ کسی سے کتاب مانگ کر اس کی نقل خود کر لیا کرتے تھے۔ ان کو لکھنے کی مشق بھی ہوتی تھی اور خط بھی اچھا ہوتا تھا۔ اس طرح ان کی مشق اور بڑھ جاتی تھی۔

آج بھی اس مفید مشغلے کو دوبارہ عام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر طالب علم کو اپنی فرصت کا تھوڑا سا وقت خوش خطی کی مشق کرنے کے لیے نکالنا چاہیے۔ یہ ایک ایسا ہنر ہے جس کو سیکھنے میں فائدہ ہی فائدہ ہے، نقصان کوئی نہیں ہے۔

دوسرا ہنر جلد بندی کا ہے۔ پرانے زمانے میں ہر پڑھا لکھا آدمی تو نہیں، لیکن اکثر لوگ اپنی کتابوں کی جلدیں خود ہی بنا لیا کرتے تھے، ٹوٹی ہوئی جلدوں کی مرمّت خود کر لیا کرتے تھے۔ وہ یہ کام کسی اسکول یا ٹریننگ سنٹر میں جا کر نہیں سیکھتے تھے بلکہ اپنے بڑوں کو دیکھ کر خود بھی اس کی نقل کرنے لگتے تھے اور کرتے کرتے اُن کو یہ ہُنر آجاتا تھا۔

اصل میں کتاب کی جلد بنانا کتاب سے محبّت کا ایک حصّہ ہے۔ جس آدمی کو کتاب سے محبّت ہوتی ہے وہ کتاب کو خراب خستہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ کہیں سے ورق پھٹ گیا تو وہ اس پر فوراً چپی لگا کر اس کو زیادہ پھٹنے سے بچانا چاہتا ہے۔ یہی چاہت اس کو کسی نہ کسی درجے میں جلد بندی کا ہُنر سکھا دیتی ہے اور وہ اپنی کتابوں کی جلدیں بنا بنا کر اُن کی عمریں بڑھا لیتا ہے۔ جلد کتاب کا لباس ہے۔ جس طرح لباس انسان کو موسم سے محفوظ رکھتا ہے اسی طرح جلد کتاب کی حفاظت کرتی ہے۔ آج کل جلد اتنی مہنگی بننے لگی ہے کہ اکثر جلد بنوانے کی ہمّت نہیں ہوتی۔ اگر نونہال مشغلے کے طور پر جلد بندی سیکھ لیں تو ان کو ایک مفید ہُنر آجائے گا۔ وہ اپنی کتابوں کی جلدیں بنانے کے علاوہ فرصت کے وقت میں دوسروں کی جلدیں بنا کر کچھ کما بھی سکتے ہیں۔

یہ دونوں ہنر نہایت مفید، شریفانہ اور باعزّت ہُنر ہیں۔ اگر نونہال روزانہ نہیں تو دوسرے تیسرے دن ہی کچھ وقت ان کو سیکھنے میں صرف کیا کریں تو کچھ عرصے میں ان کو خاصی مشق اور مہارت ہو جائے گی اور ان کی خوبیوں میں اضافہ ہو جائے گا۔

بچّہ اور مُرغا

عبدالغنی شمس

یہ ہے کتنا پیارا بچّہ
اپنی ماں کا دلارا بچّہ سب کی آنکھ کا تارا بچّہ
پورے گھر کا سہارا بچّہ
یہ ہے کتنا پیارا بچّہ
گورا گورا بھولا بھالا چاہت کی گودوں کا پالا
دل کی راحت گھر کا اُجالا
یہ ہے کتنا پیارا بچّہ
سرد ہوا کا جھونکا آیا ماں نے کوٹ اسے پہنایا
پیار کیا، سینے سے لگایا
یہ ہے کتنا پیارا بچّہ
کیسا ہے دل چسپ یہ منظر اک مرغے کو گود میں لے کر
بیٹھا ہے کمرے کے اندر
یہ ہے کتنا پیارا بچّہ
گھر سارا گلزار ہوا ہے پیار گلے کا ہار ہوا ہے
مرغا اس کا یار ہوا ہے
یہ ہے کتنا پیارا بچّہ
مرتے دم تک ساتھ نہ چھوٹے پیار کا بندھن کبھی نہ ٹوٹے
ڈھیروں اب یہ خوشیاں لوٹے
یہ ہے کتنا پیارا بچّہ

سُرمہ لگانا سنت ہے
اور فائدہ مند بھی
صدیوں کے آزمودہ

ہاشمی سُرمے • اچھے سُرمے

ہاشمی منجن

بلو لیبل
دانتوں کی تمام بیماریوں کیلئے

براؤن لیبل
دانتوں کی چمک اور حفاظت کیلئے

اوقات مطب صبح ۱۱ تا ۱ بجے۔ شام ۵ تا ۷ بجے

محمد ہاشم تاجر سُرمہ

عیدگاہ ایم۔ اے۔ جناح روڈ۔ کراچی فون:۔727860
قائم شدہ ۱۷۹۴ء

Maxell

سیّاروں کی دُنیا

سیّد ندیم یوسف

شام ہو رہی ہے۔ سورج مغرب میں ڈوب چکا ہے اور اب ہر طرف تاریکی چھا رہی ہے۔ ایسے میں اگر آج کل آپ آسمان کی جانب دیکھیں تو مغرب کی سمت میں کافی بلندی پر ایک نہایت چمک دار تارا آپ کی نگاہوں کا مرکز بن جائے گا۔ ذرا دیکھیے یہ کس قدر روشن ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک اور چاند نکل آیا ہے یا ایک روشن چراغ آسمان پر جھلملا رہا ہے۔ آپ سوچیں گے کہ وہ کیا چیز ہے۔ وہ بھی ایک دنیا ہے! ایک لمحے کے لیے سوچیے کہ اگر آپ وہاں پہنچ جائیں تو وہاں سے ہماری یہ اتنی بڑی دنیا بھی ایک چمک دار تارے جیسی نظر آئے گی۔ یہ چمکتا ہوا تارا ہمارا پڑوسی سیارہ زہرہ ہے جو تقریباً ہماری زمین کے جتنا بڑا ہے اور ہم سے ہزاروں یا لاکھوں نہیں بلکہ کئی کروڑ کیلو میٹر دُور ہے۔

جس طرح ہماری زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اسی طرح اور بھی دنیائیں ہیں جو سورج کے گرد گھومتی ہیں۔ یہ دنیائیں سیارے کہلاتی ہیں۔ زمین بھی ایک سیّارہ ہے۔ اس کے علاوہ آٹھ سیارے اور ہیں۔ اس طرح کل نو سیارے ہیں: عطارد، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری، زحل یورینس، نیپچون اور پلوٹو۔ یہ سب سیارے سورج سے مختلف فاصلوں پر رہتے ہوئے اپنے اپنے دائرے نما راستوں یا مداروں پر تیزی سے چلتے رہتے ہیں اور ایک مقررہ وقت پر سورج کے گرد ایک چکّر پورا کر لیتے ہیں۔ تمام سیّاروں اور سورج کو ملا کر "نظامِ شمسی" کہتے ہیں یعنی سورج

کا نظام۔ سیاروں کی اس حیرت انگیز دنیا میں ہمارے لیے بہت سی دل چسپیاں موجود ہیں۔

سورج، چاند اور تارے ہمیشہ سے ہی انسانوں کی نظروں کا مرکز بنے رہے ہیں۔ پرانے زمانے کا انسان بھی رات کے آسمان پر ستاروں کو بڑی دل چسپی سے دیکھا کرتا تھا، چوں کہ ستارے اپنی جگہ پر ساکن ہیں اور سیارے ہمیشہ حرکت کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے سیارے ستاروں بھرے آسمان پر اپنی جگہ بدلتے رہتے ہیں اور ایک خاص راستے پر چلتے رہتے ہیں۔ قدیم زمانے کے لوگوں نے بہت عرصے تک آسمان کا مشاہدہ کر کے اس حرکت کو محسوس کر لیا اور رفتہ رفتہ کئی سیارے دریافت کر لیے۔ پانچ سیارے عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل آج سے دو ہزار سال پہلے کے لوگوں کو بھی معلوم تھے، لیکن آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ قدیم زمانے کے لوگ زمین کو سیارہ نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ ہماری زمین ساری کائنات کا مرکز ہے اور سورج اور سارے تارے بھی چاند کی طرح زمین کے چاروں طرف گھومتے ہیں، لیکن یہ بات غلط تھی۔ آہستہ آہستہ سائنس دانوں نے بڑے غور و فکر کے بعد یہ پتا چلا لیا کہ سورج نظامِ شمسی کا مرکز ہے اور زمین بھی ایک سیارہ ہی ہے جو دوسرے سیاروں کے ساتھ سورج کے چاروں طرف چکر لگاتی ہے۔ اس سلسلے میں دو سائنس دانوں کوپرنیکس اور گلیلیو کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیارے کی حیثیت سے زمین کی دریافت صرف چار سو سال پہلے ہوئی ہے۔

نظامِ شمسی کا ساتواں سیارہ یورینس ۱۷۸۱ء میں سر ولیم ہرشل نے دریافت کیا۔ پھر ۱۸۴۶ء میں آٹھویں سیارے نیپچون کا پتا لگایا گیا۔ سب سے آخر میں نواں سیارہ پلوٹو موجودہ صدی میں ۱۹۳۰ء میں دریافت ہوا۔ پلوٹو کو پورے یقین سے نظامِ شمسی کی آخری حد نہیں کہہ سکتے۔ ممکن ہے کہ آنے والے زمانے میں کوئی دسواں سیارہ بھی تلاش کر لیا جائے۔

سورج ـــــ نظامِ شمسی کا سرپرست

سائنس داں کہتے ہیں کہ زمین اور دوسرے سیارے کئی ارب سال پہلے سورج سے پیدا ہوئے تھے۔ سورج بے انتہا گرم گیسوں کا ایک بہت بڑا گولا ہے۔ سورج سب سیاروں سے بہت بڑا ہے اور اس کی زبردست کشش کی قوت پورے نظامِ شمسی کو قائم رکھتی ہے اور

سارے سیاروں کو ان کے مقررہ راستوں پر چلاتی رہتی ہے۔ سورج ہی پورے نظام شمسی کے لیے روشنی اور حرارت کا منبع ہے۔ سیاروں کی اپنی کوئی روشنی نہیں بلکہ جب سورج کی روشنی ان پر پڑتی ہے تو وہ منعکس ہو کر چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سیاروں کے علاوہ ہمارے نظام شمسی میں لاکھوں دُم دار ستارے بھی موجود ہیں۔ ان کے علاوہ پتھروں کے بے شمار چھوٹے بڑے ٹکڑے خلا میں اِدھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں۔ مریخ اور مشتری کے درمیان خلا میں ہزاروں کی تعداد میں پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے سورج کے گرد گھومتے ہیں، جنھیں سیارچے کہتے ہیں۔ سب سے بڑا سیارچہ سیریس (CERES) ہے، جس کا قطر ایک ہزار کیلو میٹر ہے۔

خاص خاص باتیں

سیارے ہم سے بہت دُور ہیں اس لیے وہ آسمان پر چھوٹے چھوٹے چمک دار تاروں کی طرح نظر آتے ہیں۔ ہر سیارے کا سورج سے فاصلہ مختلف ہے۔ ہماری زمین سورج سے پندرہ کروڑ کیلو میٹر دُور ہے۔ عطارد اور زہرہ ہماری زمین سے پہلے ہیں اور وہ ساڑھے پانچ کروڑ اور پونے گیارہ کروڑ کیلو میٹر دُور ہیں۔ زمین کے بعد مریخ سورج سے ڈیڑھ گنا زیادہ دُور ہے۔ مشتری کا سورج سے فاصلہ اسّی کروڑ کیلو میٹر اور زحل کا ڈیڑھ ارب کیلو میٹر کے قریب ہے۔ پھر یورینس، نیپچون اور پلوٹو تو اس قدر زیادہ فاصلے پر ہیں کہ خالی آنکھ سے نظر ہی نہیں آتے۔ پلوٹو سورج سے چھے ارب کیلو میٹر دُور ہے۔ روشنی تین لاکھ کیلو میٹر فی سیکنڈ کی تیز رفتار سے سفر کرتی ہوئی سورج سے زمین تک صرف ساڑھے آٹھ منٹ میں پہنچ جاتی ہے، لیکن اسی روشنی کو پلوٹو تک پہنچنے میں ساڑھے پانچ گھنٹے لگ جاتے ہیں۔

سب سیارے بڑی تیزی سے حرکت کر رہے ہیں۔ ہمارے اپنے سیارے یعنی زمین کی رفتار تیس کیلو میٹر فی سیکنڈ ہے۔ ہماری یہ اتنی لمبی چوڑی دنیا ایک لاکھ کیلو میٹر فی گھنٹے سے بھی زیادہ رفتار سے اپنے مدار پر چلتے ہوئے سورج کے چاروں طرف گردش کر رہی ہے، لیکن چوں کہ ہم خود زمین پر ہیں اور یہ حرکت بالکل یکساں اور ہموار ہے اس لیے ہمیں زمین کی حرکت کا پتا نہیں چلتا۔ عطارد اور زہرہ ہماری زمین سے بھی زیادہ تیزی سے حرکت کر

رہے ہیں۔ مریخ، مشتری، زحل اور اس کے بعد کے سیارے ذرا کم رفتار سے چل رہے ہیں۔
نظام شمسی کا ہر سیارہ ایک خاص وقت پر سورج کے گرد ایک چکّر لگاتا ہے۔ عطارد صرف ۸۸ دنوں میں ایک چکّر مکمل کرتا ہے اور زہرہ ۲۲۵ دنوں میں۔ زمین کو سوا تین سو پینسٹھ دن لگتے ہیں، یعنی ایک سال اور مریخ کو تقریباً دو سال۔ جو سیارہ دُور ہو گا وہ ایک چکّر میں زیادہ

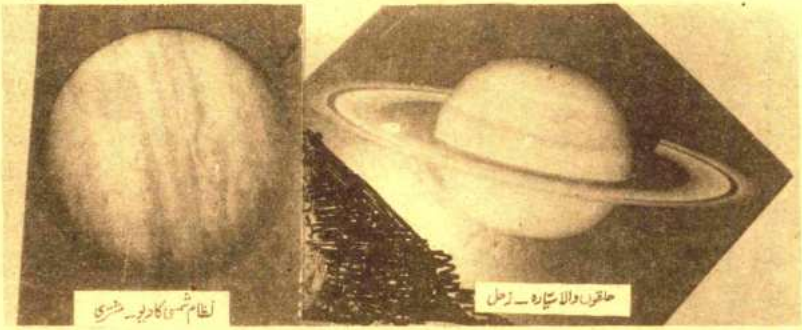

وقت لے گا۔ مشتری بارہ سال میں اور زحل ساڑھے انتیس سالوں کے بعد ایک چکّر لگاتے ہیں۔ یورینس کو چوراسی (۸۴) سال اور نپچون کو ایک سو چونسٹھ (۱۶۴) سال لگ جاتے ہیں۔ بے چارے پلوٹو کو تو ایک چکر لگانے میں ڈھائی سو سال لگ جاتے ہیں۔ ذرا غور کیجیے، پلوٹو ۱۹۳۰ء میں دریافت ہوا ہے۔ اس کے بعد سے ابھی تک اس کا چوتھائی چکّر بھی پورا نہیں ہوا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں پلوٹو جس مقام پر تھا، ۲۱۷۷ء یعنی آج سے تقریباً دو صدیوں کے بعد وہ ایک چکّر پورا کر کے پھر اسی مقام پر پہنچے گا۔

نظام شمسی کا دیو اور بونا

نظام شمسی کے تمام سیارے الگ الگ دنیائیں ہیں۔ ہر سیارہ اپنے اندر کچھ نہ کچھ دل چسپیاں رکھتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ نو میں سے چار سیارے عطارد، زہرہ، مریخ اور پلوٹو ہماری زمین سے چھوٹے ہیں اور چار سیارے مشتری، زحل، یورینس اور نپچون زمین سے بہت بڑے ہیں۔ نظام شمسی کا سب سے بڑا سیارہ مشتری ہے۔ یہ اتنا بڑا ہے کہ باقی سارے سیارے ایک طرف اور یہ اکیلا ایک طرف۔ مشتری کا قطر زمین سے گیارہ گنا زیادہ ہے اور جسامت (حجم) کے لحاظ

سے یہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں ہماری زمین جتنی بڑی تیرہ سو زمینیں آسکتی ہیں۔ مشتری کو ہم "نظام شمسی کا دیو" کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہ "دیو" ہم سے اتنے زیادہ دُور ہے کہ یہ صرف ایک بہت روشن تارے جیسا دکھائی دیتا ہے۔ سب سے چھوٹا سیارہ عطارد کو سمجھا جاتا ہے مگر حالیہ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ سب سے چھوٹا سیارہ پلوٹو ہے، جو ہمارے چاند سے بھی کچھ چھوٹا ہی ہے۔ اس طرح پلوٹو کو "نظام شمسی کا بونا" کہا جاسکتا ہے۔

سیارہ زحل ــــ خوب صورت اور دل چسپ

جسامت (سائز) کے لحاظ سے مشتری کے بعد زحل کا نمبر آتا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس سیارے کے گرد حلقے ہیں جن کی وجہ سے یہ سب سے خوب صورت سیارہ کہلاتا ہے۔ (صرف زحل ہی حلقوں والا سیارہ نہیں، حال ہی میں یورینس کے گرد بھی حلقے دریافت ہوئے ہیں!) زحل کے حلقے بڑے مشہور ہیں۔ انھیں پونے چار سو سال پہلے دریافت کیا گیا تھا۔ یہ حلقے اربوں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بنے ہیں اور ہر ٹکڑا ایک چاند کی طرح زحل کے گرد تیزی سے گھوم رہا ہے۔ ان ٹکڑوں کے درمیان کافی جگہ خالی ہے، مگر چوں کہ زحل ہم سے ڈیڑھ ارب کیلو میٹر دُور ہے اس لیے یہ ٹکڑے مل کر حلقوں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔

زحل ہماری زمین سے (۹۵) گنا بھاری ہے، لیکن اس کی جسامت اتنی زیادہ ہے کہ اس میں تقریباً سات سو پچاس زمینیں سما سکتی ہیں، یعنی زحل میں اس کی جسامت کے لحاظ سے مادّے کی مقدار کافی کم ہے۔ کمیت اور جسامت (حجم) کی نسبت کو "کثافت" کہتے ہیں۔ زحل کی کثافت تمام سیاروں سے کم ہے۔ اس کی کثافت صرف اعشاریہ سات (۰۷۰) ہے، جب کہ پانی کی کثافت ایک ہوتی ہے۔ اگر ایک اتنا بڑا سمندر ہوتا جس میں زحل کو ڈالا جا سکتا تو وہ ڈوبنے کے بجائے پانی پر تیرنے لگتا۔

سیاروں پر زندگی کے امکانات

ہمارے نظام شمسی میں زمین کے علاوہ کسی بھی سیارے پر انسان اور جانور وغیرہ موجود نہیں۔ عطارد اور زہرہ زمین سے قریب ہیں اور ان کا درجہ حرارت بھی زیادہ ہے۔ مریخ کا

درجۂ حرارت زمین سے کافی کم ہے اور اس کے بعد کے سیارے تو بالکل ٹھنڈک سے جمے ہوئے ہیں اور ان کا درجۂ حرارت صفر سے بہت نیچے ہے۔ عطارد کے سوا ہر سیارے کے گرد اپنی فضا ہے، مگر زمین کی طرح اوکسی جن کسی کے پاس نہیں! زمین کا کرۂ ہوائی نہایت عمدہ ہے اور یہاں کا درجۂ حرارت بالکل مناسب ہے۔ پھر یہاں پانی بھی موجود ہے۔ زمین پر جان داروں کے رہنے کے لیے بہترین ماحول ہے۔ جو کسی اور سیارے پر نہیں۔ زمین کے علاوہ تمام سیارے ویران دنیائیں ہیں جو زندگی کے وجود سے محروم ہیں۔

سیاروں سے زمین اور سورج کیسے نظر آتے ہیں

اگر ہم کسی اور سیارے پر پہنچ کر وہاں سے اپنی زمین کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے تو ایک بہت دل چسپ صورتِ حال سے واسطہ پڑتا۔ اگر ہم عطارد، زہرہ یا مریخ میں سے کسی پر جا سکتے تو وہاں سے ہمیں اپنی زمین دوسرے ستاروں کے درمیان ایک بہت چمک دار تارے جیسی نظر آتی اور ہمارا چاند ایک ننھے سے روشن نقطے کی طرح اس چمک دار تارے (یعنی زمین) کے چاروں طرف چلتا ہوا دکھائی دیتا۔ اگر ہم مشتری پر جا سکتے تو وہاں سے زمین ایک چھوٹے سے مدھم تارے کی طرح دکھائی دیتی اور ہمارا چاند تو بالکل نظر نہ آتا۔ زحل اور اس کے بعد کے سیاروں سے تو ہماری زمین بھی بالکل نظر نہیں آ سکتی، کیوں کہ وہ کئی ارب کیلو میٹر دور ہیں۔ ان سیاروں پر پہنچ کر ہمیں طاقت ور دُور بین لے کر اپنی زمین کو ڈھونڈنا پڑے گا۔

ایک اور بڑی دل چسپ بات سورج کی ظاہری جسامت ہے جو مختلف سیاروں سے نظر آتی ہے۔ عطارد سورج سے کافی قریب ہے۔ وہاں سے سورج ایک بہت بڑا گولا نظر آتا ہو گا۔ زہرہ سے بھی سورج کافی بڑا لگتا ہو گا۔ زمین کے بعد مریخ پر جائیں تو سورج کچھ چھوٹا نظر آنے لگے گا۔ مشتری اور زحل بہت دُور ہیں لہٰذا سورج وہاں بہت چھوٹا نظر آتا ہو گا۔ یورینس، نیپچون اور پلوٹو اور بھی دُور ہیں۔ وہاں سورج اتنا چھوٹا لگتا ہو گا کہ سورج کی گرمی بھی محسوس نہ ہوتی ہو گی! ذرا سوچیے پلوٹو ہماری زمین کے مقابلے میں سورج سے چالیس گنا زیادہ دُور ہے۔ وہاں سے ہمارا یہ سورج صرف ایک بہت بڑے روشن ستارے کی طرح دکھائی دیتا ہو گا۔

چاندوں کی کہانی

زمین کی طرح دوسرے سیاروں کے بھی اپنے اپنے چاند ہیں جو ان سیاروں کے چاروں طرف گھومتے ہیں۔ عطارد اور زہرہ کا ایک بھی چاند نہیں۔ زمین کا ایک چاند ہے، مریخ کے دو چھوٹے چھوٹے چاند ہیں اور اس کے بعد کے بڑے بڑے سیاروں کے بہت سے چاند ہیں۔

آپ نے چار چاند لگنے والا محاورہ ضرور سُنا ہوگا۔ ۱۶۰۹ء میں جب اطالوی سائنس داں گلیلیو نے اپنی بنائی ہوئی دُوربین کا رُخ سیارہ مشتری کی جانب کیا تو اس نے اس محاورے کو سچ مچ آسمان پر دیکھ لیا۔ اس نے مشتری کے گرد چار چاند دیکھے جو روشنی کے بالکل باریک نقطوں جیسے لگ رہے تھے۔ ہم بھی انھیں ایک چھوٹی دُوربین سے دیکھ سکتے ہیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ مشتری کے دو چاند تو سیارہ عطارد اور پلوٹو سے بھی بڑے ہیں، مگر بہت دُور ہونے کی وجہ سے یہ ہمیں خالی آنکھ سے نظر نہیں آتے۔

ان چار بڑے چاندوں کے علاوہ مشتری کے دس مزید چاند دریافت کر لیے گئے ہیں۔ مشتری ہمارے نظام شمسی کا ایک نمونہ ہے۔ اس کے چودہ چاند اس کے گرد اسی طرح گھوم رہے ہیں جیسے تو سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ اور نظام شمسی کا یہ "دیو" اپنے تمام چاندوں کو لیے ہوئے سورج کے چاروں طرف اپنے مدار پر رواں دواں ہے۔

زحل چاندوں کے معاملے میں سب سے آگے ہے۔ پہلے اس کے صرف نو چاند سمجھے جاتے تھے مگر اب ہمیں معلوم ہے کہ زحل کے چاندوں کی تعداد بیس کے قریب ہے۔ یہ چاند زحل کے حلقوں سے باہر مختلف فاصلوں پر رہتے ہوئے اس کے چاروں طرف گھومتے ہیں۔ زحل کا ایک چاند ٹی ٹان (TITAN) ہمارے نظام شمسی کا سب سے بڑا چاند ہے جو کہ عطارد اور پلوٹو سے بہت بڑا ہے۔ یہ واحد چاند ہے جس کے گرد اپنا گُرہ ہوائی بھی ہے۔

یورینس اور نیپچون بھی چاندوں سے محروم نہیں ہیں۔ ان کے بھی کئی چاند ہیں اور مزید چاند دریافت ہو رہے ہیں۔ پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ پلوٹو کا کوئی چاند نہیں مگر اب پلوٹو کا بھی ایک چاند دریافت کر لیا گیا ہے۔

نظامِ شمسی کا نظارہ

فرض کیجیے کہ آپ خلا میں ایک ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں سے آپ بہ یک وقت پورے نظام شمسی پر نظر رکھ سکتے ہیں۔ وہ دیکھیے درمیان میں سورج ہے اور اس سے مختلف فاصلوں پر نو دنیا ئیں۔ نو سیارے اپنے اپنے مداروں پر چل رہے ہیں۔ سیاروں کے چاند ان کے چاروں طرف تیزی سے گھوم رہے ہیں اور سیارے اپنے چاندوں کو لے کر سورج کے چاروں طرف پھر رہے ہیں۔ یہ سارا نظام کشش کی زبردست قوت کی وجہ سے قائم ہے۔ سارے سیارے ایک ہی سمت میں چلتے ہیں اور ہر سیارے کا مدار بالکل گول نہیں بلکہ انڈے کی شکل سے ملتا جلتا ہے۔ سب سیاروں کی اور ان کے چاندوں کی حرکت اتنی باقاعدگی سے ہوتی ہے کہ تھوڑے سے حساب کتاب کے بعد بتایا جا سکتا ہے کہ کوئی سیارہ آج سے کئی سال پہلے کہاں پر تھا اور اب کئی سالوں کے بعد کس مقام پر دکھائی دے گا۔ ہر سیارہ اپنے خاص راستے پر چلتا ہے اور ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ

"اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ یہ سب اپنے اپنے مداروں پر چل رہے ہیں۔" (سورۃ الانبیاء آیت ۳۳)

سیاروں کی معلومات کیسے حاصل ہوتی ہیں

پرانے زمانے کا انسان پانچ سیاروں کو ضرور پہچانتا تھا اور ان کے راستے اور ان کی چال سے بھی واقف تھا، لیکن اسے زیادہ باتیں معلوم نہ تھیں۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے غور و فکر کر کے بہت سی باتیں جان لیں اور چاند ستاروں کا مطالعہ کرنے کے لیے سائنسی آلات بنانے شروع کیے۔ سترھویں صدی کی ابتدا میں دُوربین کی ایجاد سے تو انقلاب آگیا۔ چاند اور ستاروں کا مطالعہ بہت آسان ہو گیا۔ دُوربین میں خاص قسم کے شیشے یا عدسے لگے ہوتے ہیں جن کی مدد سے ہم چاند اور سیاروں کو بہت قریب سے اور بہت بڑا کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ دُوربینوں کی مدد سے ہی دوسرے سیاروں کے بہت سے چاند دریافت کیے گئے۔ زحل کے حلقوں کا پتا لگایا گیا۔ پھر یورینس، نیپچون اور پلوٹو دریافت ہوئے۔ آج بھی طاقت ور دُوربینوں کی مدد سے سیاروں کا مشاہدہ کر کے نئی نئی باتیں معلوم کی جاتی ہیں۔ بہت سے دوسرے جدید سائنسی آلات

اور کیمرے وغیرہ بھی اس مقصد کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

موجودہ صدی کے وسط میں خلائی دور کا آغاز ہوا۔ ۱۹۵۷ء کے بعد سے اب تک خلا میں بہت سے مصنوعی سیارے اور خلائی اسٹیشن چھوڑے جا چکے ہیں۔ کئی مصنوعی سیارے جدید ترین آلات کی مدد سے مسلسل سیاروں کی حرکت کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اور ان کی تصویریں بھی لیتے رہتے ہیں۔ اب سیاروں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے ان کی طرف خلائی جہاز بھی روانہ کیے جاتے ہیں جن میں کوئی انسان سوار نہیں ہوتا بلکہ خود کار مشینی آلات اور کیمرے وغیرہ لگے ہوتے ہیں۔ انھیں سائنس داں زمینی اسٹیشن سے کمپیوٹروں کے ذریعہ سے کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ خلائی جہاز سیاروں کے قریب جا کر ان کی اندرونی ساخت، فضا کشش کی قوت اور ان کے چاند وغیرہ کے متعلق بے شمار قیمتی معلومات حاصل کرتے ہیں اور خاص قسم کے کیمروں سے سیاروں کی سطح کی واضح تصویریں بہت قریب سے کھینچ کر زمین پر بھیجتے ہیں۔ اس طرح ایسی ایسی اہم باتیں معلوم ہو رہی ہیں جو انسان سیکڑوں سالوں میں بھی نہ جان سکا تھا۔ یہ انسان کا کتنا بڑا کارنامہ ہے کہ وہ خود زمین پر رہ کر کروڑوں کیلو میٹر دور سے اپنے بنائے ہوئے خلائی جہازوں سے کام لیتا ہے۔ بے شک انسان کائنات کو مسخر کرنے پر تُلا ہوا ہے۔

نظامِ شمسی کا ننھّا سیاح

امریکی خلائی ادارے نے ایک خاص منصوبے کے تحت سیاروں کی تحقیقات کے لیے وائجر نامی دو خلائی جہاز بھیجے ہیں۔ اگست ۱۹۷۷ء میں وائجر دوم خلائی جہاز روانہ کیا گیا۔ بے شمار سائنسی آلات اور حساس کیمروں سے آراستہ یہ خلائی جہاز مریخ، مشتری اور زحل کے قریب سے گزرا۔ بہت سی قیمتی معلومات حاصل کیں، ہزاروں تصویریں کھینچیں اور کئی نئے چاند دریافت کیے۔ جنوری ۱۹۸۶ء میں یہ یورینس کے قریب سے گزرا۔ اور بے شمار نئی نئی معلومات اور تصاویر زمین پر بھیجیں۔ اب یہ آٹھویں سیارے نیپچون کی طرف رواں دواں ہے۔ وائجر دوم ہمارے نظامِ شمسی کا "ننھّا سیاح" ہے۔ یہ انسانی ذہن کا عظیم کارنامہ ہے۔ یہ چھوٹا سا خلائی جہاز آج کل ہم سے تین ارب کیلو میٹر سے بھی زیادہ دُور ہے۔ اس قدر فاصلے کے باوجود وہ ہم سے رابطہ رکھے

ہوئے ہے اور ریڈیائی پیغامات اور تصاویر بھیج رہا ہے۔ یہ ہم سے اتنا دُور ہے کہ اس کے بھیجے ہوئے ریڈیائی سگنل ہمیں کئی گھنٹوں کے بعد زمین پر موصول ہوتے ہیں جب کہ یہ ریڈیائی لہریں روشنی کی رفتار سے، یعنی تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی زبردست رفتار سے سفر کرتی ہیں۔ یہ "تنہا سیاح" جسے زمین سے روانہ ہوئے نو سال ہو چکے ہیں، جلد ہی نپچون اور پلوٹو کے قریب سے گزر کر ۱۹۹۰ء تک ہمارے نظام شمسی سے باہر نکل جائے گا اور ہم سے رابطہ توڑ کر کسی نا معلوم سمت میں اور "کسی اور دنیا" کی تلاش میں روانہ ہو جائے گا۔

عجیب و غریب سیارہ گرہن

سیاروں کی اس دنیا میں کبھی کبھی بہت ہی عجیب و غریب واقعات ہوتے ہیں۔ مثلاً کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی سیارے آسمان پر ایک ہی جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک طرح کا "سیارہ گرہن" ہو جاتا ہے۔ ۵۔ فروری ۱۹۶۲ء کو نظامِ شمسی کے سات اجسام چاند، سورج، عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل سب کے سب آسمان پر ایک سیدھ میں اس طرح آ گئے تھے کہ ایک زبردست گرہن ہو گیا تھا۔

دوربین کے بغیر پانچ سیارے عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ سیارے ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں۔ عام طور پر یہ سب کے سب ایک وقت میں آسمان پر نظر نہیں آتے مگر کئی سال کے بعد ایک ایسا موقع بھی آتا ہے جب یہ پانچوں سیارے بہ یک وقت دیکھے جا سکتے ہیں۔ خوش قسمتی سے اس سال ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۶ء میں ایسا موقع ہمیں مل رہا ہے۔ آج کل سورج غروب ہونے کے بعد آسمان پر نظر ڈالتے ہی آپ سیارہ زہرہ کو پہچان لیں گے، کیوں کہ یہ آسمان کے تمام تاروں سے زیادہ روشن اور چمک دار ہے۔ مغربی آسمان پر زہرہ سے کافی نیچے عطارد ہے مگر یہ کچھ کم چمک دار ہے اور جلدی ڈوب جاتا ہے لہٰذا اسے تلاش کرنے میں ذرا مشکل ہو سکتی ہے۔ زہرہ سے زیادہ بلندی پر زحل ہے۔ ادھر مشرقی آسمان پر سیارہ مریخ چمک رہا ہے جو سرخی مائل ہے۔ مشرق سے ایک چمکتا ہوا تارا نکل رہا ہے۔ یہ مشتری ہے۔ اس طرح تھوڑی سی کوشش کے بعد آپ پانچوں سیارے دیکھ سکتے ہیں۔ یورینس، نپچون اور پلوٹو بھی اس وقت رات کے آسمان پر موجود ہیں، مگر ہم خالی آنکھ سے انھیں نہیں دیکھ

سکتے۔ پلوٹو کو تو اچھی دُور بین سے بھی نہیں دیکھ سکتے۔

یہ پانچ سیارے جو ہمیں آسمان پر چمک دار تاروں جیسے لگ رہے ہیں، دُور بین سے دیکھنے پر چھوٹے چھوٹے گول اجسام نظر آئیں گے۔ مشتری کے چار چاندوں کا حیرت انگیز تماشا بھی ایک چھوٹی دُور بین سے دیکھا جا سکتا ہے۔ زحل کے خوب صورت حلقے بھی دُور بین سے نظر آسکتے ہیں۔ اگر آپ سیاروں کی اس دنیا میں دل چسپی رکھتے ہیں تو آپ پی آئی اے کی سیارہ گاہ کی سیر کر سکتے ہیں اور وہاں کی دُور بین سے چاند اور سیاروں کا خوب اچھی طرح مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

فلکیات اور مسلمان

آسمان پر موجود اجسام سورج، چاند، سیاروں اور تاروں کے علم کو علم ہیئت یا فلکیات کہتے ہیں۔ یہ سائنس کی ایک اہم شاخ ہے۔ یہ بہت قدیم علم ہے اور بہت دل چسپ بھی۔ ہمارے بزرگوں نے اس علم کی ترقی کے لیے بہت سے کارنامے انجام دیے تھے۔ چاند اور تاروں کا مطالعہ کرنے کے لیے دنیا کی سب سے پہلی رصد گاہ مشہور مسلمان بادشاہ مامون الرشید کے دَور میں اس کے حکم سے بغداد کے قریب قائم کی گئی تھی۔ پھر دمشق میں دوسری رصد گاہ تعمیر ہوئی۔ ان میں زمین کا قطر، سیاروں کی گردش، ان کی رفتار اور فاصلے ناپے گئے نئے آلات بنائے گئے۔ الخوارزمی، یحییٰ بن منصور، موسیٰ بن شاکر، عمر خیام، ابن الہیثم اور البیرونی جیسے مایۂ ناز مسلمان سائنس دانوں نے فلکیات میں زبردست کام کیا۔ آٹھویں صدی عیسوی سے تیرھویں صدی تک مسلمان فلکیات کے میدان میں چھائے رہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس کے بعد مسلمان غفلت میں پڑ کر سائنس کے میدان میں پیچھے رہ گئے اور مغربی اقوام آگے نکل گئیں۔ اب بھی اگر ہم خوب محنت کریں، بھرپور جدوجہد کریں تو سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں ہماری برتری پھر سے قائم ہو سکتی ہے۔

قرآن پاک میں جگہ جگہ سورج، چاند اور تاروں کا ذکر آیا ہے، انھیں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں بتایا گیا ہے اور عقل سے کام لے کر ان کے بارے میں غور و فکر کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ہمیں چاہیے کہ ہم خوب علم حاصل کریں تاکہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اس حیرت انگیز کائنات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان سکیں۔ علم کی پیاس اور جستجو مرتے دم تک ختم نہ ہونی چاہیے۔

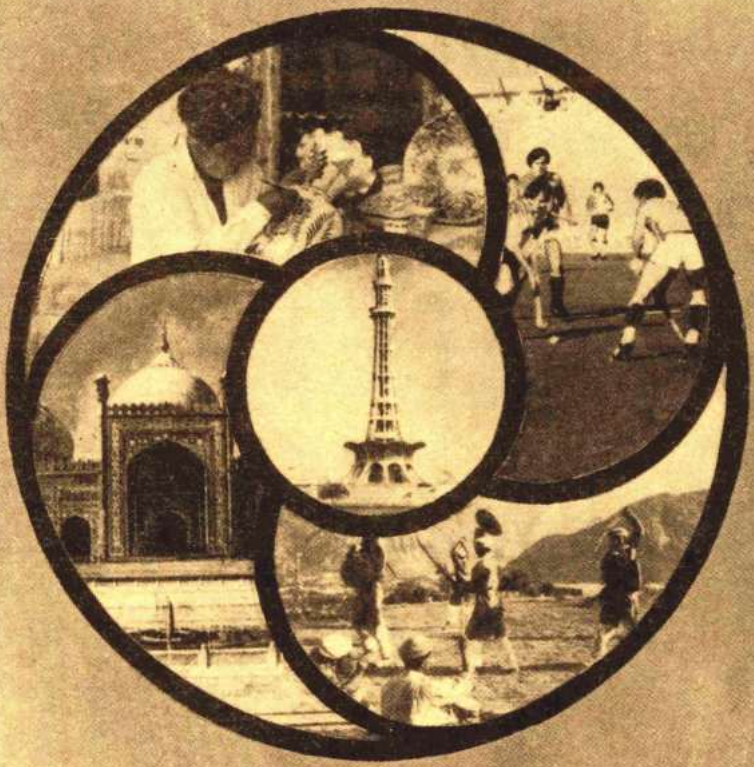

تہذیبی روائتیں اور ثقافتی ورثہ
ہماری اصل پہچان ہیں !

نیشنل بینک آف پاکستان نے اس نکتہ نظر کو اپنے آغاز سفر میں ہی اپنا لیا تھا۔ فن، تہذیب اور لوک ورثہ کی حفاظت کے علاوہ علم و تحقیق کے فروغ اور کھیلوں کے قومی سطح پر احیا کو اس قومی بینک نے ہمیشہ وہی اہمیت دی ہے جو پاکستان کی معاشی ترقی اور تجارت کے فروغ کو حاصل ہے۔

نیشنل بینک آف پاکستان — قومی ترقی قومی بینک

United

PID-I-37/85

انعامی مقابلہ

بلاعنوان کہانی

عنوان لکھیے

اس کہانی کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے، جو ہمیں ۲۰ ستمبر ۸۶ء تک مل جائے۔ سب سے عمدہ عنوان بتانے والے نونہال کو پانچ سو رُپے انعام دیا جائے گا۔ ایک سے زیادہ بہترین عنوان موصول ہو گئے تو انعام کی رقم برابر تقسیم کر دی جائے گی۔ ادارہ ہمدرد نونہال کا فیصلہ آخری مانا جائے گا۔ جس کاغذ پر عنوان لکھیں اس پر اپنے نام اور پتے کے علاوہ کچھ اور نہ لکھیں۔ دستی جواب موصول نہیں کیے جائیں گے۔

راجر بعد میں اکثر اوقات زہریلے چاکلیٹ والے مقدمے کے بارے میں سوچتا رہا۔ اخبارات نے اس واقعے کو اسی نام سے موسوم کیا تھا۔ اس کے خیال میں قتل کا یہ منصوبہ انتہائی عقل مندی سے بنایا گیا تھا۔ ایک بار اگر معلوم ہو جائے تو قتل کا سبب بالکل صاف نظر آتا ہے، لیکن ابتدا میں کسی کو یہ معلوم نہ تھا۔ معلوم ہو جانے کے بعد طریقۂ کار نہایت دل چسپ معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال شروع میں کسی کو اس کا علم نہ تھا۔

اس مقدمے کے واقعات یہ ہیں۔ اس حادثے کے ایک ہفتے بعد چیف انسپکٹر مارسی نے راجر کو ایک شام یہ باتیں بتائیں۔ پندرہ نومبر جمعہ کی صبح سَر ولیم اپنے کلب گئے، جو پکیڈلی کے علاقے میں تھا۔ یہ ان کا معمول تھا۔ انھوں نے اپنے خطوط کے بارے میں دریافت کیا اور چوکی دار نے انھیں تین خطوط اور ایک پارسل دے دیا۔ سر ولیم بڑے ہال میں آتش دان کے پاس خطوط کھولنے کے لیے چلے گئے۔

چند منٹوں کے بعد کلب کے ایک دوسرے ممبر مسٹر گراہم بھی آ گئے۔ ان کے لیے بھی دو تین خط رکھے تھے۔ چناں چہ وہ بھی آتش دان کے پاس خطوط پڑھنے چلے گئے۔ وہ سَر ولیم کو دیکھ کر مسکرائے۔ دونوں ایک دوسرے سے واقف تھے، مگر بات کم کرتے تھے۔

سَر ولیم نے خطوط کو پڑھنے کے بعد پارسل کھولا۔ ایک لمحے کے بعد وہ غصّے سے بُڑبُڑائے۔ گراہم نے ان کی طرف دیکھا اور سَر ولیم نے جو خط پارسل کے اندر سے نکالا تھا وہ گراہم کو دِکھا دیا۔ گراہم نے خط پڑھا اور دل ہی دل میں مسکرائے۔ سر ولیم کی حرکتوں سے کلب کے بہت سے لوگ لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ خط چاکلیٹ بنانے والی کمپنی میسن اینڈ سنز نے بھیجا تھا۔ لکھا تھا کہ وہ مردوں کے لیے ایک نئے قسم کا چاکلیٹ تیار کر رہے ہیں۔ وہ

جاننا چاہتے ہیں کہ مرد اس کو کتنا پسند کرتے ہیں۔ ان چاکلیٹوں کے اندر کچھ نئی چیزیں بھری گئی ہیں۔ کیا سَر ولیم ان کو قبول کریں گے اور ان کے بارے میں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں گے؟

سر ولیم چلّائے، "کیا وہ مجھ کو ایک لڑکی سمجھتے ہیں؟ میں ان کو بتاؤں گا کہ میں ان کے چاکلیٹوں کو کتنا پسند کرتا ہوں۔ میں کلب کی کمیٹی سے اس کی شکایت کروں گا۔ اس قسم کی حرکتوں کی یہاں اجازت نہیں دی جاسکتی۔"

گراہم نے کہا، "بہرحال، میرے لیے یہ اچھا ہوا۔ مجھے ایک بات یاد آگئی۔ کل رات میں اپنی بیوی کے ساتھ امپیریل تھیٹر گیا تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ آدھا ڈراما ہونے سے قبل اگر وہ یہ بتادے کہ قتل کس نے کیا ہے تو میں اس کو چاکلیٹ کا ایک ڈبّا دوں گا۔ اس نے اندازہ صحیح لگایا، لہٰذا اب مجھے چاکلیٹ کا ایک بکس اس کے لیے خریدنا ہے۔ سر ولیم آپ نے وہ ڈراما دیکھا؟ بُرا نہیں ہے۔"

سَر ولیم نے وہ ڈراما نہیں دیکھا تھا، لہٰذا انھوں نے سختی سے یہی کہہ دیا۔ پھر وہ بولے، "تم کہتے ہو کہ تم کو چاکلیٹ کا ایک ڈبّا چاہیے، تو پھر اسی کو لے لو۔ مجھے نہیں چاہیے۔"

گراہم نے ایک لمحے کے لیے تکلّف کیا۔ پھر لے لیا۔ رُپیہ بچانے کی بات نہ تھی، کیوں کہ وہ دولت مند تھا۔ صرف بازار سے خریدنے کی زحمت بچ گئی۔ اس کو حُسنِ اتفاق کہیے کہ وہ خط اور وہ کاغذ جو ڈبّے پر لپٹا ہوا تھا آتش دان میں نہیں ڈالا گیا۔ ملازم نے بعد میں سب چیزوں کو اُٹھا کر ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ پولیس کو یہ چیزیں مل گئیں۔

قتل کی واردات تک جو تین اشخاص منظر پر آئے ان میں سر ولیم سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ پچاس سے کچھ کم عمر تھی، سرخ و سفید چہرہ، بھاری جسم، پرانے زمانے کے جاگیر دار معلوم ہوتے تھے۔ عورتوں میں وہ زیادہ مقبول نہ تھے۔ ان کے مقابلے میں گراہم بالکل معمولی آدمی تھا۔ لمبا قد، کچھ خوش شکل، کم گو، باپ نے بہت دولت چھوڑی تھی، مگر وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا کئی کمپنیوں کا مالک تھا اور ان کی نگرانی کرتا تھا۔ رُپیہ رُپے کو کھینچتا ہے۔ گراہم دولت مند گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور وہ مسلسل دولت کماتا رہا، اس لیے اگر اس نے کسی دولت مند عورت سے شادی کی تو اس میں حیرت کی کوئی بات

نہیں۔ اس کی بیگم ربیکا پول کے ایک ایسے دولت مند شخص کی بیٹی تھی جو جہازوں کا مالک تھا۔ گراہم کے دوست کہتے تھے کہ اگر وہ دولت مند نہ بھی ہوتیں تب بھی وہ ان ہی سے شادی کرتا۔ وہ ایک قدآور، سنجیدہ اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ وہ اس کے لیے ایک مثالی بیوی تھیں۔ چند باتوں میں بیگم گراہم کسی قدر سخت گیر واقع ہوئی تھیں، مگر گراہم کو اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ گراہم خود بھی کبھی سخت گیر ہو جاتا تھا۔ دونوں خوش گوار زندگی بسر کر رہے تھے۔

گراہم نے دوپہر کے کھانے کے بعد چاکلیٹ کا ڈبا اپنی بیوی کو دے دیا۔ دونوں کافی پی رہے تھے۔ بیوی نے فوراً ڈبا کھول لیا۔ گراہم اپنی کافی کو بدمزہ کرنا نہیں چاہتا تھا، لہٰذا اس نے پہلے انکار کیا۔ بیوی نے چاکلیٹ کھا لیا اور فوراً ہی شکایت کی کہ یہ بہت تیز ہے۔ اس کا منھ جلنے لگا۔ گراہم نے بتایا کہ یہ نئے قسم کے چاکلیٹ ہیں جو ابھی بازار نہیں پہنچے ہیں۔ اس کو جستجو تھی، اس لیے اس نے بھی ایک چاکلیٹ کھا لیا۔ اس کو بھی جلن محسوس ہوئی۔ بہت تیز تو نہ تھی، مگر مزہ اچھا نہ تھا۔ اس میں کڑوے بادام کی کچھ بُو بھی تھی۔ گراہم

بولا، "واقعی یہ تیز ہیں۔"

"ارے نہیں، بنانے والے ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔" بیوی نے کہا اور دوسرا چاکلیٹ کھاتے ہوئے بولی، "مگر یہ ہیں بہت تیز۔ بہرحال مجھے اچھے لگ رہے ہیں۔"

گراہم نے ایک چاکلیٹ اور کھایا اور یہ اسے پہلے والے سے بھی بدمزہ معلوم ہوا۔ "مجھے یہ قطعی پسند نہیں۔ میری زبان کا سارا مزہ ختم ہو گیا۔ تم انھیں زیادہ نہ کھاؤ۔ میرے خیال میں ان میں کوئی خرابی ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کوئی نئی چیز بنانا چاہتے ہیں، مگر ان سے جلن تو ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ ان کو اچھا کہوں یا نہیں!"

چند منٹوں کے بعد گراہم چلا گیا۔ اسے شہر میں ایک میٹنگ میں شریک ہونا تھا۔ اس کی بیوی چاکلیٹ کھاتی رہی اور یہی سوچتی رہی کہ اسے یہ پسند ہیں یا نہیں۔ بعد میں گراہم کو یہ بات اچھی طرح یاد رہی۔ اس نے اپنی بیوی کو اس کے بعد زندہ نہیں دیکھا۔

وہ تقریباً ڈھائی بجے گھر سے روانہ ہوا۔ پونے چار بجے وہ اپنے کلب پہنچ گیا۔ وہ ٹیکسی میں آیا تھا اور قریب قریب بے ہوش تھا۔ ڈرائیور اور چوکی دار نے اسے عمارت میں پہنچایا۔ دونوں نے بعد میں بتایا کہ وہ بالکل پیلا ہو رہا تھا اور اپنے سامنے ٹکٹکی لگائے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو گئے تھے اور اس کی کھال نرم اور گیلی ہو رہی تھی۔ بہرحال اس کا حافظہ صحیح تھا۔ جب اس کو زینے پر چڑھا دیا گیا تو وہ چوکی دار کے سہارے ہال کے اندر چلا گیا۔

چوکی دار خوف زدہ ہو گیا۔ وہ فوراً ڈاکٹر کو بلوانا چاہتا تھا، مگر گراہم کسی کو تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے اور وہ تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائے گا۔ جب چوکی دار چلا گیا تو اس نے سر ولیم سے کہا، "میرے خیال میں یہ ان چاکلیٹوں کی وجہ سے ہوا ہے جو تم نے مجھے دیے تھے۔ میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ ان میں کوئی خرابی ہے۔ مجھے اپنی بیوی کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے۔" اتنا کہہ کر وہ رُک گیا۔ اس کا جسم اکڑ گیا اور اس کے جبڑے بیٹھ گئے۔ اس کے نیلے ہونٹ ایک بھیانک مسکراہٹ سے ٹیڑھے ہو گئے۔ وہ کرسی کے دستوں کو کس کر پکڑے ہوئے تھا۔ سر ولیم پریشان ہو گئے۔ ان کو کڑوے بادام کی بُو محسوس ہوئی۔ وہ سمجھے کہ یہ شخص مَرا جا رہا ہے، لہٰذا انھوں نے

چوکی دار کو کہہ کر ڈاکٹر کو بُلوایا۔ کلب کے دوسرے ممبران کی مدد سے اس کے جسم کو آرام سے لٹا دیا گیا۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر آتا ٹیلے فون سے گھبرائے ہوئے ملازم نے گراہم کے بارے میں دریافت کیا کہ آیا وہ وہاں ہیں یا نہیں اور یہ بھی کہا کہ بیگم گراہم شدید بیمار ہیں۔ اصل میں وہ اس وقت تک مر چکی تھیں۔

گراہم نہیں مرا۔ اس نے اپنی بیوی کے مقابلے میں کم زہر کھایا تھا۔ اس کی بیوی نے اس کے جانے کے بعد کم از کم تین چاکلیٹ اور کھا لیے ہوں گے، لہٰذا گراہم پر زہر کا اثر اتنی تیزی سے نہیں ہوا اور ڈاکٹر کو اس کی جان بچانے کا وقت مل گیا۔ رات آٹھ بجے تک اسے ہوش آگیا۔ دوسرے دن وہ اور بہتر ہو گیا۔

بے چاری بیگم گراہم اتنی خوش قسمت نہ تھیں۔ ڈاکٹر کے آنے میں دیر ہو گئی اور ان کی جان نہ بچائی جا سکی۔ وہ بے ہوشی کی حالت ہی میں مر گئیں۔ پولیس کو یہ رپورٹ ملی کہ بیگم گراہم زہر کھا لینے کی وجہ سے مر گئی ہیں۔ پولیس کو بہت جلد یہ معلوم ہو گیا کہ زہر اُن چاکلیٹوں میں تھا۔ سر ولیم سے سوالات کیے گئے اور پولیس کو وہ خط اور وہ کاغذ مل گیا جو پارسل پر لپٹا ہوا تھا۔ گراہم کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی پولیس کا ایک افسر مینس اینڈ سنز کے ہاں پہنچ گیا۔

شروع میں پولیس کو یہ خیال آیا کہ میسن اینڈ سنز کے ہاں کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ وہ سمجھے کہ شاید کسی کارندے نے چاکلیٹوں کو بھرتے وقت کڑوے بادام کا تیل ضرورت سے زیادہ ڈال دیا ہے۔ بہرحال کمپنی کے مینیجر نے اس خیال کو نہیں مانا۔ اس نے خط کو غور سے پڑھا اور فوراً کہہ دیا کہ یہ خط جعلی ہے۔ اس کی کمپنی نے نہ تو وہ خط بھیجا اور نہ چاکلیٹ۔ انھوں نے تو کسی نئے قسم کے چاکلیٹ بنانے کا کبھی سوچا ہی نہیں۔ بکس میں جو چاکلیٹ تھے وہ ان کے معمولی چاکلیٹ تھے۔

مینیجر نے ایک چاکلیٹ کا کاغذ اُتارا اور غور سے چاکلیٹ کو دیکھا۔ پھر انھوں نے چاکلیٹ کے نچلے حصّے میں ایک باریک سوراخ دکھایا۔ اسی سوراخ کے ذریعہ سے اندر کی مٹھائی کو نکال کر زہر بھرا گیا تھا۔ سوراخ کو آسانی سے نرم چاکلیٹ سے بھرا جا سکتا تھا۔ پولیس انسپکٹر نے شیشے کے ذریعہ سے چاکلیٹ کا معائنہ کیا اور مینیجر کی رائے سے اتفاق کیا۔ صاف ظاہر تھا کہ کوئی شخص

سَر ولیم کو مار ڈالنا چاہتا تھا۔

سراغ رسانوں نے اب اور بھی زیادہ محنت سے کام شروع کر دیا۔ چاکلیٹوں کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے لیے سائنس دانوں کے پاس بھیج دیا گیا۔ سَر ولیم اور گراہم دونوں سے پولیس نے پھر پوچھ گچھ کی، لیکن ڈاکٹر نے گراہم کو اس کی بیوی کے مرنے کی خبر بتانے کی اجازت نہیں دی' لہٰذا اس سے کوئی خاص مدد نہیں مل سکی۔ سَر ولیم سے بھی کوئی خاص خبر نہیں ملی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون انھیں مار ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ نہیں رہتے تھے۔ بیوی کو ان کے مرنے سے کچھ فائدہ ہو سکتا تھا، مگر وہ فرانس کے جنوب میں رہتی تھیں۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ سَر ولیم کا وارث ان کا ایک بھتیجا تھا، مگر چوں کہ کوئی زمین یا جائداد وراثت میں نہیں ملنے والی تھی اس لیے سَر ولیم کو مار ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

چاکلیٹوں کے معائنے سے پولیس کو دو باتیں معلوم ہوئیں۔ کڑوے باداموں کا تیل بہ طور زہر استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے بجائے "نائیٹرو" استعمال کی گئی تھی۔ اس چیز کو عام طور پر

کپڑوں کے لیے رنگ بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے، لہٰذا اس کو بہ طور زہر استعمال کرنے پر حیرت ہوئی۔ اوپر والی قطار کے ہر چاکلیٹ میں زہر کی مقدار یکساں تھی اور زہر میں کوئی میٹھی چیز شامل کر دی گئی تھی۔ باقی قطاروں کے چاکلیٹ بالکل بے ضرر تھے۔ پولیس کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس کاغذ پر خط لکھا گیا تھا وہ وہی کاغذ تھا جو میتس کمپنی ہمیشہ استعمال کرتی تھی۔ کمپنی کا پتا اس پر چھپا ہوا تھا۔ بہرحال پولیس کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ قاتل کو یہ کاغذ کیسے مل گیا۔ کاغذ کے کنارے کچھ پیلے پڑ گئے تھے، لہٰذا کاغذ بہت پرانا ہو گا۔ جس ٹائپ رائٹر کو استعمال کیا گیا تھا اس کا پتا نہ چل سکا، حال آنکہ وہ ایک پرانے قسم کا اور غیر معمولی تھا۔ پارسل پر جو کاغذ لپٹا ہوا تھا اس سے پولیس کو یہ معلوم ہو گیا کہ پارسل کو ساؤتھیمپٹن اسٹریٹ کے ڈاک خانے سے رات ساڑھے آٹھ اور ساڑھے نو کے درمیان روانہ کیا گیا تھا۔ دوسرے دن قتل کی واردات پیش آئی۔ پتا جلی حروف میں ٹائپ کیا گیا تھا۔ ایک بات بالکل واضح تھی۔ جو شخص بھی سر ولیم کو قتل کرنا چاہتا تھا وہ پکڑا جانا نہیں چاہتا تھا۔ چیف انسپکٹر مارسی نے قصہ ختم کرتے ہوئے کہا،

"مسٹر راجر، اب تم بھی اتنا جان گئے ہو جتنا ہم لوگ جانتے ہیں۔ اب اگر تم یہ بتا سکو کہ چاکلیٹ کس نے بھیجے تو پھر تم کو ہم سے بھی زیادہ معلومات حاصل ہو جائیں گی۔"

راجر نے کہا، "ہاں، یہ مشکل معاملہ ہے۔ کل ہی مجھے ایک شخص ملا جو گراہم کے ساتھ اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس نے بتایا کہ بے چارہ اپنی بیوی کی موت سے بے حد غم زدہ ہے۔ وہ بالکل بیمار ہو گیا ہے۔ مارسی، کاش تم یہ پتا چلا سکو کہ چاکلیٹ کس نے بھیجے۔"

"مسٹر راجر، میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"

راجر نے کہا، "کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ کسی عورت کے حسد کے بارے میں کیا خیال ہے؟ سر ولیم کی نجی زندگی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ وہ آئے دن کسی نہ کسی سے دوستی کرتے ہیں اور پھر چھوڑ دیتے ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے کوئی ہو۔"

مارسی نے کہا، "میں بھی اسی کے بارے میں تحقیقات کر رہا ہوں۔ اس قتل میں عورت کا ہاتھ صاف دکھائی دیتا ہے۔ صرف کوئی عورت ہی زہریلے چاکلیٹ بھیج سکتی ہے۔ اگر کوئی مرد بھیجتا تو وہ زہریلی شراب یا ایسی ہی کوئی چیز بھیجتا۔"

راجر نے کہا "یہ بات درست ہے۔ کیا تم کو سر ولیم سے کوئی مدد نہیں مل سکی؟"

مارسہی بولا "وہ مدد شاید کرنا ہی نہیں چاہتے۔ پہلے مجھے خیال ہوا کہ ان کو کسی عورت پر شک ہے اور وہ اس کو بچانا چاہتے ہیں، مگر اب میرا یہ خیال نہیں ہے۔"

راجر نے کہا، "مجھے ایسا ہی ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ کسی دیوانے نے خود پولیس کے اعلا افسر کو زہریلے چاکلیٹ بھیجے تھے۔ لوگ ایسے جرم کی نقل کرنے لگتے ہیں۔"

مارسہی نے خوش ہو کر کہا، "میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ سر ولیم کی موت سے کسی کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کسی پاگل عورت کا کام ہے۔"

راجر نے کہا، "اتفاق ہماری مدد کرے گا۔ بہت سے واقعات محض اتفاق کی بہ دولت واضح ہو جاتے ہیں۔ "انتقامی اتفاق" فلم کا یہ نام کیسا رہے گا؟ شاید یہ اتفاق یا قسمت نہ ہو بلکہ قدرت مقتول کا انتقام لیتی ہو۔"

راجر نے چیف انسپکٹر مارسہی کی اس رائے سے اتفاق کیا کہ یہ کسی پاگل عورت کا کام ہے اور اسی بنا پر اس نے اس مقدمے میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ پرائیوٹ طور پر اس طرح کا کام اچھی طرح نہیں ہوتا۔ یہ تو مقامی پولیس ہی بہتر طور پر انجام دے سکتی ہے۔ پھر بھی وہ اگلے چند دنوں تک اس مقدمے کے بارے میں مسلسل سوچتا رہا۔

اتفاق سے ایک ہفتے بعد راجر کی ملاقات مسز ویر یکر سے ہو گئی۔ یہ خاتون بڑی دولت مند تھیں۔ وہ راجر کو بہت پسند کرتی تھیں مگر راجر ان سے بھاگتا رہتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بڑی باتونی تھیں۔ راجر نے پہلے تو بچنے کی کوشش کی، مگر ٹریفک اتنا تھا کہ وہ پھنس گیا۔ راجر اخلاقاً مسکرایا اور کچھ کہنا چاہا مگر وہ پہلے ہی بول پڑیں:

"اس واقعے کے بارے میں جب میں نے سُنا تو بڑا صدمہ ہوا۔ بات یہ ہے کہ بیگم گراہم میری بڑی گہری دوست تھی۔ سب سے ہول ناک بات یہ ہے کہ وہ خود اپنی موت کی ذمے دار تھی۔"

راجر نے کہا، "جی میں سمجھا نہیں۔"

مسز ویر یکر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "میرا خیال ہے کہ اسے قسمت کہنا چاہیے۔ تم کو معلوم ہے کہ اس نے اپنے شوہر سے شرط لگائی تھی؟ اگر گراہم شرط جیت جاتا تو سر ولیم

اس کو زہریلے چاکلیٹ ہرگز نہ دیتے۔ کیوں مسٹر راجر؟" پھر مسز ویبر نے نہایت رازدارانہ انداز میں آہستہ سے کہا:

"میں نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی ہے، مگر تم سمجھ جاؤ گے۔ بیگم گراہم نے شرط لگانے میں ایمان داری نہیں کی!"

"کیا مطلب؟" راجر نے پوچھا۔

مسز ویبر بولیں، "وہ اس ڈرامے کو پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ وہ میرے ساتھ پہلے ہی ہفتے میں اسے دیکھ چکی تھی، لہٰذا اس کو معلوم تھا کہ ڈرامے میں قتل کس نے کیا، مگر اس نے اپنے شوہر کو یہ نہیں بتایا کہ وہ یہ ڈراما پہلے بھی دیکھ چکی ہے۔"

راجر نے حیران ہو کر سیٹی بجا دی اور بولا، "انتقامی اتفاق۔ اس سے کوئی نہیں بچتا۔"

مسز ویبر راجر کی بات کو سمجھ نہیں سکیں، مگر انھوں نے کہا، "ہاں، بیگم گراہم سے مجھے یہ امید نہ تھی کہ وہ ایسی حرکت کرے گی۔ وہ تو عزت، سچائی اور ایمان داری کی باتیں کرتی رہتی تھی۔"

راجر نے کہا، "آپ نے ابھی سرویم کا نام لیا۔ کیا آپ ان کو جانتی ہیں؟"

مسز ویبر نے کہا، "ہاں، وہ ٹھیک آدمی نہیں۔ آئے دن وہ نئے دوست بناتے رہتے ہیں اور پھر ان سے الگ ہو جاتے ہیں۔"

راجر نے کہا، "افسوس آپ گراہم اور اس کی بیوی کے ساتھ اس روز امپیریل تھیٹر میں نہ تھیں ورنہ وہ یہ شرط نہ لگاتے۔"

"میں اس دن پویلین تھیٹر میں تھی۔"

راجر پھر کچھ دیر تک ان کی مختلف باتیں سنتا رہا اور اسی گفت گو میں راجر کو پتا چلا کہ مسز ویبر کے گھر میں بیگم گراہم اور سرویم کی تصویریں موجود ہیں۔ مسز ویبر نے یہ تصاویر راجر کو دینے کا وعدہ کر لیا، چناں چہ جوں ہی راجر ان سے رخصت ہوا اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور مسز ویبر کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں کمرے کے ایک کونے میں مسز ویبر کے دوستوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ راجر نے چھے تصویریں لے لیں۔ یہ تصویریں سرویم، بیگم گراہم، مسٹر گراہم اور دو اور آدمیوں کی تھیں جن کو راجر نہیں جانتا تھا۔ ایک تصویر خود

مسز ویریکبر کی تھی۔

پھر دن بھر وہ بے حد مشغول رہا۔ وہ پبلک لائبریری گیا جہاں اس نے چند حوالے تلاش کیے۔ اس کے بعد وہ ٹیکسی لے کر اینگلو پرَفیومَری کمپنی گیا۔ وہاں اس نے ایک فرضی شخص جوزف کے بارے میں دریافت کیا تاکہ کمپنی کی تمام شاخوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوجائیں۔ اس کے بعد وہ وِلسن کمپنی گیا۔ یہ کمپنی لوگوں کو اپنا سرمایہ لگانے کے بارے میں مشورہ دیتی تھی۔ آخر میں وہ سر ولیم کے کلب پہنچا۔ وہاں اس نے چوکی دار سے معلوم کر لیا کہ قتل کی واردات سے قبل سر ولیم نے رات کا کھانا کلب میں کھایا تھا۔ پھر راجر نے میسن کمپنی کو فون کرکے معلوم کیا کہ وہ لوگ اپنے خطوط کے لیے کاغذ کہاں سے خریدتے ہیں۔ جب پتا مل گیا تو وہ وہاں پہنچا اور ان سے کہا، "میں ایک خاص قسم کا کاغذ تلاش کر رہا ہوں۔" خاتون ملازمہ نے اسے ایک کتاب دے دی جس میں مختلف اقسام کے کاغذ تھے۔ راجر نے خاتون سے کہا، "میرے ایک دوست نے مجھے بتایا ہے کہ وہ ایک ہفتہ ہوا آپ کی دُکان آئے تھے اور وہ ایک کاغذ کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔ میرے پاس اس دوست کی تصویر بھی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے خاتون کو ایک تصویر دکھائی، "کیا آپ ان کو پہچان سکتی ہیں؟" خاتون نے تصویر دیکھ کر پہچان لیا۔

راجر پھر اپنے گھر گیا اور کھانا کھا کر ٹہلتا ہوا امپیریل تھیٹر کے قریب پہنچ گیا۔ ڈراما ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوتا تھا۔ اس وقت آٹھ بج کر انتیس منٹ ہوئے تھے، لہٰذا وہ اندر داخل ہوا۔

دوسرے دن صبح وہ مارسی سے ملنے گیا، "مارسی، تم میرے لیے ایک کام کر دو۔ کیا تم ایسے ٹیکسی ڈرائیور کو تلاش کر سکتے ہو جو ایک عام آدمی کو قتل کی واردات سے پہلے والی رات پیکی ڈِلی کے قریب سے ساؤتھیمپٹن اسٹریٹ تک تقریباً ساڑھے نو بجے لے گیا؟ میں ایک ایسے ڈرائیور کی بھی تلاش میں ہوں جو ایک آدمی کو اسی راستے پر واپس لے گیا۔ ممکن ہے کہ ایک ہی ٹیکسی استعمال کی گئی ہو۔"

"کیا بات ہے؟" مارسی نے پوچھا۔

راجر نے جواب دیا، "میں صرف جھوٹی کہانی کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ سَر ولیم کو چاکلیٹ کس نے بھیجے تھے۔ اب میں تمھارے لیے ثبوت اکٹھا کر رہا ہوں۔

تم جب ٹیکسی ڈرائیوروں کو تلاش کرلو تو مجھ کو ٹیلے فون کر دو۔"

یہ کہہ کر راجر چلا گیا اور مارسی منھ کھولے ہکا بکا رہ گیا۔ راجر نے پھر دن بھر ایک ٹائپ رائٹر کے بارے میں صرف کر دیا۔ وہ دُکان داروں سے کہتا رہا کہ اس کے ایک دوست نے ایک خاص ٹائپ رائٹر کی بڑی تعریف کی ہے۔ آخر اُسے ایک دُکان مِل گئی، جہاں پر ایک مہینے سے بھی کم عرصہ ہوا ایک ایسا ہی ٹائپ رائٹر فروخت کیا گیا تھا۔

ساڑھے چار بجے وہ گھر واپس آیا اور ایک گھنٹے بعد مارسی کا فون آیا۔ وہ راجر کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے کہا، "میرے دفتر میں چودہ ٹیکسی ڈرائیور اکٹھے ہیں۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"

راجر نے جواب دیا، "ان کو روکے رہو۔ میں آرہا ہوں۔"

ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ زیادہ وقت نہیں لگا۔ راجر باری باری ان کو ایک تصویر دکھاتا رہا، مگر مارسی کی نظریں بچا کر۔ نویں آدمی نے تصویر پہچان لی۔ مارسی نے پھر ڈرائیوروں کو چلا جانے دیا۔ اس نے کہا،

"مسٹر راجر، تم کیا کر رہے ہو؟ آخر مجھے بھی تو بتاؤ۔"

"یقیناً مارسی، میں تمھارا ہی کام کر رہا ہوں۔ میرے پاس ثبوت موجود ہے۔" یہ کہہ کر راجر نے اپنی جیب سے ایک خط نکالا اور اسے مارسی کو دکھایا۔

"کیا یہ خط اسی ٹائپ رائٹر پہ ٹائپ ہوا ہے جس پر مبسن کمپنی والا خط ٹائپ ہوا تھا؟"

مارسی نے خط کو غور سے دیکھا اور پھر جعلی خط اپنی دراز سے نکال کر دونوں خطوں کا معائنہ کیا۔ پھر پوچھا، "یہ خط تم کو کہاں ملا؟"

"ٹائپ رائٹر کی ایک دُکان میں۔ چند ہفتے ہوئے اس ٹائپ رائٹر کو ایک شخص نے خریدا تھا۔ دُکان والے نے تصویر دیکھ کر اس آدمی کو پہچان لیا۔ یہ ٹائپ رائٹر کچھ دِنوں تک دُکان میں استعمال ہوتا رہا تھا، لہٰذا اس ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کیے ہوئے خطوط کا ایک نمونہ میں نے حاصل کر لیا۔ یہ معمولی قسم کا ٹائپ رائٹر نہیں تھا۔"

"اور اب یہ مشین کہاں ہے؟"

راجر بولا، "غالباً دریا کی تہ میں۔ قاتل کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ بہرحال میرے

پاس ثبوت موجود ہے۔"

مارسی نے کہا، "مگر میسن کمپنی جس کاغذ کو استعمال کرتی ہے اُس کے بارے میں کیا ہوا؟"

"وہ نمونوں کی کتاب سے لیا گیا تھا۔ میں نے جب کاغذ کے زرد کناروں کو دیکھا تھا تو اسی وقت بھانپ گیا تھا۔ میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ وہ آدمی اس دُکان پر گیا تھا۔ نمونوں والی کتاب میں ایک جگہ خالی ہے جہاں سے وہ کاغذ لیا گیا تھا۔"

"بہت خوب!" مارسی نے کہا۔

"ٹیکسی ڈرائیور یہ ثابت کر سکتا ہے کہ قاتل اپنے دفاع میں جو عذر پیش کرتا ہے وہ درست نہیں ہے۔ وہ قاتل کو ساؤتھمپٹن اسٹریٹ لے گیا تھا اور واپس بھی لے آیا تھا۔ یہ نو بج کر دس منٹ اور نو بج کر پچیس منٹ کے دوران ہوا۔ وہ پارسل اسی وقت سپردِ ڈاک کیا گیا ہے۔"

"تو پھر قاتل کون ہے مسٹر راجر؟"

راجر نے جواب دیا، "قاتل وہ آدمی ہے جس کی تصویر میری جیب میں ہے۔ تم کو یاد ہے کہ میں نے 'انتقامی اتفاق' کے بارے میں کیا کہا تھا؟ میں نے کہا تھا کہ یہ فلم کا نام بڑا اچھا رہے گا۔ اس واردات میں بالکل یہی ہوا۔ اتفاق سے بانڈ اسٹریٹ میں میری ملاقات ایک باتونی عورت سے ہو گئی۔ اس نے مجھے ایک بات ایسی بتا دی جس سے میں تاڑ گیا کہ چاکلیٹ کس نے بھیجے تھے۔"

"مگر آخر قاتل کون تھا؟" مارسی نے پھر پوچھا۔ راجر نے اس کی سُنی اَن سُنی کر دی اور بولا، "بڑی خوب صورت ترکیب تھی۔ ہم لوگ اپنی غلطی کو ذرا بھی نہیں سمجھ سکے اور قاتل یہی چاہتا تھا کہ ہم غلطی کریں۔"

"وہ کیا غلطی تھی؟"

"قاتل چاہتا تھا کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ قاتل کا منصوبہ ناکام ہو گیا اور غلط شخص قتل ہو گیا، لیکن اصل میں منصوبہ بالکل کامیاب رہا۔ جس کو قتل کرنا تھا وہی قتل ہوا۔"

مارسی حیران رہ گیا، "اس سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"

"قاتل بیگم گراہم کو مار ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے ہر بات پر غور کیا۔ سر ولیم کے لیے چاکلیٹ دینا فطری بات تھی۔ قاتل جانتا تھا کہ ہم ایسے شخص کو تلاش کرنے لگیں جو سر ولیم کو مار ڈالنا چاہتا تھا۔ ہم نے کبھی اس شخص کو تلاش کرنے کا خیال نہیں کیا جو بیگم گراہم کو مار ڈالنا چاہتا تھا۔ قاتل یہ بھی توقع رکھتا تھا کہ ہم لوگ قاتل کسی عورت کو سمجھیں گے۔"

اس پر مارسی نے حیران ہو کر کہا، "غضب خدا کا! تو تمہارا مطلب ہے کہ سر ولیم خود.....!"

"وہ بیگم گراہم سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ابتدا میں وہ بیگم گراہم کو پسند کرتا تھا۔ مگر درحقیقت اسے ان کی دولت درکار تھی۔ مشکل یہ آپڑی کہ بیگم نے رُپیہ کبھی نہیں دیا۔ اسے رُپیہ کی سخت ضرورت تھی۔ یوں تو اس کی بہت سی کمپنیاں ہیں مگر سب کی حالت خراب ہے۔ اس کا دیوالیہ نکلا جارہا تھا۔ تم کو یاد ہوگا کہ شروع میں "نابیزو" کی وجہ سے ہم لوگ بہت چکرائے تھے۔ اس کی مختلف کمپنیوں میں ایک کمپنی اینگلو ایسٹرن پرفیومری بھی تھی۔ اسی وجہ سے اسے معلوم تھا کہ یہ چیز زہریلی ہوتی ہے۔ اس نے یہ چیز اپنی فیکٹری سے شاید نہیں لی۔ وہ بڑا چالاک ہے۔ غالباً یہ زہر اس نے خود تیار کیا۔ یہ کام مشکل نہیں۔"

مارسی نے کہا، "مگر سر ولیم تو اس طرح کے آدمی نہیں ہیں۔ وہ تو شریف آدمی ہیں!"

راجر نے کہا، "سر ولیم؟ سر ولیم کے بارے میں کون کہہ رہا ہے؟ میں نے کہا نا قاتل کی تصویر میری جیب میں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے تصویر نکالی اور مارسی کو دے دی۔ وہ اسے دیکھ کر بے حد حیران رہ گیا۔

راجر نے کہا، "وہ آدمی گراہم ہے! گراہم نے اپنی بیوی کو قتل کیا!!"

"مگر...." مارسی نے کہا۔

"ہاں گراہم ہی ہے۔ اسے اپنی بیوی کی سخت گیری ناپسند تھی۔ اس نے رُپیہ کی خاطر شادی کی تھی۔ جب اسے رُپیہ نہیں ملا تو اس نے اسے مار ڈالنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ اپنی بیوی کو لے کر امپیریل تھیٹر گیا۔ پہلے اور دوسرے ایکٹ کے درمیان وہ باہر چلا گیا۔ میں نے خود تھیٹر جا کر اس کا اندازہ لگا لیا۔ وہ تیزی سے ساؤتھیمپٹن اسٹریٹ گیا اور پارسل کو

ڈاک کے سپرد کر دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے شناخت کر لیا۔ گراہم کو اس کام کے لیے دس منٹ کا وقت تھا۔ باقی کام آسان تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سر ولیم روزانہ صبح ساڑھے دس بجے کلب آتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ سر ولیم اس کو چاکلیٹ دے دیں گے۔ اس نے شرط والا قصہ سنایا۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس بہت سی غلطیاں کرے گی۔ اس نے خط اور پارسل پر لپٹا ہوا کاغذ آگ میں نہیں پھینکا۔ اس طرح پولیس یہ خیال کرے گی کہ کسی پاگل کی حرکت ہے۔"

مارسی نے کہا، "یہ تو واقعی خوب رہی۔ تم کو اس خاتون نے کیا بات بتا دی جس سے تم اصلیت کو سمجھ سکے؟"

"دراصل انھوں نے جو باتیں کیں اُن سے میں نے اندازہ لگا لیا۔ خاتون نے مجھے بتایا کہ بیگم گراہم کو شرط کا جواب پہلے سے معلوم تھا۔ میں نے سوچا کہ بیگم گراہم ایسی حرکت نہیں کر سکتیں، لہٰذا انھوں نے شرط نہیں لگائی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گراہم جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کا یہ بھی مطلب ہوا کہ گراہم ان چاکلیٹوں کو کسی اور وجہ سے استعمال کرنا چاہتا تھا اور پھر یہ سارا قصّہ صرف گراہم ہی کی زبانی تو ہم لوگوں کو معلوم ہوا۔ اس دن سہ پہر کو وہ اپنی بیوی کو اس وقت چھوڑ کر گیا جب وہ کافی چاکلیٹ کھا چکی تھیں۔ اسی لیے اس نے ہر چاکلیٹ میں ایک ہی مقدار کا زہر بھرا۔ وہ جانتا تھا کہ دو چاکلیٹ کھانے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

مارسی کھڑا ہو گیا، "مسٹر راجر، میں تمھارا بڑا احسان مند ہوں۔" انتقامی اتفاق" کیا کہنے! لیکن گراہم نے ایک بات اتفاق پر چھوڑ دی۔ فرض کرو سر ولیم وہ چاکلیٹ اپنی کسی خاتون دوست کو دے دیتے؟"

راجر نے کہا، "تب بھی کوئی فرق نہ ہوتا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ گراہم نے سر ولیم کو زہریلے چاکلیٹ بھیجے؟ ہرگز نہیں، اس نے تو معمولی چاکلیٹ بھیجے تھے۔ گھر لے جاتے وقت اس نے زہریلے چاکلیٹ رکھ دیے تھے۔ اتفاق کو سراسر اتفاق پر چھوڑ دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔"

عجیب عجیب باتیں

لونا اور چھڑ

چین کے مشہور لونے چہرہ مہ کا قد صرف ۲۸ انچ تھا، لیکن وہ انٹا کھیلنے کی جو چھڑ استعمال کرتا تھا وہ ۱۳ فیٹ لمبی تھی۔

چلتی پھرتی لائبریری

۱۹۳۸ء سے ۱۹۹۵ء کے دوران ایران کا وزیر اعظم قاسم اسمٰعیل تھا۔ لوگ اسے عام طور پر "صاحب" کہتے تھے۔ وہ مطالعہ کا بہت شوقین تھا۔ اس کے اپنے کتب خانے میں ۱۷،۰۰۰ کتابیں تھیں۔ اُسے انتظامی کاموں یا اپنے ملک کی فوجوں کی کمان کرنے کے لیے اکثر طویل سفر کرنے پڑتے۔ وہ جب بھی کسی سفر پر روانہ ہوتا تو چار سو اونٹوں پر اپنی تمام کتابیں لاد کر اپنے ساتھ لے جاتا۔ ان اونٹوں کو یہ تربیت دی گئی تھی کہ وہ حروفِ تہجی کے اعتبار سے سفر کرتے، یعنی جس اونٹ پر ایسی کتابیں لدی ہوتیں جن کے نام 'الف' سے شروع ہوتے ہوں، وہ سب سے آگے ہوتا، اس کے پیچھے وہ اونٹ ہوتا جس پر ایسی کتابیں ہوتیں جن کے نام 'ب' سے شروع ہوتے، اور اسی طرح۔ ان اونٹوں کے نگران بڑے اچھے لائبریرین تھے۔ "صاحب" کو جس کتاب کی ضرورت ہوتی وہ ذرا سی دیر میں یہ کتاب نکال کر اُس کے سامنے پیش کر دیتے۔

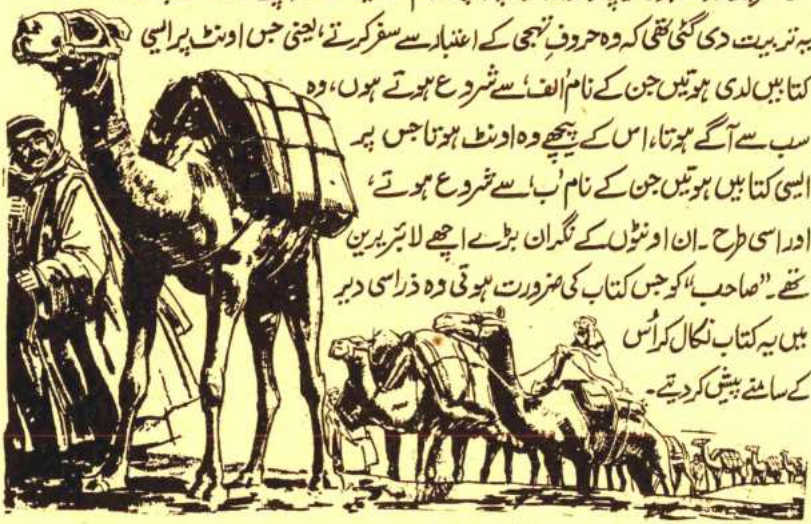

آسمانی بجلی اور گرجا گھر

اسپین میں ایک گرجا گھر ایسا بھی ہے جو صرف بجلی گرنے کی وجہ سے گرجا گھر بنا ہے ورنہ پہلے یہ صرف شہر کی فصیل کا ایک مینار تھا۔ ۱۴ویں صدی میں اس پر بجلی گری تو مینار کے اوپر کا حصّہ ٹوٹ گیا اور ایسی شکل بن گئی جیسے کوئی آدمی بیٹھا ہو۔ مقامی لوگوں نے جب صبح اس مینار کو دیکھا تو انھیں ایسا معلوم ہوا جیسے آدمی کی جو شکل بنی ہے وہ شاہ الفانسو کی شکل ہے۔ اس زمانے میں اسپین میں اسی کی حکومت تھی۔ لوگوں نے بادشاہ سے اس کا ذکر کیا۔ اس نے بھی آکر دیکھا تو یہی کہا کہ یہ شکل اُسی کی ہے؛ چناں چہ اُس نے اس مینار کو گرجا بنا دیا۔

عجیب درخت

ہالینڈ کا یہ درخت قدرتی طور پر اس طرح بڑھا ہے کہ اس کے تنے کا ایک حصّہ جیکوبس وان بیرین نامی ایک شخص کی صورت کا نظر آتا ہے۔ اسی شخص نے یہ پودا لگایا تھا۔

ناچنے والا چانسلر

سر کرسٹوفر ہیٹن ۱۵۴۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۹۱ء تک زندہ رہے۔ انھیں لندن کا لارڈ چانسلر بنایا گیا، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ کوئی بہت بڑے قانون داں تھے، بلکہ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ بہت عمدہ ناچتے تھے۔

صحّت کے اُصول

عفّت گل اعزاز

تن درستی ہزار نعمت ہے! یہ بات سب ہی جانتے ہیں۔ تن درستی نہ ہو تو انسان نہ تو اپنا کوئی کام کر سکتا ہے نہ دوسروں کے کام آسکتا ہے۔ اگر صحت نہ ہو تو زندگی میں کوئی لطف نہیں رہتا بلکہ زندگی ایک ایسا بوجھ بن جاتی ہے جس کو لادے پھرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ انسان کے جسم کے ساتھ ذہن کا بھی صحت مند ہونا ضروری ہے۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو کوئی فکر ہو تو اس کے سر میں درد ہو جاتا ہے یا بھوک اُڑ جاتی ہے یا نیند غائب ہو جاتی ہے۔ ذہنی طور پر انسان مطمئن ہو تو اس کی جسمانی صحت بھی ٹھیک رہتی ہے۔ ایک قوم کے تمام افراد اگر صحت مند ہوں گے تو وہ قوم بھی مضبوط اور توانا ہو گی۔ صحت مند لوگ اپنی محنت اور جدوجہد

سے اپنی قوم کو سربلند اور سرخرو کرتے ہیں۔ کم زور اور بیمار لوگوں کی قوم ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہے۔

اچھی صحت کے لیے جو اصول ضروری ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ جسم گھر اور ماحول کی صفائی ۲۔ مناسب غذا ۳۔ آرام دہ لباس ۴۔ ورزش ۵۔ سیر تفریح۔

جسم، گھر اور ماحول کی صفائی

جسمانی صفائی:

۱۔ روزانہ ورنہ کم از کم تیسرے دن ضرور نہانا چاہیے۔

۲۔ صبح اُٹھ کر دانت اچھی طرح صاف کیے جائیں۔

۳۔ رات کو سونے سے پہلے دانت صاف کرنے چاہییں۔ غذا کے جو ذرات دانتوں میں پھنس جاتے ہیں۔ وہ کچھ دیر میں سڑنے لگتے ہیں۔ اس میں بہت سے جراثیم پیدا ہونے لگتے ہیں جس کی وجہ سے منھ سے بدبُو آنے لگتی ہے اور دانتوں اور مسوڑوں کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

۴۔ دانت صاف کرنے کے لیے مسواک یا نرم برش استعمال کرنے چاہییں۔

۵۔ جگہ جگہ تھوکنا بُری عادت ہے اس سے جراثیم پھیلتے ہیں۔

۶۔ اپنے ہاتھوں اور چہرے کو ہر وقت صاف رکھنا چاہیے۔

۷۔ ناخنوں کو ہفتے دس دن کے بعد کاٹتے رہنا چاہیے، بڑھے ہوئے اور میل بھرے ناخن دیکھنے میں گندے معلوم ہوتے ہیں اور ان میں جراثیم بھی خوب پھلتے پھولتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہوئے یہ میل اور جراثیم پیٹ میں جاکر بیماریاں پھیلاتے ہیں۔

۸۔ اپنے بالوں کی صفائی کا خیال رکھنا چاہیے۔

۹۔ روزانہ بالوں میں کنگھا کرنے سے خون کا دوران تیز ہوتا ہے اور بال مضبوط رہتے ہیں۔

۱۰۔ گھر کے ہر فرد کا کنگھا الگ ہو تو بہتر ہے۔

۱۱۔ آنکھیں بڑی نعمت ہیں ان کی دیکھ بھال بے حد ضروری ہے۔ صحت مند آنکھیں صاف اور

چمک دار نظر آتی ہیں۔

۱۲۔ اگر کبھی آنکھ سرخ ہو، اس میں درد یا کھجلی ہو تو فوراً طبیب سے مشورہ کریں اور آنکھوں کو آرام دیں۔

۱۳۔ پرانی رکھی ہوئی دوائیں کبھی استعمال نہ کریں۔ ہو سکتا ہے ان کی تاریخ گزر چکی ہو اور وہ نقصان دے جائے۔

۱۴۔ کتاب پڑھتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ روشنی کم نہ ہو۔ اندھیرے میں کبھی نہ پڑھیں، اس سے آنکھوں پر زور پڑتا ہے۔

۱۵۔ لیٹ کر نہیں پڑھنا چاہیے۔

۱۶۔ کتاب کو آنکھوں سے ایک فُٹ کے فاصلے پر رکھ کر پڑھیں۔

۱۷۔ ٹھنڈے پانی سے آنکھیں دھونے سے ان پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ آنکھ کا گرد و غبار دُھل جاتا ہے۔

۱۸۔ صبح کے وقت گھاس پر ننگے پاؤں ٹہلنا بھی آنکھوں کے لیے مفید ہے۔

۱۹۔ سرمہ لگانے سے آنکھ کا میل صاف ہوتا ہے اور جراثیم بھی مرتے ہیں۔

۲۰۔ کان میں اگر کھجلی چلے تو ایک تیلی پر روئی لپیٹ کر صفائی کریں۔ کان میں کوئی سخت چیز نہ ڈالیں۔ اس سے کان کا پردہ پھٹ سکتا ہے اور انسان بہرہ ہو سکتا ہے۔

۲۱۔ نہاتے وقت یہ احتیاط ضروری ہے کہ پانی کان میں نہ جائے۔

۲۲۔ اگر کان میں تکلیف ہو تو اُلٹے سیدھے نسخے آزمانے کے بجائے معالج سے علاج کرائیں۔

۲۳۔ ننگے پاؤں پھرنے کی عادت نقصان دہ ہے۔ جوتے پہننے سے پاؤں چوٹ سے محفوظ رہتے ہیں اور صاف بھی رہتے ہیں۔

۲۴۔ اگر خشکی کی وجہ سے پاؤں کی ایڑیاں پھٹ جائیں تو اُن کو گرم پانی سے دھوئیں پھر ویسلین یا تیل لگائیں۔

صاف ستھرا گھر:

۱۔ ہمیں اپنا گھر صاف ستھرا رکھنا چاہیے۔

۲ ۔ گھر میں گندگی نہیں پھیلانی چاہیے ۔ پھلوں کے چھلکے اور دوسرا کوڑا کرکٹ ایک ڈبے میں رکھنا چاہیے جسے بعد میں گھر سے دُور کوڑے خانے میں ڈال دیا جائے ۔

۳ ۔ گھر کی دیواریں صاف ستھری ہوں ۔ سال میں ایک بار دیواروں پر سفیدی کرا لینا چاہیے ۔

۴ ۔ دیواروں اور دروازوں پر سے گرد و غبار صاف کرتے رہنا اور مکڑی کے جالے نہ ہونے دینا چاہیے ۔

۵ ۔ گھر روشن اور کشادہ ہونا چاہیے تاکہ اُس میں خوب روشنی اور تازہ ہوا آتی رہے ۔ اگر گھر تنگ ہو اور وہاں تازہ ہوا اور دھوپ نہ آتی ہو تو ایسی جگہوں پر بیماریاں آسانی سے اور تیزی سے پھیلتی ہیں ۔

۶ ۔ مکھیاں صحت کی دشمن ہیں اور بیماریاں پھیلاتی ہیں مثلاً ہیضہ، ٹائی فائیڈ وغیرہ، اس لیے گھر میں مکھیاں نہ ہونے دیں ۔

۷ ۔ روزانہ گھر کا فرش اور فرنیچر صاف کرنا چاہیے ۔

۸ ۔ صاف پانی استعمال کرنا چاہیے ۔

۹ ۔ گھر میں کچھ پھولوں کی کیاریاں اور پیڑ پودے ہوں تو اچھا ہے ۔ اس سے ہوا صاف رہتی ہے اور ماحول خوب صورت ہو جاتا ہے ۔ ان سے انسان کا دل بھی خوش رہتا ہے ۔

۱۰ ۔ گھر کے تمام افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ مِل جُل محبت سے رہنا ضروری ہے تاکہ سب گھر میں آکر خوش رہیں ۔ لڑائی جھگڑے اور گالی گلوچ سے بچنا چاہیے ۔ اس سے گھر کا سکون برباد ہوتا ہے ۔

ماحول کی صفائی :

۱ ۔ ہمیں اپنے گھر کے ساتھ ساتھ گھر کے باہر کی صفائی کا خیال بھی کرنا چاہیے ۔

۲ ۔ اپنی گلی میں کوڑا کرکٹ نہ پھینکیں، کیوں کہ غلاظت پر مکھیاں بیٹھتی ہیں اور بیماریاں پھیلاتی ہیں ۔

۳ ۔ گھر کے باہر پانی کھڑا نہ رہنے دیا جائے، کیوں کہ کھڑے پانی میں جراثیم اور مچھر پرورش پاتے ہیں اور ملیریا پھیلاتے ہیں ۔

۴ ۔ گھر کے قریب گڑھوں کو مٹی سے بھر دینا چاہیے تاکہ وہاں پانی جمع نہ ہو ۔

۵۔ ہمارے پیارے نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ صفائی نصف ایمان ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے گھر، ماحول اور لباس میں صفائی کا پورا پورا خیال رکھیں۔

۶۔ راستے میں اور سڑکوں پر کہیں کوڑا کرکٹ نہ پھینکیں۔

۷۔ بچّوں کی ایسی تربیت کریں کہ وہ کہیں گندگی نہ پھیلائیں اور خود بھی صاف ستھرے رہیں۔

مناسب غذا

۱۔ غذا زندگی کے لیے ضروری ہے۔ کھانا کھانے سے ہمیں توانائی اور قوت ملتی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کھانا حلال کی کمائی کا ہو۔ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے حلال کر دی ہیں انھیں کھایا جائے اور حرام چیزوں سے پرہیز کیا جائے۔ سائنس نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ جو چیزیں حرام کی گئی ہیں اُن میں بہت سی خرابیاں ہیں، وہ صحت کے لیے مضر ہیں اور بیماری کا باعث ہو سکتی ہیں۔

۲۔ تازہ چیزیں کھائی جائیں۔ باسی سبزیوں اور باسی پھلوں سے انسان بیمار ہو سکتا ہے۔

۳۔ کھانا صاف برتنوں میں پکایا جائے۔

۴۔ کھانے کے اوقات مقرر ہوں۔ بار بار کھانا معدے کو کم زور کر دیتا ہے۔

۵۔ کھانا اچھی طرح چبا کر کھایا جائے۔

۶۔ کھانا آرام اور سکون سے کھائیں اور کبھی کھانے میں جلدی نہ کریں۔

۷۔ کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ اچھی طرح دھوئیں اور منھ صاف کریں۔

۸۔ بہت زیادہ ٹھنڈا یخ پانی پینا مناسب نہیں۔

۹ ۔ روزانہ کم سے کم دس بارہ گلاس پانی پینا صحت کے لیے ضروری ہے۔ پانی صاف ہونا چاہیے۔
۱۰ ۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر لیٹ کر آرام کرنا اور رات کے کھانے کے بعد کچھ دیر آہستہ آہستہ ٹہلنا اچھی عادتیں ہیں، لیکن جن کو دل کی تکلیف ہو وہ نہ ٹہلیں۔
۱۱ ۔ ٹوٹے پھوٹے برتن یا جن میں گرنے کی وجہ سے بال پڑ گیا ہو، استعمال نہیں کرنے چاہییں، کیوں کہ ان دراڑوں میں جراثیم پلنے لگتے ہیں۔

آرام دہ لباس

۱ ۔ لباس ہمیں موسم کے مُضر اثرات سے بچاتا ہے۔ یہ ہمارے جسم کو محفوظ رکھتا ہے۔
۲ ۔ گرمی کے موسم میں ہلکے رنگوں کے ہلکے پھلکے کپڑے پہننے چاہییں۔
۳ ۔ سردیوں میں گہرے رنگوں کے موٹے اور اونی کپڑے اچھے رہتے ہیں، کیوں کہ گہرے رنگ زیادہ حرارت جذب کر کے جسم کو گرم رکھتے ہیں۔
۴ ۔ کپڑے تنگ نہیں پہننے چاہییں۔ لباس ایسا نہ ہو جس میں عریانی ہو۔
۵ ۔ کپڑے صاف ستھرے اور پاک ہوں۔
۶ ۔ کپڑے خوب صورت سِلے ہوئے ہوں، جو دیکھنے میں بھلے معلوم ہوں۔
۷ ۔ بہت زیادہ قیمتی اور بھڑکیلے کپڑے نہیں پہننے چاہییں۔ اس میں تکبّر اور فضول خرچی بھی ہے جو خدا کو پسند نہیں۔
۸ ۔ لباس اپنی عمر کی مناسبت سے پہنیں تو انسان باوقار معلوم ہوتا ہے۔

ورزش

اچھی صحت کے لیے ورزش بہت اہم ہے۔ ورزش سے سانس لینے کا عمل تیز ہو جاتا ہے اس سے خون تیزی سے دوڑتا ہے اور جسم کے تمام پٹھے اور اعضا حرکت کرتے ہیں جس سے ہمیں توانائی حاصل ہوتی ہے اور انسان چُست رہتا ہے۔ اس کی چُستی اور آرام طلبی ختم ہوتی ہے۔
۲ ۔ کھیل کود میں بچّوں کی اور گھریلو کام کاج میں عورتوں کی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔
۳ ۔ بڑی عمر کے لوگوں کو ہلکی ورزش کرنی چاہیے۔ چہل قدمی اور ہوا خوری ان کے لیے مناسب

ورزش ہے۔

۴۔ کھانے کے بعد ورزش نامناسب ہے۔ ورزش خالی پیٹ کرنی چاہیے۔

۵۔ سائکل چلانا، بھاگ دوڑ کے کھیل، کبڈی، ہل چلانا، گھاس کھودنا، گھڑ سواری، کشتی چلانا اور تیرنا یہ سب ورزش ہی کی قسمیں ہیں۔

۶۔ صبح اُٹھ کر نماز کے بعد ٹہلنا یا دوڑنا بھی انسان کو تر و تازہ کرتا ہے۔

سیر تفریح

کام کاج کے بعد کچھ دیر سستا لیا جائے تو تھکن دُور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہفتے دو ہفتے یا مہینے بھر بعد سیر تفریح کے لیے شہر سے باہر کہیں باغوں یا کھیتوں میں جا کر سیر کی جائے اور بے فکری سے کچھ وقت گزارا جائے۔ اپنے پیارے ملک میں سیر تفریح کے لیے بہت سی جگہیں ہیں۔ سال بھر میں ایک بار اپنے ملک میں گھومیں پھریں اور نئی نئی جگہوں کی سیر کریں۔ اس طرح انسانی ذہن تر و تازہ ہو جاتا ہے اور پھر نئے جذبے اور حوصلے کے ساتھ زندگی کی مصروفیات سے نمٹنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ روزانہ دوستوں، سہیلیوں کے ساتھ تھوڑی دیر مل بیٹھنا، ہنسنا بولنا بھی ذہنی صحت کے لیے ضروری ہے۔

اگر کبھی طبیعت خراب محسوس ہو تو فوری طور پر علاج کروا لینا چاہیے۔ اکثر ہماری بے پروائی، غفلت اور سستی کی وجہ سے مرض خوب بڑھ جاتا ہے تو اس کا علاج مشکل ہو جاتا ہے اور اس میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔ تکلیف بھی اُٹھانی پڑتی ہے اور رُپیہ بھی بہت خرچ ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہوں۔ سب کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ کسی کی جو مدد ہو سکے کریں، نیک کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیں۔ اللہ کی ہر چھوٹی بڑی نعمت پر اس کا شکر ادا کریں۔ اس سے اچھی امید رکھیں۔ جو کچھ مل جائے اس پر قناعت کریں۔ لالچ سے بچیں، کیوں کہ ہوس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا اور صحت پر خراب اثر پڑتا ہے۔ اگر زندگی کو شکر اور رضائے الٰہی کے ساتھ گزارا جائے تو دین کے ساتھ صحت بھی اچھی رہتی ہے۔

HMD/HNY-1/85 ADARTS

جمعراتی

مسعود احمد برکاتی

وہ ہر جمعرات کو آتا اور قانیہ اس کو ایک رُپیہ دے دیتی۔ مانگنے والے تو روز ہی آتے ہیں۔ صدا دیتے ہیں۔ طرح طرح کی آوازیں نکالتے ہیں۔ اللہ رسول کا نام لیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچّوں کا واسطہ دیتے ہیں۔ فاقوں کی داستان سناتے ہیں، لیکن وہ ان سب سے الگ تھا۔ کم بولتا تھا اور بس ایک آواز نکالتا تھا:

"اللہ خوش رکھے!"

وہ دوسرے فقیروں کی طرح پچھلی گلی میں بھی نہیں آتا تھا بلکہ سامنے کے دروازے پر آتا اور درد بھرے لہجے میں اللہ خوش رکھے کہہ کر خاموش کھڑا ہو جاتا۔ قانیہ نے اس کو پہلی بار دیکھا تو وہ ایک مظلوم سا انسان نظر آیا۔ اس نے ایک رُپیہ لاکر اس کو دے دیا۔ بس اُس روز سے یہ دستور ہو گیا کہ وہ ہر جمعرات کو آتا، صدا لگاتا۔ قانیہ جلدی سے رُپیہ لاکر دیتی اور وہ ایک بار پھر اللہ خوش رکھے کہہ کر چلا جاتا۔ وہ کسی دروازے پر زیادہ دیر نہیں رُکتا۔ اگر تھوڑی دیر تک کوئی نہیں آتا تو وہ چپ چاپ آگے بڑھ جاتا۔

ایک دن قانیہ کی بڑی بہن ناہید نے کہا، "قانیہ، اس فقیر میں کیا خاص بات ہے کہ تم اس کو ہر جمعرات کو ایک رُپیہ دیتی ہو۔ کسی دوسرے کو دیتی بھی ہو تو صرف چار آنے۔" ان کے ابّو بھی سُن رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ بھئی ہماری بیٹی کی طبیعت میں ہمدردی ہے۔ وہ تو ہر ایک کے ساتھ ہمدردی کرتی ہے۔ کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ ناہید نے کہا، "ابّو، میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ قانیہ دوسرے مانگنے والوں کو تو چار آنے پر ٹرخا دیتی ہے، لیکن جمعراتی کو ایک رُپیہ دیتی ہے اور وہ بھی ہر ہفتے۔"

ابّو نے پوچھا، "کون جمعراتی؟"

ناہید نے اس فقیر کا پورا حال بتایا تو ابّو بولے:

"بات یہ ہے کہ کسی کو دیکھ کر انسان کے دل میں ہمدردی کا جذبہ زیادہ بیدار ہوتا ہے اور کسی کو دیکھ کر کم یا بالکل نہیں۔ قانیہ کو اس شخص سے زیادہ ہمدردی ہوگئی ہے۔"

ابّو کی بات صحیح تھی۔ قانیہ کے دل میں درد تھا۔ وہ کسی کی تکلیف نہیں دیکھ سکتی تھی اور فوراً اس کی مدد کو تیار ہو جاتی تھی۔ اس نے کہا،

"دیکھیے ابّو، باجی نے اس آدمی کو کتنا بُرا نام دیا ہے جمعراتی۔"

ناہید نے تڑخ کر جواب دیا:

"تو کیا میں اس کو نواب صاحب کہوں! وہ جمعرات کو آتا ہے۔ اس لیے میں نے جمعراتی نام رکھ دیا۔ کون سی توہین ہوگئی۔"

ابّو نے دونوں کو سمجھایا کہ بحث نہیں کرتے۔ ایک دوسرے کی بات کو سمجھنا اور غور کرنا چاہیے۔ بحث میں ضد ہو جاتی ہے اور صحیح بات بھی غلط معلوم ہوتی ہے۔ چلو آڈ کھانا کھالو، تمھاری امّی بُلا رہی ہیں۔

چند دن بعد قانیہ کے ابّو کو تجارتی دورے پر ہانگ کانگ جانا پڑا۔ وہ خوش و خرم سب سے مل کر روانہ ہوئے، لیکن چند گھنٹوں بعد ریڈیو نے یہ افسوس ناک خبر دی کہ کراچی سے ہانگ کانگ جانے والا جہاز حادثے سے دوچار ہوگیا۔ تمام مسافر ہلاک ہو گئے۔

قیامت ٹوٹ پڑی۔ سب سے زیادہ کم زور دل قانیہ ہی کا تھا۔ اس نے روتے روتے بُرا حال کر لیا۔ کئی دن کے بعد کچھ صبر آیا۔

اگلی جمعرات کو صبح معمول کے مطابق جمعراتی کی آواز آئی:

اللہ خوش رکھے!

قانیہ مرے دل سے اُٹھی۔ الماری کھولی۔ پرس نکالا اور ایک رُپیہ لے کر دروازے پر پہنچی:

"لو چاچا، آج آخری بار دے رہی ہوں۔"

"کیوں بیٹی؟ اللہ خوش رکھے، کیا بات ہوئی؟"

قانیہ کا دل بھر آیا۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ بڑی مشکل سے اس نے بتایا کہ میرے

البتہ ہوائی جہاز کے حادثے میں ختم ہو گئے۔ اب ..... ہمارا کون ہے۔ معلوم نہیں کیسے کام چلے گا۔

چاچا نے قانیہ کی باتیں بڑی توجہ سے سُنیں۔ ایک آہ بھری اور تھوڑی دیر خاموش کھڑا رہا، پھر اللہ بڑا بادشاہ ہے کہتا ہوا چلا گیا۔

مغرب کے بعد دروازے پر پھر آواز آئی:

"اللہ خوش رکھے!"

پہلے تو قانیہ کو یقین نہیں آیا کہ چاچا اِس وقت کہاں؟ وہ تو صبح ہی آتے ہیں۔ پھر وہ آج ہی تو آئے تھے۔ ایک دن میں دو بار تو کبھی نہیں آئے۔ یہ سوچ رہی تھی کہ دوبارہ اللہ خوش رکھے کی آواز آئی۔ اب قانیہ نے سوچا کہ ضرور کوئی شریر لڑکا چاچا کی آواز بنا رہا ہے۔ ورنہ چاچا نے تو کبھی ایک صدا سے دوسری صدا نہیں دی۔ پھر بھی حیرت اور جستجو اس کو دروازے پر لے گئی۔ اس کی حیرت اور بڑھ گئی۔ کوئی شریر لڑکا نہیں تھا، خود چاچا ہی تھا۔ قانیہ کو دیکھ کر بولا:

"بیٹی! کوئی کسی کو نہیں دیتا، دولت کسی کی ہو کر نہیں رہتی۔ آج اس کے پاس کل اُس کے پاس۔ دل غریبوں کے پاس بھی ہوتا ہے۔ اللہ خوش رکھے۔"

یہ کہہ کر چاچا نے ایک پوٹلی جیب سے نکالی اور قانیہ کے ہاتھ میں تھما دی۔ اِس سے پہلے کہ قانیہ کچھ سمجھ سکتی چاچا جا چکا تھا۔ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا وہ دُور نکل گیا۔

قانیہ نے دیکھا پوٹلی میں نوٹوں کی گڈیاں بندھی ہوئی تھیں۔

پھول کھلے ہیں رنگ برنگے

"شان الحق حقی صاحب کمال کے آدمی ہیں۔ اُن کا قلم چوطرف چلتا ہے ..... کچھ عرصہ ہوا حقی صاحب نے پہلیاں اور کہہ مُکرنیاں لکھیں اور ایسی لکھیں کہ..... چھوٹے بڑے سب سنتے بُوجھتے بیٹھ گئے اور گھنٹوں مزہ لیتے رہے۔ اس بار وہ بچّوں کے لیے مزے دار نظموں کا تحفہ لے کر آئے ہیں۔"

ڈاکٹر جمیل جالبی

بچّوں کے لیے شان الحق حقی کی پیاری پیاری نظموں کا مجموعہ پھول کھلے ہیں رنگ برنگے شائع ہو گیا۔ قیمت ۱۵ روپے

مکتبۂ دانیال، وکٹوریہ چیمبرز، عبد اللہ ہارون روڈ، کراچی

اس بار معلومات عامہ کے بیس سوالات دیے جا رہے ہیں، جو زیادہ مشکل نہیں ہیں۔ ان پر نقد انعام نہیں ہے، لیکن پورے بیس صحیح جوابات بھیجنے والے نونہالوں کے نام ذرا موٹے حروف میں رسالے کے شروع صفحات میں شائع کیے جائیں گے۔ تصویریں ہوں گی تو وہ بھی شائع کی جائیں گی۔ ۱۸ صحیح جوابات بھیجنے والوں کے صرف نام شائع کیے جائیں گے۔ ادارہ ہمدرد نونہال کا فیصلہ آخری مانا جائے گا۔ جوابات کے نیچے نام اور پورا پتا صاف لکھیے۔ آخری تاریخ ۱۵۔ ستمبر ۸۶ء ہے۔

۱۔ کس قصے کو قرآن شریف نے "اَحسنُ القصص" کہا ہے؟

۲۔ "میزبانِ رسولؐ" کن صحابی کو کہا جاتا ہے؟

۳۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے پاکستان کا پہلا وزیرِ دفاع کن صاحب کو مقرر کیا تھا؟

۴۔ برصغیر پاک و ہند کے اُس بادشاہ کا نام تو آپ کو معلوم ہوگا جو دو آدمیوں کو اپنی بغلوں میں دبا کر آگرے کے قلعے کی دیوار پر دوڑا کرتا تھا؟

۵۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے وفادار ہاتھی کا نام کیا تھا؟

۶۔ سندھ کے مشہور ادیب اور دانش ور مرزا قلیچ بیگ نے سب سے پہلے کس محکمے میں ملازمت کی تھی؟

۷۔ جناب نسیم حجازی کا اصل نام محمد شریف ہے، بتائیے مولانا کوثر نیازی کا اصل نام کیا ہے؟

۸۔ کیا پاکستان، بھارت، برما اور سری لنکا نے برطانیہ سے ایک ہی سال آزادی حاصل

کی تھی؟

۹۔ انگریزی کتاب "قائدِ اعظم جناح ــــ اسٹوری اوف اے نیشن" سندھ کے کس مشہور دانش وَر کی تصنیف ہے۔

۱۰۔ کرکٹ کے کھیل میں ایک وِکٹ سے دوسری وِکٹ کا فاصلہ کتنا ہوتا ہے؟

۱۱۔ ایک بار اولمپک کھیلوں میں ہاکی کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ کیا آپ سنہ بتا سکتے ہیں؟

۱۲۔ مشہور عالم، ادیب اور صحافی مولانا ابوالکلام آزاد کس شہر میں پیدا ہوئے تھے؟

۱۳۔ برطانیہ کی موجودہ حکم راں ملکہ الزبتھ کس سال تخت نشین ہوئی تھیں؟

۱۴۔ "مقتدرہ قومی زبان" ایک بڑا ادارہ ہے جو صدر پاکستان نے اردو کو نافذ کرنے کے لیے قائم کیا ہے۔ اس کے موجودہ صدر نشین کا نام آپ کو معلوم ہے؟

۱۵۔ ملک ارجنٹینا کے دارالحکومت کا نام بتا دیجیے۔

۱۶۔ "میں ساز ڈھونڈتی رہی" ایک مجموعۂ کلام کا نام ہے۔ یہ کس شاعر کا مجموعہ ہے؟

۱۷۔ ذرا "البانیہ" کے سکّے کا نام بتائیے۔

۱۸۔ ۱۹۸۶ء میں لاہور کے ایک مشہور اردو رسالے کے مدیر کا انتقال اسلام آباد میں ہوا ہے۔ مدیر کا نام کیا ہے؟

۱۹۔ اوسٹریلیا کی ایک ریاست کا نام برطانیہ کی ایک ملکہ کے نام پر ہے۔ ریاست کا نام بتائیے؟

۲۰۔ کرکٹ کے سلسلے میں آپ نے ایم۔ سی۔ سی کا نام سُنا ہوگا۔ بتائیے آئی۔ سی۔ سی سے کیا مراد ہے؟

معلومات عامہ کے سلسلے میں نونہال بہت دِل چسپی لے رہے ہیں اور اس کے جوابات ہمیں بڑی تعداد میں وصول ہوتے ہیں۔ معلوماتِ عامہ ہے بھی بہت کام کی چیز۔ معلومات ہو تو بہت سے کام آسان ہو جاتے ہیں۔ نونہالوں کو چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے معلومات حاصل کریں۔ یہ کالم آپ کی مدد کرتا ہے۔ آپ کا نام چھپے یا نہ چھپے آپ کی معلومات تو بڑھ جاتی ہے۔

کوشش کیجیے کہ جوابات صرف ایک صفحے پر لکھیں، دوسرا صفحہ نہ لگائیں اور اپنا نام اور مکمل پتا اس کاغذ کے سب سے اوپر صاف صاف لکھیے۔

زیرِ زمین سفر کا مصنّف ــ ژول ورن

شہزاد منظر

ژول ورن کے ناولوں کو شائع ہوئے سو سال سے زیادہ ہو گئے، لیکن اس کی مقبولیت میں کمی نہیں ہوئی۔ مہم جوئی کی اور سائنسی کہانیوں کے شوقین آج بھی اس کی کتابوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہ مشہور فرانسیسی مصنف ۸۔ نومبر ۱۸۲۸ء کو فرانس کے ایک مال دار وکیل کے ہاں پیدا ہوا۔ اسے بچپن سے مہم جوئی کا شوق تھا، چناں چہ وہ بارہ سال کا تھا کہ چپکے سے ایک سمندری جہاز میں کیبن بوائے کی حیثیت سے بھرتی ہو گیا۔ اس کا مقصد اس طرح سمندر کی سیر کرنا اور سنسنی خیز واقعات سے دوچار ہونا تھا۔ اتفاق سے اس کے باپ کو اطلاع مل گئی اور وہ عین جہاز کی روانگی سے پہلے پکڑا گیا۔ اس نے اپنے والد سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ صرف تخیل کے ذریعے سے دنیا کی سیر کیا کرے گا، چناں چہ اس نے آئندہ چل کر اپنے وعدے کو درست ثابت کیا اور دنیا کے مختلف ملکوں کی سیر و سیاحت اور مہم جوئی کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا محض تخیل کی مدد سے لکھا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی کہانیاں اور ناول صرف خیالی اور من گھڑت تھے۔ اس نے تاریخ، جغرافیہ اور دوسرے بہت سے علوم کا مطالعہ کیا۔ دنیا کے مختلف ملکوں کے بارے میں بڑی معلومات حاصل کی۔ اس کے بعد اس نے اپنے تخیّل کی مدد سے مستقبل کے سائنسی ایجادات اور کارناموں کے بارے میں ناول لکھا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے ناولوں میں مستقبل کے جن سائنسی ایجادات کے امکانات کے بارے میں پیشن گوئی کی وہ آگے چل کر درست ثابت ہوئی۔ مثلاً چاند پر انسان کا سفر یا آب دوز کشتی کی ایجاد یا قطب شمالی تک انسان کا کام یاب سفر وغیرہ۔ اس کی ان پیشن گوئیوں کی وجہ سے ہی اسے سائنسی افسانوں کا باوا آدم خیال کیا جاتا ہے۔

اس کا پہلا ناول "غبارے میں پانچ ہفتے" ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا، جس کے چھپتے ہی وہ مشہور ہو گیا اور ساری کتابیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں۔ اس میں اس نے غبارے کے ذریعے سے وسطی افریقہ پہنچنے اور سفر کے دوران پیش آنے والے سنسنی خیز واقعات کو بڑے مزے سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اس نے کئی ناول لکھے جو اب تک مقبول ہیں۔ ژول کا ایک ناول "زیرِ زمین سفر" ۱۸۶۴ء میں شائع ہوا۔ اس دل چسپ ناول کا خلاصہ اردو میں اگلے صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔ نونہالوں کو یہ مہماتی اور سائنسی ناول یقیناً پسند آئے گا۔

اس کے علاوہ ژول ورن کے حسب ذیل ناول شائع ہوئے: (۱) زمین سے چاند تک (۱۸۶۵ء) (۲) بیس ہزار فرسخ سمندر کے نیچے (۱۸۷۰ء) (۳) اسی دن میں دنیا کا سفر (۱۸۷۳ء) ــ ژول ورن نے ۸۰ کتابیں لکھیں۔ ۲۴۔ مارچ ۱۹۰۵ء کو اس کا انتقال ہوا۔

زیر زمین سفر

مصنّف: ژول ورن * ترجمہ: خالد فہیم سبزواری

پہلے تم مجھے اجازت دو کہ میں تم سے اپنا تعارف کراؤں۔ میرا نام ایکسل ہے۔ چند سال پہلے اپنے والد کے انتقال کے بعد میں اپنے چچا استاد لیڈن بروک اور ان کی بیٹی گرو بن کے ساتھ رہنے کے لیے شہر ہمبرگ آیا تھا۔ میں نے اور گرو بن نے خاموشی سے ایک دوسرے سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میرے چچا بہت بڑے عالم تھے۔ وہ یونی ورسٹی میں پتھروں اور دھاتوں سے متعلق علم کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ وہ لمبے چوڑے اور جلالی مزاج کے آدمی تھے۔ انھوں نے مجھے اپنے ساتھ مدد کے لیے کام پر لگا لیا تھا۔ وہ میرے کام سے بہت خوش تھے۔ مجھے بھی ان کے ان کاموں میں کوئی دِقّت پیش نہیں آئی۔

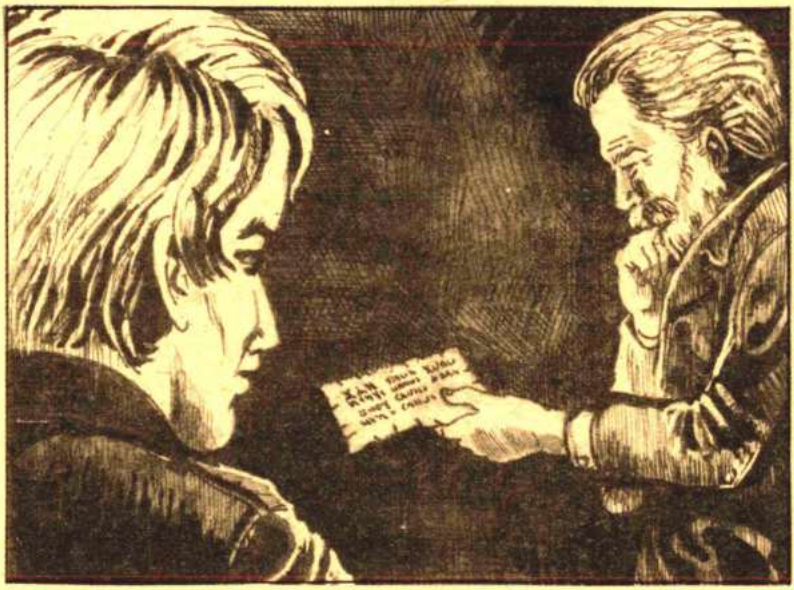

چچا نے دستخط دیکھ کر کہا، "یہ ایرانی سیکنوسم ہے۔"

ایک دن میرے چچا گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں آئس لینڈ کے بارے میں ایک موٹی سی کتاب تھی۔ وہ اس کو اُلٹ پلٹ رہے تھے کہ اس میں سے ایک چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا گرا، جس میں عجیب و غریب زبان لکھی ہوئی تھی۔ ہم نے زبان سمجھنے کی کافی کوشش کی، مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اس کو اُلٹا پڑھا جائے، یعنی آخر سے شروع تک۔ اس طرح پڑھنے سے اس کی تحریر سمجھ میں آنے لگی۔ کاغذ میں لکھا تھا:

"ماہ جون کے آخری دِنوں میں سنفلز کے آتش فشاں پہاڑ پر جاؤ، جس کے دہانے پر تین سوراخ ہیں۔ اُس دن تم دیکھو گے طلوع آفتاب کے وقت صرف ایک سوراخ پر سورج کا سایہ ہوگا۔ اُس سوراخ میں تم اُتر جانا اور زمین کے اندر کی سیر شروع کرنا۔ میں یہ سیر کر چکا ہوں۔"

میرے چچا نے آخر میں کیے گئے دستخط دیکھ کر کہا، "یہ ابرانی سیکنوسم ہے، جو سولھویں صدی میں آئس لینڈ پر رہتا تھا اور یہ بہت بڑا عالم تھا۔ شاید سب سے بڑا عالم! اس نے زیرِ زمین سیر کی تھی۔ ہم بھی اسی طرح کی سیر کرنے والے ہیں۔"

یہ سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے کہا، "کیا ہم زمین کے اندر سیر کو جائیں گے؟" میرے چچا نے جواب دیا، "ہاں ایکسل! ہم بھی اس کے نشانوں اور آثاروں کی پیروی کریں گے اور ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے سفر کے لیے جلد از جلد نکل پڑیں، اس سے پہلے کہ جولائی کے مہینے کا آغاز ہو۔"

اس طرح ہم چند دن بعد ہمبرگ سے روانہ ہوئے۔ چند دن ہم نے کپڑے، دوائیں، کھانے پینے اور سفر کی ضروری چیزیں جمع کرنے میں صَرف کیے۔ میں اور گرو بن اس جدائی سے دل گیر تھے، مگر ہم نے اپنے اُداس دل کو یہ سوچ کر تسلی دی کہ اس مہم سے صحیح سلامت واپس آنے کے فوراً بعد شادی کر لیں گے اور پھر میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں صحیح سلامت واپس آجاؤں گا۔

دس دن بعد ہم ریکجاوِک (آئس لینڈ کے دارالحکومت) پہنچے۔ یہاں ہم نے اپنے چچا کے ایک استاد دوست کے ہاں قیام کیا۔ انھوں نے ہماری اس مہم کو اہمیت دیتے ہوئے ایک آدمی ہمارے ساتھ کر دیا۔ اُس کا نام تھا ہنیز۔ وہ لمبا چوڑا تن درست آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ اُس کے لمبے چوڑے کندھوں تک بال تھے۔

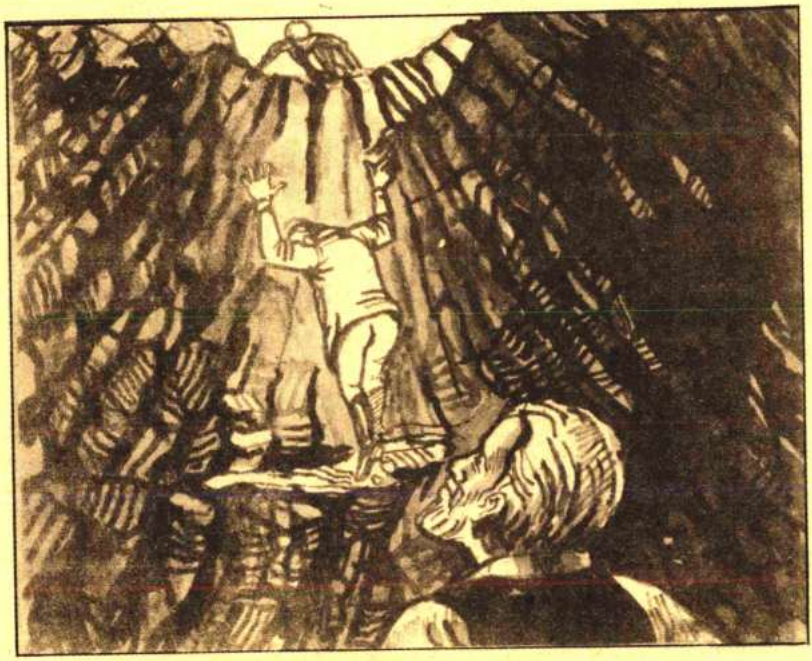

دیوار میں پتھر نکلے ہوئے تھے جس کی مدد سے ہم نیچے اُترنے لگے۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنی سیر کا آغاز دس جون کو کریں گے۔ پھر ہم نے تین گھوڑے، بارود، بندوقیں اور دوائیں خریدیں۔ میرے چچا نے دو قُطب نما اور دوسرے آلے اپنے ساتھ رکھ لیے۔ مجھے اس بات سے بھی کافی اطمینان ہوا کہ انھوں نے دو ٹارچیں بھی ساتھ رکھ لیں۔ ہم نے اپنے سامان میں کھانے پینے کی چیزیں بھی رکھ لیں جو چھ مہینے تک کے لیے کافی ہوں۔ مجھے اس بات پر تعجب ہوا کہ ہم اپنے ساتھ پانی لے کر نہیں جارہے ہیں سوائے اس پانی کے جو ہمارے تھرموسوں میں تھا۔ میں نے اپنے چچا سے اس کی وضاحت کرنی چاہی تو انھوں نے کہا، "زمین کے اندر ہمیں بہت سے چشمے ملیں گے، جن میں سے ہم جب بھی چاہیں اپنے تھرموس میں ضرورت کے مطابق پانی بھر لیں گے۔ اس بات سے مجھے پوری طرح اطمینان ہو گیا، کیوں کہ مجھے اس بات کا علم تھا کہ آئس لینڈ میں گرم پانی کے اُبلتے ہوئے چشمے ہوتے ہیں۔ ہمارے

اس سفر کے بارے میں اور بھی بہت سے سوال میرے ذہن میں آ رہے تھے، جن میں ایک سوال آتش فشاں پہاڑ کے اُبلنے کا تھا۔ میں نے اپنے چچا سے پوچھا، "ہمیں کیسے معلوم ہو گا کہ یہ آتش فشاں پہاڑ جامد ہے اور اب کبھی نہیں اُبلے گا۔ اگر یہ پہاڑ ۱۲۲۹ء سے اب تک نہیں اُبلا تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ یہ اب کبھی اُبلے گا ہی نہیں۔"

میرے چچا نے جواب دیا، "ڈرو نہیں، اس پہاڑ کے دوبارہ اُبلنے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ ہم محفوظ ہیں۔"

پھر میں لگاتار سوالات پوچھنے کے بعد خود خاموش ہو گیا، کیوں کہ میرے چچا کو زیادہ سوال کرنا پسند نہ تھا۔

اس طرح ہم نے اپنا سفر شروع کیا۔ ایک ہفتے بعد ہم سنفلز کے آتش فشاں پہاڑ پر پہنچ گئے۔ چڑھنے میں ہمیں کافی دِقّت کا سامنا کرنا پڑا۔ ہوا بھی اُس وقت بہت تیز چل رہی تھی۔ مگر ہم نے ہمّت نہ ہاری۔ پہاڑ کی چوٹی پر ہم رات کے وقت پہنچے۔ رات کے وقت ہم گہری نیند سوئے۔ صبح کے وقت ہم تازہ دم اُٹھے اور نیچے اُترنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس پہاڑ کے دہانے میں تین سوراخ تھے۔ جس سوراخ پر سایہ ہو اس کو ڈھونڈنے کے لیے میرے چچا ایک سوراخ سے دوسرے سوراخ کی طرف دوڑنے لگے۔ یہ جون کے مہینے کا آخری دن تھا اور اسی سوراخ سے زمین کے اندر جانے کا راستہ تھا۔

ایک سوراخ کے قریب ایک پتّھر رکھا ہوا تھا۔ میرے چچا نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "اِدھر دیکھو!" میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس پتّھر پر اسی عجیب و غریب زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ جب میں نے وہ عبارت دیکھا تو اس پر لکھا ہوا تھا: "ابرانی سیکنوسم۔" یہ وہی سوراخ ہے جس کو ہم تلاش کر رہے تھے۔ اب ہمیں کسی قسم کا شک نہیں رہا۔

تیس جون کو ہم نے اپنا سامان اپنی اپنی پیٹھ پر لادا اور یہ خطرناک اور تھکا دینے والا سفر شروع ہوا۔ جب میں نے سوراخ کے اندر جھانکا تو مجھے چکّر آنے لگے۔ اس سوراخ کی دیوار نوّے درجے کے زاویے کی طرح بالکل سیدھی کھڑی تھی، لیکن اس دیوار میں کُھردرے پتّھر نکلے ہوئے تھے جس کی مدد سے ہم آہستہ آہستہ نیچے اُترنے لگے۔ ہم احتیاط سے رُکتے ہوئے نیچے کی طرف اُتر رہے تھے۔ ساڑھے دس گھنٹے بعد ہم سوراخ کے بالکل نیچے پہنچ گئے۔ ہم آٹھ

سو پچاس میٹر نیچے اُتر چکے تھے۔ اس رات ہم چھوٹے سے گول سوراخ سے آسمان پر چمکتا ہوا ستارہ دیکھ سکتے تھے۔

دوسرے دن ہم نے اپنا سامان اپنی پیٹھ پر لادا۔ چچا نے ٹارچ جلائی اور ہم نے ایک اندھیری سرنگ میں چلنا شروع کر دیا۔ یہ سرنگ بہت ڈھلواں تھی۔ بڑی دقّت سے ہم نے اپنے کو پھسلنے سے محفوظ رکھا۔ خاصی دیر چلتے رہنے کے بعد چچا نے رُکنے کو کہا۔ ہم نے بیٹھ کر کھانا کھایا اور تھوڑا سا پانی پیا۔ ابھی تک ہمیں زمین کے اندر کوئی بھی چشمہ نہیں ملا۔ ہم ابھی تک اپنے پانی میں سے آدھا پانی صَرف کر چکے تھے۔ دوسرے دن میں حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔ جس سُرنگ میں ہم لوگ چل رہے تھے وہ اونچائی کی طرف جا رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں دُعا کر رہا تھا کہ یہ راستہ ہمیں زمین پر لے جائے۔ گرد و بن کی یاد نے مجھے بے چین کر دیا مگر دوسرے ہی دن میرا شک غلط نکلا اور ہمارا راستہ گہرائی کی طرف جا رہا تھا۔ اس وقت تک

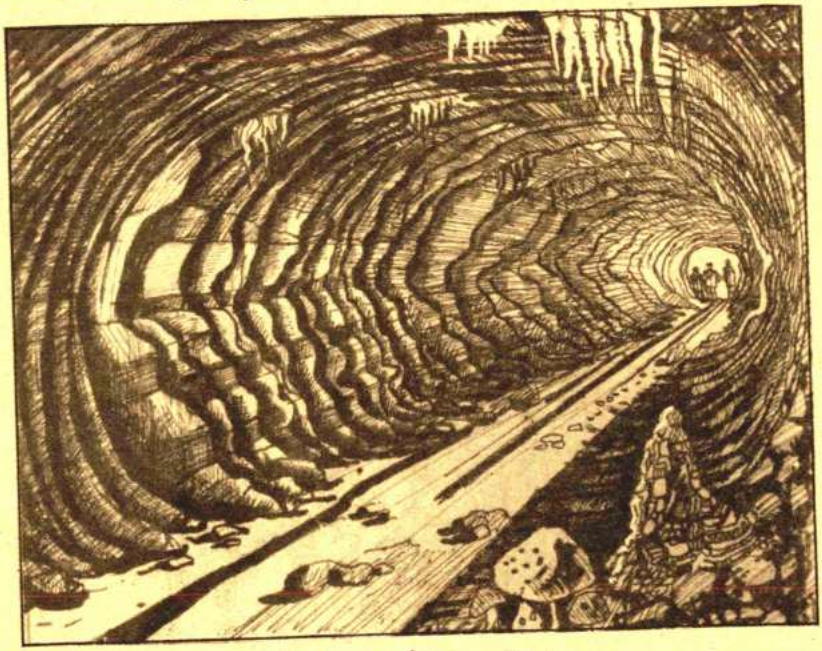

ہم نے ایک اندھیری سُرنگ میں چلنا شروع کر دیا۔

ہمیں پانی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیے۔ مجھے کافی بے چینی ہونے لگی، کیوں کہ ہمارے پاس اب آدھا تھرماس پانی بچا تھا۔ ہم آگے بڑھتے چلے گئے اور یہ خیال ہمیں بے چین کرتا گیا کہ ہم پانی کے بغیر کیا کریں گے۔ اچانک ٹارچ کی روشنی میں اپنے سامنے ایک دیوار نظر آئی۔ ہم نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، مگر کوئی بھی راستہ نظر نہ آیا۔ شاید ہم راستہ بھول گئے تھے۔ ہمیں چاہیے تھا کہ ہم واپس پیچھے کی طرف جائیں تاکہ ہمیں صحیح راستہ مل سکے۔

ایک اور دن گزر گیا۔ ہم نے اپنے ساتھ لے جائے ہوئے پانی کا آخری قطرہ بھی پی لیا تھا۔ ہمارے دو دن پانی کے بغیر اور گزر گئے۔ ہمارے دل میں خوف بیٹھ گیا۔ اب ہم آگے بڑھنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے، اس لیے ہم ایک جگہ آرام کرنے کے لیے ٹھیر گئے۔ میں نے اپنے چچا سے درخواست کی کہ واپس زمین کی طرف چلیں، مگر ان کو معلوم تھا کہ ہمیں ضرور پانی ملے گا۔ پھر میں نے ہینز سے واپس جانے کی بات کی، مگر وہ میرے چچا کے احکام پر عمل کرنے پر بہت خوش تھا۔ میرے چچا نے جب یہ دیکھا کہ میں بہت گھبرا رہا ہوں تو انھوں نے یہ کہنا کافی سمجھا کہ "میرے اوپر اعتماد رکھو ایکسل" اب میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا کہ میں ان پر اعتماد کروں۔ ہم تھوڑی دیر سوئے، جس سے ہم میں ذرا سی طاقت پیدا ہو گئی۔ پھر ہم نے دوبارہ نیچے اُترنا شروع کیا مگر بعد دوپہر مجھ پر وحشت طاری ہونے لگی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم پتھروں کی جیل میں بند ہیں اور ہم اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہا اور دھڑام سے گر پڑا۔ میں نے اپنے اطراف میں موجود چیزوں کو چھو کر دیکھا۔ میں نے محسوس کیا چچا میرے برابر میں سو رہے تھے۔ مجھے کسی چیز کی آواز سنائی دی۔ میں نے اپنا سر اُٹھایا اور غور سے دیکھا تو ہینز لالٹین اُٹھائے دُور جاتا ہوا نظر آیا تو میں نے اپنے دل میں کہا، ہمارا امین مددگار ہمیں اسی جگہ پر نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کے بعد مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہو گیا اور میں ہینز کی واپسی پر بیدار ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ میرے چچا کو ہلا کر جگا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ اس نے کسی غار میں پانی کے بہنے کی آواز سُنی ہے۔ ہم یہ خوش خبری سُن کر جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ہم آہستہ آہستہ اُترنا شروع ہوئے۔ پانی کی آواز نے مجھے نئی زندگی دی تھی، مگر ابھی تک ہمیں پانی نہیں ملا تھا اور ہم جتنا نیچے اُترتے تھے پانی کی آواز کم ہوتی جاتی تھی۔ پھر جس جگہ پانی کی

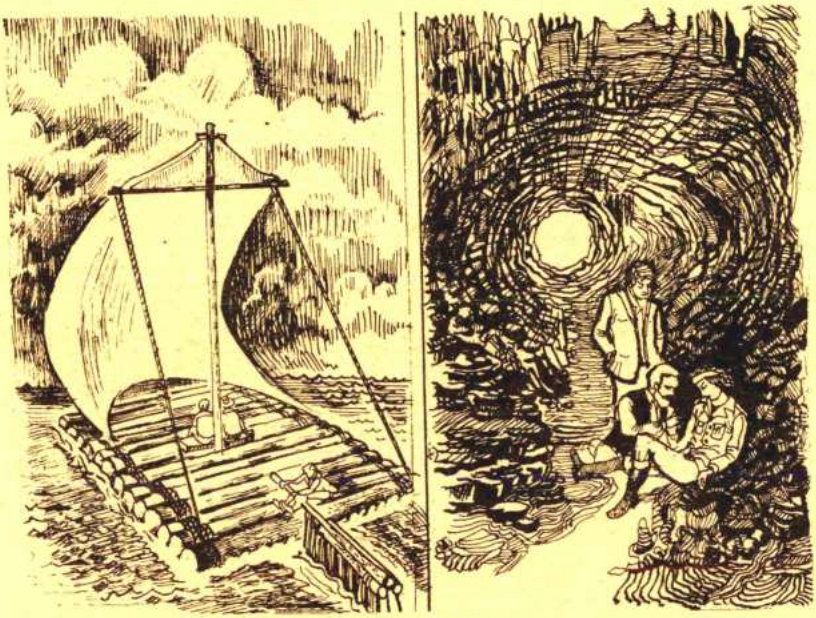

میرے سر میں چوٹ لگی اور میں بے ہوش ہو گیا۔

آواز زیادہ تھی ہم وہیں واپس آئے۔ ہینز نے اپنا کان پتھر کی دیوار پر رکھا۔ اس کو پتھر کے پیچھے سے کسی نہر کے بہنے کی آواز آنے لگی۔ اس نے کلہاڑی تھامی اور پوری قوت سے دیوار پر مارنی شروع کر دی کہ یکایک پتھر پھٹا اور بڑے شور سے پانی کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ ہینز زور سے چلّایا، جیسے کہ پانی سے اس کو کچھ تکلیف پہنچی ہو، کیوں کہ پانی شدید گرم تھا۔ ہم نے اپنے تھرماسوں میں پانی بھرا اور اُسے ٹھنڈا ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔ پھر ہم نے ہلکے ہلکے پانی پینا شروع کیا اور اس اُچھلتے ہوئے پانی نے چشمے کی صورت اختیار کر لی اور سرنگ کی جانب اپنا راستہ بھی بنا لیا۔ ہم نے اس کا نام 'ہینز کا چشمہ" رکھ دیا۔ اس نسبت سے کہ اس نے ہمیں نئی زندگی دی تھی۔ یہ پانی جو ہم کو ملا تھا اس نے مجھے قوت دی اور میرے دل میں اعتماد واپس آ گیا کہ یہ چشمہ دیوار کے ساتھ ہمیشہ بہتا رہے گا اور راستہ بنانے میں ہماری صحیح راہ نمائی کرے گا۔

میرے چچا کے حساب سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ ہم زمین سے گیارہ کیلو میٹر نیچے اور یکیاوک سے جنوب مغربی میں ایک سو بیس کیلو میٹر دُور ہیں، مگر میرے چچا نیچے اُترنے کے خواہش مند

تھے۔ اُن کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہم لوگ لمبی پتھریلی کھائی کے کنارے پر پہنچ گئے ہیں، مگر ہم کٹے کٹے پتھروں کے ذریعہ سے اترتے گئے۔ ہم لوگ اس جگہ پر تھے کہ جو بحر اوقیانوس سے تیس کیلو میٹر نیچے اور ہماری روانگی کی جگہ سے دو سو کیلو میٹر دُور تھے۔ پھر ہم روزانہ چند کیلو میٹر نیچے اُترنے لگے۔ ایک دن میں ہاتھ میں ٹارچ لیے سب سے آگے چل رہا تھا کہ اچانک میں نے اپنے آس پاس کسی کو نہ پایا۔ میں واپس آیا اور پھر آواز دی، مگر اُس کا کوئی جواب نہ آیا۔ دوسری تیسری دفعہ پھر میں نے آواز دی، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے اپنے دل میں کہا، مجھے چشمے کے ساتھ ساتھ واپس جانا چاہیے اور پھر میں چشمے کا پانی پینے کے لیے مُڑا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ وہاں چشمہ موجود نہیں تھا۔ میں راستہ بھول گیا۔ واپس جانے کے لیے مجھے بہت مشکلات پیش آئیں اور مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں نے اُترتے وقت کون سا راستہ اختیار کیا تھا اور جب میں بھٹکتا پھر رہا تھا کہ اچانک میرا سر کسی پتھریلی دیوار سے ٹکرایا اور میں گر پڑا۔ میرے ہاتھ سے ٹارچ گر کر بجھ گئی۔ میں اپنے آپ کو اس گہری اندھیری جگہ پر کھویا ہوا پا کر سخت پریشان ہوا اور ایک دیوار سے دوسری دیوار تک دوڑنے لگا۔ آخر میں ناکام اور نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پھر مجھے اس گہری خاموشی میں کچھ آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کسی کے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ہیں پاگل ہو گیا ہوں؟ میں نے اپنا کان برابر والی دیوار پر رکھا تو مجھے کچھ آوازیں سنائی دیں، مگر میں ان کا مطلب نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ میں نے اپنی پوری قوت سے چیخ ماری، "بچاؤ!" اور تھوڑی دیر انتظار کیا، لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے اپنا کان دوسری دیوار پر رکھا۔ آخر مجھے اپنے چچا کی آواز سنائی دی۔ وہ چلّا کر کہہ رہے تھے، تم کہاں ہو ایکسل!

میں چلّایا، "معلوم نہیں، مگر میں بھٹک گیا ہوں۔"

انھوں نے جواب میں کہا، "ڈرو نہیں، ہم بہت بڑے غار میں ہیں جس سے بہت سُرنگیں آ کر ملتی ہیں۔ اگر تم اُترنا شروع کرو تو ہم تک پہنچ جاؤ گے۔"

میں نے اس ڈھلوان سے نیچے اُترنا شروع کیا۔ ڈھلوان اور زیادہ پھسلنی ہوتی گئی جس کی وجہ سے میں بار بار پھسلتا گیا، پھر مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرے نیچے سے زمین غائب ہو گئی

اور میں نیچے جا گرا۔ میرے سر پر شدید چوٹ لگی اور میں تکلیف کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا۔ پھر جب میرے ہوش و حواس ٹھکانے آئے اور میں نے اپنی آنکھیں آہستہ سے کھولیں، تو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ چچا میرے سامنے موجود ہیں اور جب میں نے ہلنے کی کوشش کی تو چچا نے حیرت زدہ انداز میں کہا، "تم ٹھیک ہو ایکسل! ذرا سی دیر میں تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ اب تھوڑی دیر سو جاؤ تاکہ تمھارے جسم میں طاقت آجائے۔"

کم زوری کے عالم میں، میں نے چچا سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ آخر ہوا کیا تھا اور گہری نیند میں غرق ہو گیا۔

دوسرے دن صبح میرے سر پر بندھی ہوئی پٹّی مجھے تکلیف دے رہی تھی، پھر بھی مجھے اپنے جسم میں تھوڑی بہت طاقت محسوس ہوئی۔ ناشتے کے وقت چچا نے مجھے بتایا کہ پتھر میری سرنگ میں گرے تھے، جہاں میں تھا اور میں پتھروں کے ساتھ گر کر اس سُرنگ میں پہنچ گیا جس میں اب میں موجود ہوں۔ اس حادثے کے بعد میرا زندہ رہنا بہت بڑا معجزہ ہے۔

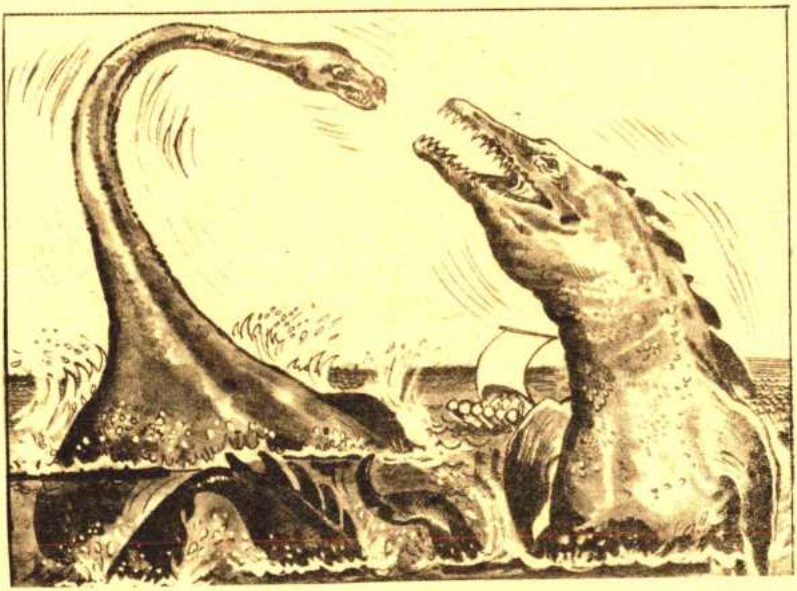

سمندر سے دو بہت ہی خوف ناک جانور نمودار ہوئے۔

جب میری طبیعت بالکل ٹھیک ہوگئی تو میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ مجھے روشنی کے بغیر بھی صاف نظر آرہا تھا اور ہوا کی لہروں اور پانی کی موجوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں سمجھا کہ یہ سب کچھ جو میں سُن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں، یہ سب وہم اور خیال ہے۔ جب میں نے چچا سے پوچھا تو ان کا جواب تھا، "یہ جو تم دیکھ اور سُن رہے ہو سب حقیقت ہے خیال نہیں۔"

میں حیرت زدہ انداز میں بولا، "کیا ہم زمین پر واپس آگئے؟"

چچا نے خوش ہو کر کہا، "نہیں، تھوڑی دیر بعد تم خود دیکھو گے کہ ہم زمین پر واپس نہیں آئے ہیں اور جب تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو ہم اپنا سفر پھر شروع کریں گے۔" میں نے اپنے دل میں سوچا کہ لفظ "سفر" سے ان کا کیا مطلب ہے۔ میں نے کہا، "چچا جان، میں اب تن درست اور ٹھیک ہوں۔ مجھے دکھائیے آپ کو کیا ملا ہے۔"

ہم اس ہلکی روشنی والے غار میں سے نکلے تو ہمارے سامنے کافی روشنی پھیل گئی۔ اب ہمارے سامنے پھیلا ہوا سمندر روشنی میں نظر آرہا تھا۔ چچا نے فخر سے کہا، "میں نے اس سمندر کا نام لیڈن بروک رکھا ہے۔" اور واقعی وہ بہت بڑا سمندر تھا۔ ساحل سمندر پر موجیں اپنا غصّہ دکھا رہی تھیں اور پتھر کی چٹانیں سمندر میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں، مگر یہ روشنی سورج کی روشنی کی طرح گرم نہ تھی اور نہ چاند کی روشنی کی طرح ٹھنڈی۔ یہ روشنی درمیانہ قسم کی تھی۔ ہم ابھی تک اپنے آپ کو کسی غار یا سرنگ میں سمجھ رہے تھے۔ یہ سمندر نما سُرنگ کئی کیلو میٹر اونچی تھی۔ ہمارے سر کے اوپر چھوٹے ہوئے بادل زمین کے بادلوں کے مقابلے میں بہت اونچے تھے اور اس سرنگ کی لمبائی اور چوڑائی معلوم کرنا ہمارے بس میں نہ تھا۔ ہمارے سامنے یہ سمندر اتنی دُور تک پھیلا ہوا تھا کہ ہمارے لیے اس کے کناروں کا اندازہ لگانا ممکن نہ تھا۔ زندگی کے چالیس دن اس اندھیری سرنگ میں گزارنے کے بعد اس سمندر کو دیکھ کر خوشی محسوس ہوئی اور اس کے تازہ ہوا کے جھونکوں میں ہم نے اطمینان کی سانس لی۔ میں اور چچا سمندر کے کنارے چلتے چلتے دُور نکل گئے۔ آخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سانپ کی چھتری کے دیو قامت درخت تھے۔ یہ تقریباً دس بارہ میٹر اونچے تھے۔ ہم نے ان درختوں کے علاوہ بھی اور بہت سے پودے دیکھے، لیکن یہ سب اُس قسم کے تھے جو لاکھوں اور کروڑوں سال پہلے زمین پر پائے جاتے تھے۔

سمندر کے کنارے ہم نے ان جانوروں کے ڈھانچے بھی دیکھے جو تاریخ سے بھی پہلے اس دنیا میں موجود تھے۔ چچا کسی بھی صورت میں سمندر کو پار کرنے کے لیے بے چین تھے۔

دوسرے دن مجھے ایسا لگا کہ جیسے میری طاقت اور صحت واپس آگئی ہے، یہاں تک کہ ناشتے سے پہلے میں سمندر میں نہایا بھی۔ ناشتا ہینز نے تیار کیا تھا۔ چچا کے حساب نے یہ پتا لگایا کہ ہم زمین کے اندر ایک ہزار چار سو کیلو میٹر آئس لینڈ سے دُور ہیں اور ہم لوگ ابھی تک جنوب مشرقی جانب بڑھ رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم لوگ اسکاٹ لینڈ کے نیچے ۱۳۰ کیلو میٹر دُور تھے۔

میں نے چچا سے پوچھا، "ہم زمین کی گہرائیوں میں کس طرح اُتریں گے، جب کہ ہمارے سامنے یہ لمبا سمندر ہے؟"

چچا نے جواب دیا، "اس کا مجھے علم نہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ہم نے یہ سمندر پار کر لیا تو ہمیں ایسے راستے ملیں گے جن سے ہم پھر زمین کی گہرائیوں میں اترنے لگیں گے۔" پھر میں نے پوچھا، "ہم سمندر کشتی کے بغیر کیسے پار کریں گے؟" چچا نے جواب دیا، "کشتی بنانے کا کام ہینز نے اپنے ذمّے لے لیا ہے۔"

اور شام کے وقت کشتی سمندر کی لہروں کے کنارے چلنے کے لیے تیار تھی۔

دوسرے دن ہم نے اپنا سامان کشتی میں رکھا اور کشتی پر ایک بڑا سا بادبان بھی لگا لیا۔ ہینز نے چپّو سنبھالا اور چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہم نے چلنے سے پہلے اس بندرگاہ کو گردبن کا نام دے دیا اور گردبن کے خیال نے مجھے اپنے وطن کی یاد دلا دی۔

کشتی ہمیں اپنے اوپر لادے ہوئے خوش گوار ہوا میں پانی کی لہروں سے ٹکراتی ہوئی دُور تک نکل گئی۔ ہینز نے سمندر میں ڈور ڈال کر ایک بڑی مچھلی پکڑ لی۔ چچا نے کہا، "اس قسم کی مچھلیاں زمین کے سمندروں سے بہت زمانے پہلے غائب ہو چکی ہیں۔" ہمیں کشتی میں بیٹھے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے لیکن ابھی تک ہمیں زمین نظر نہیں آئی۔ چچا کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہونے لگی۔ ان کو زیرِ زمین جانے کی بڑی آرزو تھی۔ ان کو خدشہ ہوا کہ کہیں ہم نے کوئی غلط راستہ تو نہیں اپنا لیا۔ بہرحال ہم لوگ خاموشی سے راستہ کاٹنے لگے۔ چچا نے کدال کو رسّی میں باندھا اور سمندر میں ڈال کر سمندر کی گہرائی ناپنے لگے۔ معلوم ہوا کہ رسّی کی لمبائی پینتیس کیلو میٹر ہے۔ پھر بھی یہ رسّی سمندر

میں نے اپنے آپ کو کشتی کے مستول سے باندھ لیا۔

کی تہ تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ جب کدال کو اوپر کھینچا تو اس کے لوہے پہ دانتوں کے نشانات نظر آئے۔ ہم نے سوچا کہ یہ نشانات کسی بہت بڑے مگر مچھ یا کسی دیو قامت جانور کے ہی ہو سکتے ہیں۔ اس بات کو اہمیت دیتے ہوئے ہم نے اپنی اپنی بندوقیں سنبھال لیں۔ ہمیں یہ احساس ہو رہا تھا کہ خطرہ چاروں طرف سے ہمیں گھیرے ہوئے ہے، مگر ابھی تک کچھ نظر نہیں آیا۔ تھوڑی دیر بعد میری آنکھ لگ گئی اور میں سو گیا۔ جلد ہی مجھے کسی زور کے جھٹکے نے جگا دیا۔ ہماری کشتی تیس میٹر سے بھی زیادہ دُور جا گری تھی۔ ہینز نے ایک طرف کچھ فاصلے پہ اشارہ کیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بہت بڑا جسم ہے جو کبھی پانی میں چلا جاتا ہے کبھی پانی کے اوپر تیرنے لگتا ہے۔ وہ چیز اپنی اس شکل و صورت میں دیو قامت مچھلی معلوم ہو رہی تھی۔ چچا نے دُور ایک بڑی خوف ناک پانی کی چھپکلی اور دیو قامت مگر مچھ کی طرف اشارہ کیا اور کہا، "یہ خوف ناک وھیل مچھلی ہے۔ دیکھو کیسے اپنی دُم کو پانی میں مار رہی ہے۔"

یہ مناظر دیکھنے کے بعد ہمارے جسم خوف سے لرزنے لگے۔ سب سے چھوٹا جانور جو ہم نے دیکھا تھا وہ کشتی کے دو ٹکڑے تقسیم کر سکتا تھا۔ اس کے بعد سمندر سے اور بھی زیادہ خوف ناک دو وحشی جانور نمودار ہوئے۔ ایک دیو قامت کچھوا، دوسرا دس میٹر لمبا سانپ۔ یہ سارے خوف ناک جانور ہمارے قریب آنے جا رہے تھے۔ میں نے اپنی بندوق پکڑی اور تیار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ کچھوا اور مگرمچھ ہمارے خاصے قریب آ گئے، لیکن باقی سارے جانور پانی میں غائب ہو گئے۔ میں اپنی بندوق چلانے ہی والا تھا کہ اچانک مجھے ہینز نے روک لیا۔

ان دونوں جانوروں نے ہم پر حملہ نہیں کیا، بلکہ ایک دوسرے کو ہی دبوچ لیا۔ ہم یہ منظر اپنی آنکھوں کے سامنے بالکل صاف دیکھ رہے تھے۔ یہ دو جانور تاریخ سے پہلے اس دنیا پر آباد تھے۔ ایک کا نام ماہی سوسمار (ICHTHYOSAURUS) اور دوسرے کا میان حیاتی سوسمار (PLESIOSAURUS) تھا۔

ماہی سوسمار کی لمبائی تقریباً تیس میٹر تھی اور اس کے ہاتھ پاؤں بہت بڑے اور خوف ناک تھے اور میان حیاتی سوسمار موجوں سے دس میٹر اونچی گردن والا جانور تھا۔ ان دونوں کی آپس میں زبردست لڑائی ہوتی رہی۔ اس لڑائی سے جو لہریں نمودار ہو رہی تھیں وہ کشتی کو اُلٹ سکتی تھیں۔ ان دونوں کی لڑائی تقریباً دو گھنٹے جاری رہی پھر دونوں پانی کے اندر غائب ہو گئے۔ چند لمحوں بعد میان حیاتی سوسمار کا زخمی سر پانی کو مارتا ہوا ہوا میں لہراتا ہوا پانی سے اوپر آیا اور پھر آہستہ آہستہ اس کی طاقت کم ہونی شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ وہ بالکل بے حس و حرکت ہو گیا۔ یہ لڑائی دونوں جانوروں میں سے ایک کی جیت پر ختم ہوئی تو ہم نے سکون کا سانس لیا۔ دوسرے جانوروں کا پانی میں موجود رہنا ہمارے لیے خطرناک تھا۔

ہمیں کشتی میں سفر کرتے ہوئے پانچ دن گزر گئے۔ چھٹے روز ہم نے پانی کا ناگوار شور سُنا۔ شروع میں تو میں یہ سمجھا کہ یہ لہروں کی آواز ہے جو پتھروں اور چٹانوں سے ٹکرا رہی ہیں یا یہ پھر کسی بہتے ہوئے آبشار کی آواز ہے۔ ہینز اس آواز کا جائزہ لینے کے لیے ستول پر چڑھ گیا۔ اس نے ایک لمبا سا فوارہ پانی سے اوپر اُٹھتا دیکھا۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ یہ کوئی دوسرا دیو قامت جانور ہے۔ اس کے بعد ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ ضرور کسی جانور کا جسم ہے، جس کی لمبائی تقریباً ایک کیلو میٹر ہے اور یہ فوارہ اس جسم کے مرکز سے پھوٹ رہا ہے۔ اس تصور سے ہمارے اوسان

خطا ہو گئے۔

یکایک ہینز زور سے چیخا "یہ جزیرہ ہے!"

میں نے چچا سے پوچھا "مگر یہ کون سا فوارہ ہے؟" چچا نے مجھے تسلی تشفّی دی تو میرا ڈر کم ہو گیا۔ یہ حیرت انگیز فوارہ اب صاف دکھائی دینے لگا۔ روشنی اس فوارے کے اوپر قوس و قزح کی شکل بنا رہی تھی۔ ہم اپنی کشتی اس جزیرے کے کنارے لے گئے اور اس جزیرے پر اُتر گئے تو ہمارے پیروں تلے زمین گھڑگھڑانے لگی۔ اس زمین میں حرارت بہت زیادہ تھی۔ اس فوارے کا کھولتا ہوا پانی زمین سے اُٹھ کر ہوا میں بادلوں میں تبدیل ہو رہا تھا۔ یہ کھولتا ہوا پانی ضرور کسی زیرِ زمین الاؤ سے اُبل کر نکل رہا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ زیرِ زمین الاؤ ہم سے زیادہ دُور نہیں، لیکن جب میں نے چچا سے اپنے خوف کا اظہار کیا تو وہ قدرے خفا ہوئے۔ میں یہ جان کر خاموش ہو گیا کہ میرا قیاس شاید درست نہیں۔ جزیرہ چھوڑنے سے پہلے میں نے دیکھا کہ ہم گردبن کے ساحل سے ایک ہزار اسّی کیلو میٹر دُور ہیں، جہاں سے ہم نے اس سمندر کا سفر شروع کیا تھا۔ یقیناً ہم اس وقت زمین کے اُس حصّے میں تھے جو انگلینڈ کے نیچے واقع ہے۔ اگلے دن ہوا کی حرکت کچھ تیز تھی اس لیے ہماری کشتی کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ پھر بادل آپس میں آکر مل گئے اور آسمان پر اندھیرا چھا گیا اور گرج چمک کے ساتھ ہوا چلنے لگی۔ ادھر چچا غصّے سے لال پیلے ہو رہے تھے۔ وہ اپنے ارادے میں ذرا بھی خلل یا تاخیر پسند نہیں کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ میں طوفان کے آنے سے پہلے بادبان نیچے گرا لوں، مگر چچا نے منع کر دیا اور کہا "آندھی ہمیں اپنے ساتھ لے جائے گی۔ ہو سکتا ہے ہم اس وسیع سمندر سے نکل کر کسی اور کنارے پر پہنچ جائیں۔" آخر تیز و تند ہوا نے اپنا رنگ دکھایا اور شدید طوفان ہم پر حملہ آور ہو گیا۔ اس طوفان میں ہماری کشتی کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ میں اور میرے چچا کشتی کے مستول سے چپک کر کھڑے ہو گئے، مگر ہینز کشتی کے چپّو کو بڑے اطمینان سے تھامے رہا اور بجلی آسمان میں اِدھر سے اُدھر عجیب عجیب انداز سے کوند رہی تھی۔ اس کی روشنی میں کشتی کی ہر چیز چمک رہی تھی۔ ہوا ہماری کشتی کو بڑے خوف ناک انداز میں دھکیلتی ہوئی لے جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد شدید بارش شروع ہو گئی اور ہمیں ٹھنڈ لگنے لگی۔ زبردست تلاطم تھا اور بجلی کی لہروں میں روشنی کے باعث آگ کی لپٹ لگ رہی تھی۔ ایسا لگا جیسے پورے

ساحل پر پرانے زمانے کے جانوروں کی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔

عالم کو طوفانِ بادو باراں نے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہے۔ ہم تین دن تک آندھی اور طوفان میں گھرے رہے۔ میں نے اپنے آپ کو کشتی کے مستول سے باندھ لیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ہم سب غرق ہونے والے ہیں۔ یکایک ہم چونک پڑے۔ ہماری کشتی پر آگ کی گیند آگری، جس نے بادبان اور مستول سے ٹکرا کر دونوں کو ہوا میں اُڑا دیا۔ یہ آگ کی گیند سفید اور نیلے رنگ کی تھی، جس کا قطر تقریباً پچیس سینٹی میٹر تھا اور وہ برابر ہمارے سامان میں گھوم رہی تھی۔ اچانک وہ بارود کی تھیلی سے جا لگی، مگر ہماری کشتی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا جو واقعی ایک معجزہ تھا۔ پھر یہ گیند میرے سامنے سے گزری، میں نے اپنے پیر ہٹانے کی کوشش کی، مگر میں نہیں ہٹا سکا۔ اُس آگ کی گیند نے بجلی کی لہر دوڑا کر ہر لوہے کی چیز کو مقناطیس میں تبدیل کر دیا اور میرے جوتے میں لگی ہوئی کیلیں لوہے کی پلیٹ سے چپک گئیں۔ میں نے اس آگ کی گیند سے اپنے پیر زور سے کھینچے کہ اچانک کشتی میں زور کا دھماکا ہوا اور یہ آگ کی گیند پھٹ گئی۔ ہمارے چاروں طرف جو کچھ بھی تھا گہرے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ پھر جب اس اندھیرے میں روشنی اُبھرنا شروع ہوئی تو ہم نے سکون

کا سانس لیا اور ہماری جان میں جان آئی۔ ہوا کی رفتار ابھی تک تیز تھی، مگر ہم تھکن کی وجہ سے لیٹے رہنے پر مجبور تھے۔ اس وقت ہم بہت تیز رفتار سے یہ سفر طے کر رہے تھے۔ یقیناً ہم لوگ فرانس کے نچلے علاقے سے گزر گئے تھے۔

ہماری ذرا سی دیر آنکھ لگی ہی تھی کہ ہم نے اپنے آپ کو پتھریلے ساحل پر پایا۔ اس وقت ہم لوگ دردِ سر اور تھکن میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اگر ہینز میری مدد کے لیے نہ آتا تو مجھے سمندر کی لہروں نے نگل لیا ہوتا۔ ہینز چچا کی طرف بھی دوڑا اور انھیں بچا لیا۔ پھر کشتی پر آیا اور کشتی پر سے سامان اُتار کر باہر لے آیا اور ہم تینوں نرم مٹی پر لیٹ کر گہری نیند میں ڈوب گئے۔ جب ہماری آنکھ کھلی تو ہوا آہستہ چل رہی تھی۔ چچا کو خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ ہم نے لمبا سفر پار کر لیا ہے۔ انھوں نے کہا، "اب ہم زیرِ زمیں دوبارہ اُترنا شروع کریں گے۔ زمین کے اندر اُترنے کی بات نے مجھے کو بہت دُکھ پہنچایا، کیوں کہ میری یہ شدید خواہش تھی کہ میں ہمبرگ واپس چلا جاؤں اور گرو بن سے ملوں۔ ہینز نے ہمارا سامان ایک جگہ جمع کیا، لیکن ہماری بندوقیں سمندر میں گر چکی تھیں۔ بارود محفوظ صحیح سالم تھی۔ ہماری قطب نُما رسّی اور بہت سے آلے بھی ابھی تک موجود تھے۔ ہم نے اپنے سامان کا کافی حصّہ خرچ کر لیا تھا۔ اب ہمارے پاس صرف اتنا سامان رہ گیا جو چار ہفتے کے لیے کافی تھا۔ پھر ہم سب ناشتے کے بعد بیٹھ کر آئندہ کا منصوبہ بنانے لگے۔

میرے چچا بولے، "ہینز کشتی کو درست کرے گا، لیکن اب شاید ہمیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میرے خیال میں واپسی میں ہم یہ راستہ اختیار نہیں کریں گے۔"

ہوا نے ہمیں جنوب مشرق کی طرف دھکیل دیا تھا اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ہم اس وقت بحرِ قلزم کے نیچے ہیں۔ جب ہم نے اپنا قُطب نُما دیکھا تو ہمارے اوسان خطا ہو گئے اور ہم حیرت کے سمندر میں ڈوب گئے۔ ہم نے احتیاط کے طور پر دوبارہ دیکھا۔ ہم واپس پہنچ گئے۔ قُطب نما کی سوئی اس طرف رُخ کیے ہوئے تھی جہاں سے ہم نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ پھر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یقیناً آندھی نے ہمارا رُخ بدل دیا اور ہمیں واپس اپنی آغاز کی منزل پر پہنچا دیا۔ چچا کو ابتدا میں خوف محسوس ہوا، پھر شدید غصّہ۔ میں نے ان سے واپس زمین پر جانے کی اجازت چاہی، مگر ان کا ارادہ اٹل تھا۔ ہینز بھی اپنے مالک کی پوری پوری اطاعت میں مصروف تھا۔

اس بار بھی میرے سامنے اپنے چچا کے حکم کی تعمیل کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ چچا اور میں ہینز کے کشتی ٹھیک کرنے کے دوران آس پاس کے مقامات کا جائزہ لینے نکل پڑے۔ ہم سمندر کے ساحل پر چلتے گئے، جس پر پرانے زمانے کے جانوروں کی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ہمیں کچھوے کے خول بھی ملے اور جلد ہی ہم نے بہت سے جانوروں کی ہڈیاں ڈھونڈ نکالیں۔

یکایک چچا نے اونچی آواز میں کہا، "دیکھو ایکسل: یہ انسانی سر ہے۔" اس وقت میرا خوف چچا کی دہشت سے کم نہ تھا۔ اس واقعے کے بعد ہمیں اس سے بھی زیادہ دہشت اور خوف ناک مناظر کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم نے انسان کا پورا جسم مٹی کے اوپر پڑا ہوا دیکھا، جو تاریخ سے قبل

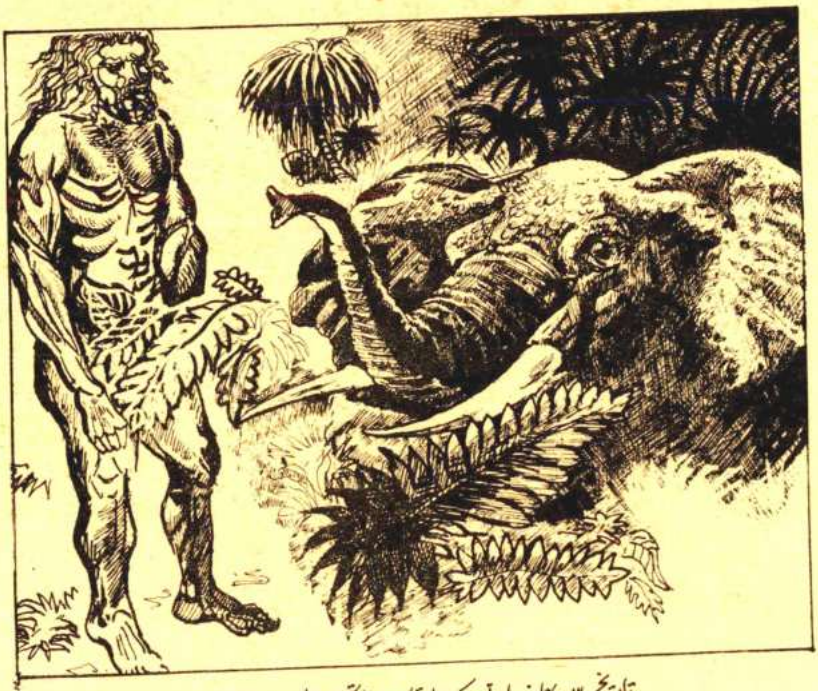

تاریخ سے پہلے زمانے کے دیو قامت ہاتھی چلے آ رہے تھے۔

اس دنیا میں آباد تھے۔ یہ لاش اب بھی ویسی ہی تھی۔ گویا اس میں جان ہے۔ ہم نے ڈائناسور کی ہڈیاں بھی دیکھیں اور یہ ہم زمانۂ قبلِ تاریخ کے انسانی جسم کو دیکھ رہے ہیں، تو کیا ہم کو

کوئی زندہ انسان بھی ملے گا؟

ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔ اب ہم ایک بڑے عظیم جنگل میں پہنچے۔ ہم نے وہاں درخت اور پودے دیکھے جو لاکھوں سال پہلے ختم ہو چکے تھے۔ یہ درخت اور پودے ہرے رنگ کے نہیں تھے، کیوں کہ ان کو سورج کی روشنی کم ملتی تھی۔ اس وجہ سے یہ گہرے کتھئی رنگ کے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے درختوں کے بیچ میں کسی چیز کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ ہم ٹھہر گئے اور اس حرکت کو توجہ سے دیکھنے لگے۔ ہمارا جسم خوف سے لرز اُٹھا۔ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ کئی تاریخ سے قبل والے دیو قامت لمبے دانتوں والے ہاتھی چلے آرہے ہیں۔ وہ اپنی لمبی سونڈوں سے درختوں کی شاخوں کو توڑے جا رہے ہیں۔ چچا خوف کے انداز میں کہنے لگے، آؤ ہم یہاں سے نکل چلیں۔"

میں نے کہا، "اگر یہ ہاتھی ہم پر حملہ کر دیں تو یہ ہماری آخری سانسیں ہوں گی۔"

چچا نے میری بات کی تصدیق کے لیے اپنا سر ہلایا، پھر اچانک ان کا خوف بڑھ گیا۔ انھوں نے کہا، "اِدھر دیکھو!" میں نے دیکھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ ایک انسان درخت کی شاخوں کے نیچے پیر جمائے ہوئے کھڑا ہوا ہے۔ وہ ان ہاتھیوں کے ریوڑ کی نگرانی کر رہا تھا۔ وہ چار میٹر کی لمبائی سے کم نہ ہوگا۔ خود وہ ان ہاتھیوں سے بھی اونچا تھا۔ اس کے لمبے بال اس کی کمر تک پہنچ رہے تھے اور وہ اپنے ہاتھ میں درخت کی شاخ تھامے کھڑا تھا۔

یہ جگہ خطرے سے خالی نہ تھی، اس لیے ہم جلد وہاں سے نکل کر بھاگے۔ پھر ہم نے جائزہ لینا شروع کیا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آیا ہم ساحل گرو بن سے قریب ہیں، لیکن ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملا۔ جب میں ساحل پر چل رہا تھا تو مجھے کوئی چیز مٹی میں چمکتی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے اُسے اٹھایا تو وہ ایک زنگ آلود خنجر تھا۔ ہمیں اُس کے رنگ سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ کافی عرصے تک مٹی میں پڑا رہا ہے۔

چچا نے کہا، "یہ خنجر اُس انسان کا ہے جو ہم سے پہلے اس جگہ سے گزرا ہے۔ ہو سکتا ہے ہمیں یہاں کوئی آثار ملیں جن سے ہمیں زمین کے اندر جانے والے راستے کا نشان مل جائے۔" ہم نے پتھروں کے درمیان ڈھونڈنا شروع کیا۔ آخر ہمیں اندھیری سُرنگ ملی۔ سُرنگ

ہماری کشتی اونچی اونچی چھلانگیں لگانے لگی

کے اندر ہمیں وہی عجیب و غریب زبان پتھر کی دیوار پر کُھدی ہوئی ملی۔ چچا نے اُسے پڑھا۔ انھوں نے خوشی سے نعرہ لگایا، "یہ ایرانی سیکنوسم ہے!" ہمیں دوبارہ اندازہ ہوا کہ ہم نے صحیح راستہ اپنایا ہے۔

چچا نے کہا، "میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا کہ ہم شمال کی طرف کیسے پہنچے، لیکن مجھے یقین تھا کہ ہم جنوب مشرق کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہم صحیح مقام پر پہنچ گئے ہیں۔

اب ہم ہینز کے پاس واپس گئے اور سفر کی تیاری کی۔ پھر ہم تینوں کشتی پر بیٹھے اور ساحل کے کنارے چلتے چلتے اُس جگہ پہنچ گئے جہاں ایرانی سیکنوسم کی سُرنگ تھی۔ وہاں ہم پھر خشکی پر آ گئے۔ میں سُرنگ کی دریافت کے لیے بے چین تھا۔ اس لیے جب میرے چچا نے ٹارچ جلائی تو میں نے اپنے آپ کو سب سے آگے پایا۔ جلد ہی ہم سرنگ کے اندر چلنے لگے، لیکن تھوڑے فاصلے کے بعد ہم نے اپنا راستہ ایک بڑی سی چٹان سے بند پایا۔

میرے اوپر غصّہ طاری ہو گیا۔ میں نے کہا، "ایرانی سیکنوسم نے اپنا راستہ اس سرنگ سے کیسے پار کیا ہو گا؟"

میرے چچا نے جواب دیا، "یہ چٹان اُس کے یہاں سے گزرنے کے بعد گری ہو گی۔"

میں نے پُرعزم انداز میں کہا، "تو اب ہم اسے بارود سے اُڑا دیں گے۔"

ہینز نے اپنی کُدال سنبھالی اور چٹان میں لمبا سوراخ کر دیا اور اس میں بارود ڈال دی، پھر میں اور چچا بارود کی فیتا کھینچ کر دُور لے گئے۔ ہم نے اپنی تیاری آدھی رات کو ختم کی۔ دوسرے دن ہم صبح سویرے اُٹھے۔ طے ہوا کہ میں فیتا جلا کر دائیں چچا اور ہینز کے پاس کشتی پر آجاؤں گا اور ہم تینوں فیتے کے جلنے کے دوران کشتی کو دھکیلتے ہوئے دُور لے جائیں گے تاکہ ہم تینوں دھماکے کے وقت خطرے سے دُور رہوں۔

میں نے فیتے کو ماچس بتائی، تھوڑی دیر انتظار کیا تاکہ اس کے جلنے کا یقین ہو جائے، پھر میں کشتی کی طرف دوڑا اور اس کو دھکیلتے ہوئے دُور لے گیا۔ ہم ایسے مقام پر پہنچ کر رُک گئے جو خطرے سے آزاد تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دھماکا ہوا اور ہم نے جب اس جگہ کو دیکھا تو وہاں بہت بڑا گڑھا بن گیا تھا، مگر پھر ہمیں ایسا لگا جیسے یہ سمندر ایک بہت ہی بڑی لہر میں تبدیل ہو گیا ہے، جس سے ہماری کشتی اونچی اونچی چھلانگیں لگانے لگی۔ ہم کشتی پہ گر پڑے۔ ہمارے چاروں طرف روشنی کا کوئی اثر نہیں رہا۔ ہم نے اس اندھیرے میں پانی کے بہنے کا شور سُنا۔ وہ چٹان جو ہمارے زمین کے اندر جانے کی رکاوٹ بنی ہوئی تھی ہم نے اسے اُڑا دیا تھا، مگر اب جب کہ چٹان ہٹ گئی تو سمندر کا بھی زمین کے اندر جانے کا راستہ بن گیا، ہمیں اپنے ساتھ لیے ہوئے۔ ہم پانی سمیت زمین کے اندر جا رہے تھے۔ ہم ایک دوسرے کو پکڑ کر کشتی سے چمٹ گئے۔ ہم اس اندھیرے میں زمین کے اندر اُترتے جا رہے تھے، آندھی کی رفتار سے۔ جب ہینز ٹارچ جلانے میں کامیاب ہوا تو ہم نے دیکھا ہم سوائے قطب نُما اور تھوڑی بہت چیزوں کے اپنا سارا سامان کھو چکے ہیں۔ ہماری کشتی پانی کے اوپر گول گول چکّر کھاتی ہوئی گرتی جا رہی تھی۔ جب ٹارچ بند ہوئی تو میں نے اپنی آنکھیں بھی بند کر لیں۔ ڈھلان کی گہرائی بڑھتی جا رہی تھی، جس سے ہماری کشتی کی رفتار میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کافی وقت گزر گیا، لیکن ابھی تک اس کی کوئی انتہا نہ ہوئی۔ پھر اچانک ہمیں

زبردست جھٹکا لگا اور کشتی اپنی حرکت سے رُک گئی یا ہلکی ہو گئی۔ ایک جگہ زمین سے پانی اُبل رہا تھا۔ ہم اُس سے جا ٹکرائے اور پانی ہمارے اوپر گرنے لگا۔ ایسا لگا کہ جیسے ہم ڈوبنے والے ہیں، مگر جلد ہی ہم خود بہ خود پانی کے اوپر آ گئے۔ پھر گھرا سناٹا چھا گیا۔

میں نے چچا کو کہتے ہوئے سُنا، "ہم اوپر اُٹھ رہے ہیں!"

ہینز نے ٹارچ جلائی۔ ہم نے اپنے آپ کو اُس تنگ سُرنگ میں پایا جو اوپر کی طرف جا رہی تھی۔ یوں لگا جیسے کہ اب بچنا ناممکن ہے۔ جُوں جُوں ہم بلندی پر جا رہے تھے درجۂ حرارت بڑھتا جا رہا تھا۔ جلد ہی گرمی اُبلنے کی حد تک پہنچ گئی۔ سرنگ کی دیوار بھی گرمی سے آگ ہو رہی تھی۔ مجھے ٹارچ کی روشنی میں یوں لگا جیسے کہ پتھر حرکت کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر

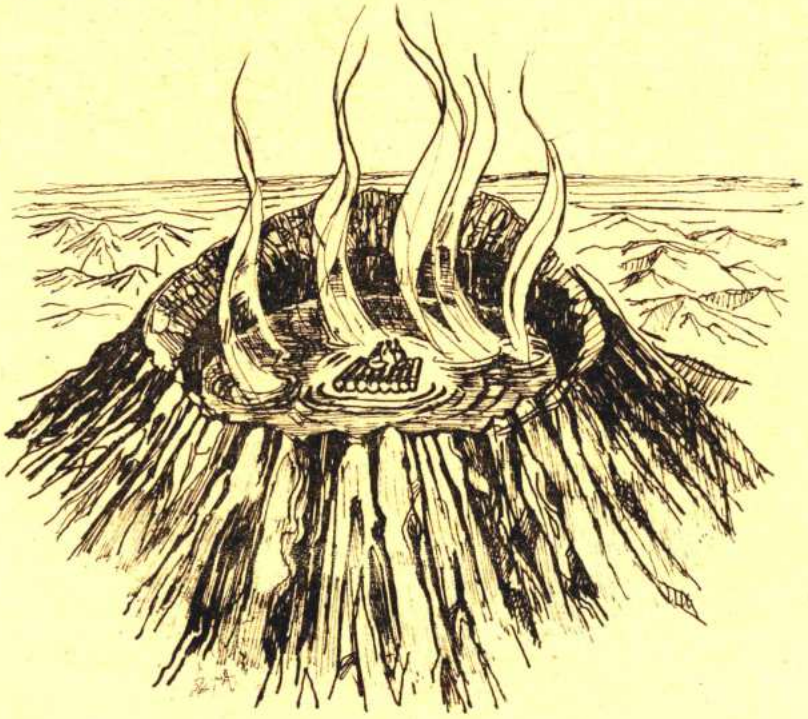

ہماری کشتی ہلکے ہوئے گرم پانی میں تیر رہی تھی۔

بعد زبردست دھماکا ہوا اور دیواریں حرکت میں آگئیں۔ دہشت کے مارے میں نے اپنے چچا کی طرف دیکھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وہ بالکل خاموش ہیں۔ میں نے ان سے خوف زدہ انداز میں کہا، "زمین ہل رہی ہے!"

انھوں نے جواب دیا، "ڈرو مت اکیسل! یہ زلزلہ نہیں ہے۔ ہم اُبلنے والے آتش فشاں پہاڑ کے نیچے ہیں۔ یہ جو ہو رہا ہے اچھا ہے۔ یہ لاوا ہمیں زمین کی سطح پر پہنچا دے گا۔"

اپنے آپ کو لاوے کے حوالے کرنے کے سوا ہمارے لیے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ لاوا بلندی کی طرف جا رہا تھا۔ ہمیں جو پانی اپنی ہتھیلی پر اٹھائے ہوئے تھا اس کے نیچے دہکتے ہوئے گرم گرم پتھر تھے، اور اگر ہم زمین پر پہنچ بھی گئے تو یہ جلتے ہوئے پتھر ہمارے چاروں طرف ہوں گے اور ہمیں جھلسا دیں گے۔

صبح کے وقت ہوا میں گرمی بہت بڑھ گئی اور ہماری کشتی کی رفتار تیز ہو گئی۔ سرنگ کے کنارے میں نے کئی اور سُرنگیں دیکھیں، جن میں سے دُھواں اور آگ نکل رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہماری کشتی دہکتے ہوئے گرم پانی میں تیر رہی ہے۔ گرمی ناقابل برداشت حد تک بڑھ گئی۔ ہماری کشتی جلتی ہوئی شدید گرم ہوا میں زور زور سے گول گول چکّر لگانے لگی اور آگ کی چادر نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے موت سر پر آ پہنچی ہے اور میں اپنے ہوش و حواس گم کر چکا ہوں۔

جب میرے ہوش ٹھکانے آئے تو میں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ہم تینوں آتش فشاں پہاڑ پر پڑے ہوئے تھے، مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ ہم میں سے کسی کو زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ یہ میرے یقین سے بالاتر تھا کہ ہم زمین پر پڑے ہوئے ہیں اور سورج کی خوش گوار کرنیں ہمارے سروں پر پڑ رہی ہیں۔ میں نے چچا سے پوچھا، "ہم کہاں ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا، "قطب نما کے مطابق شاید ہم اپنی جگہ واپس پہنچ گئے ہیں۔"

میں نے قطب نما دیکھا اور کہا، "اگر قطب نما صحیح کام کر رہا ہے تو ہم قطب شمالی میں ہیں۔"

ہم نے اپنے چاروں طرف اُگی ہوئی ہریالی کو دیکھا تو ہمیں زیتون اور انجیر کے درخت

ہم چشمے کے کنارے بیٹھے تھے کہ ہمارے قریب سے ایک بچہ گزرا۔

نظر آئے۔ ہمیں سورج کی روشنی اور گرمی بڑی خوش گوار لگ رہی تھی۔ ہم آتش لینڈ پر یقیناً نہیں ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم پہاڑ سے اُتر کر کسی قریب کی وادی کو تلاش کریں۔ ہمارے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور ہم تھکن سے نڈھال تھے۔ ہم نے ایک پانی کے چشمے سے پانی پیا اور اس میں غسل کیا۔ ہم پانی کے چشمے کے پاس بیٹھے تھے کہ ہمارے قریب سے ایک بچہ گزرا۔ اُس نے ہمیں دیکھتے ہی بھاگنا شروع کر دیا، مگر ہینز نے جلدی سے اُسے پکڑ لیا۔ چچا اُٹھ کر اس کے قریب گئے اور اس سے جرمن زبان میں اور پھر فرانسیسی میں سوال کیا، مگر ایسا لگا کہ اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر چچا نے اطالوی زبان میں پوچھا تو بچے نے جواب دیا، "سسلی"۔ یعنی ہم بحر قلزم کے ملک اٹلی کے جزیرے سسلی پر ہیں۔ ہم جزیرہ آتش لینڈ کے آتش فشاں پہاڑ سے روانہ ہو کر بحر قلزم کے جزیرے پر پہنچے۔ زمین کے اندر کی سیر سے زیادہ عجیب و غریب

اور کون سی سیر ہو سکتی ہے۔

ہم ساحل کی طرف بڑھے تو لوگ یہ سمجھے کہ ہم غرق ہونے والے جہاز کے بچے ہوئے لوگ ہیں۔ انھوں نے ہمیں کپڑے اور کھانا دیا اور ہمیں دو دن بعد اپنے وطن کے لیے روانہ کر دیا۔

ہم واپسی میں کشتی اور ریل گاڑی میں قُطب نُما کے راز کے بارے میں سوچتے رہے، لیکن جب ہم ہمبرگ پہنچے تو سب بھول گئے۔ گرو بن ہمارے صحیح سلامت آجانے سے بہت خوش تھی۔ ہمارے اس عجیب و غریب سفر کی خبر پورے ملک میں پھیلنا شروع ہو گئی۔ جلد ہی یہ خبر دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی۔ دنیا کے ہر حصّے سے علما ایک مشہور عالم لیڈن برڈک اور ان کے ساتھیوں سے ملنے آنے لگے۔ جلد ہی ہینز کو اپنے ملک کی یاد ستانے لگی۔ ہم نے نہایت افسوس اور پُرنم آنکھوں سے اُسے الوداع کہا۔ آخر ہم میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر پہنچ گیا اور سارے کام بہ خیر و خوبی انجام پائے۔ قُطب نما کا راز اب بھی ایک معمّا تھا۔

ایک دن میں اپنی لائبریری میں بیٹھا تھا۔ قطب نما کو میں نے ہاتھ میں لیا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ میں چچا کی طرف دوڑا اور ان سے کہا، "چچا جان، یہ دیکھیے، قطب نما کی سوئی شمال کے بجائے جنوب کی طرف ہے۔ آندھی کے دوران آگ کی گیند جو ہمارے اوپر آگری تھی اُس نے ہر چیز کو جو لوہے کی تھی مقناطیس میں تبدیل کر دیا تھا اور قطب نما کی سوئی کا رُخ شمال کے بجائے جنوب کی طرف کر دیا۔" چچا نے انتہائی خوشی کے عالم میں کہا، "شاباش! ایکسل! یہ بات تو بہت آسان تھی۔ نہ جانے اس وقت یہ میرے دماغ میں کیوں نہیں آئی۔"

ہمارے سفر کے رازوں میں سے یہ آخری راز بھی آشکار ہو گیا۔ چچا کو قلبی سکون اور مسرت نصیب ہوئی۔ مجھے اس راز کو پا لینے پر جو بے انتہا خوشی میسر آئی وہ بیان سے بالا تر ہے۔

اس مہم کے سر ہو جانے پر طے شدہ پروگرام کے مطابق میری شادی گرو بن سے ہو گئی۔ ہم تینوں خوشی اور اطمینان سے زندگی کے باقی دن کاٹنے لگے، مگر وہ سفر جب بھی ہمیں یاد آتا ہے تو ہمارے سر فخر سے بلند ہو جاتے ہیں۔

سنہری ذرّات

سیّد محمد رضا

وقت کس رفتار سے گزرتا ہے یہ سب جانتے ہیں۔ میں بھی جانتا ہوں، لیکن اب تک کبھی سنجیدگی سے اس پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

کل اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا دیوار کی گھڑی کو دیکھ رہا تھا۔ سیکنڈ کی سوئی نے میری توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ سیاہ سطح پر لال رنگ کی یہ سوئی ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھتی تھی۔ بارہ سے ایک، ایک سے دو، دو سے تین، ہر ایک ہندسے سے دوسرے ہندسے تک پہنچنے کے لیے پانچ جھٹکے ضروری تھے۔

ہر جھٹکے کے ساتھ میں نے شمار کرنا شروع کیا۔ اک..... دو..... تین..... چار..... پانچ..... اور گھڑی بارہ کے ہندسے سے ایک پر پہنچ گئی۔ یہ فاصلہ اُس نے پانچ سیکنڈ میں طے کیا۔ میں نے سوئی کے جھٹکے کے ساتھ بار بار اسی طرح گنا۔ مجھے خوب اندازہ ہو گیا کہ ایک سیکنڈ میں کتنا وقت ہوتا ہے۔ اب اپنے اندازے کی جانچ کے لیے میں نے آنکھ بند کر کے گننا شروع کیا اور ساٹھ تک گنتا چلا گیا۔ گویا سیکنڈ کی سوئی گھڑی کا چکّر پورا کر کے بارہ کے ہندسے پر دوبارہ پہنچ چکی تھی۔ میں نے فوراً آنکھیں کھول کر دیکھا۔ میرا اندازہ ذرا سا غلط نکلا، کیوں کہ سیکنڈ کی سوئی ایک کے ہندسے پر پہنچ چکی تھی۔

خیر، اس سے بحث نہیں۔ میں کوئی کھیل آپ کو سکھانا نہیں چاہتا۔ وقت کی رفتار کے متعلق بیان کر رہا تھا۔ مجھے خوب اندازہ ہو گیا کہ ایک سیکنڈ کتنی دیر میں گزرتا ہے۔ عام طور پر وقت کی رفتار شمار کرنے کے لیے سیکنڈ کم سے کم مقدار ہے۔ یہ وقفہ پک جھپکتے گزر جاتا ہے۔

لیکن وقت کے یہ حقیر ذرّات اگر جمع ہونے لگیں تو کیا گُل کھلاتے ہیں؟ ایسے ساٹھ ذرّات کے مجموعے کو ایک منٹ کہتے ہیں۔ یہی تین ہزار چھے سو ذرّات ایک گھنٹہ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح آگے بڑھیے چھیاسی ہزار چار سو ذرّات سے چوبیس گھنٹے یعنی ایک دن اور رات بن جاتا

ہے اور تین کروڑ پندرہ لاکھ چھتیس ہزار (۳،۱۵،۳۶،۰۰۰) ذرّے ایک سال پورا کر دیتے ہیں۔

اگر کوئی کام انجام دینے کے لیے آپ کے پاس ایک سال کا وقت موجود ہے تو گویا آپ کی جیب میں وقت کی دولت کے تین کروڑ پندرہ لاکھ چھتیس ہزار سنہری ذرّات موجود ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے خاصا بڑا خزانہ آپ کے پاس ہے، لیکن جب اس کے خرچ ہونے کی رفتار پر آپ غور کریں گے تو حیران رہ جائیں گے، مثلاً آرام کے ساتھ ایک پیالی چائے پینے کے لیے آپ کو تین سو ذرّات خرچ کرنے ہوں گے۔ نیند پوری کرنے کے لیے ایک دن میں اٹھائیس ہزار آٹھ سو ذرّات خرچ کرنے ہوں گے۔ ان کے علاوہ دوسرے کئی عمل ہیں جنھیں انجام دینا ضروری ہوتا ہے، یعنی کھانا، کھیلنا، عزیزوں دوستوں کے ہاں جانا وغیرہ وغیرہ، لہٰذا جس کام کو بھی آپ ایک سال کے اندر انجام دینا چاہتے ہیں اس کے لیے ہر روز کچھ نہ کچھ سنہری ذرّات باقاعدگی کے ساتھ خرچ کرنے ہوں گے۔

اگر آپ کو ایک سال کے اندر ایک جماعت سے دوسری جماعت میں پہنچنا ہے تو اس کے لیے جتنی قابلیت کی ضرورت ہے اسے حاصل کرنے کے لیے آپ کو ہر روز ایک تعداد ان سنہری ذرّوں کی خرچ کرنی ہوگی۔ علمی قابلیت پیدا کرنے کے لیے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ یہ عمل اسکول میں ہو یا گھر پر یا دونوں جگہ اُسی وقت مکمل ہو سکے گا جب کم از کم تیس ہزار سنہری ذرّے روزانہ آپ اس کے لیے خرچ کریں۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو یہ ذرّے خود بہ خود کسی دوسری مد میں خرچ ہو جائیں گے اور آپ اگلی جماعت کے لیے مطلوبہ قابلیت حاصل نہیں کر سکیں گے۔

اب اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وقت کی دولت صبح سے شام اور شام سے صبح تک کس تیز رفتاری کے ساتھ خرچ ہوتی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ہمارا جو عمل بھی ہو اپنی ذات کے لیے اور دوسروں کے لیے مفید ہو۔ یہی واحد طریقہ ہے جس سے ہم اس دولت کو ضائع ہونے سے بچا سکتے ہیں۔

میری عمر باسٹھ سال ہے اور جیسا کہ میں نے شروع میں کہا کہ اب تک اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر آدمیوں کو زندگی بھر اس موضوع پر غور کرنے کا موقع سرے سے ملتا ہی نہیں۔ میں نے بھی کئی ارب سنہری ذرّات خرچ کرنے

کے بعد یہ موقع حاصل کیا۔ اب سوچتا ہوں کہ جس کے پاس اربوں کی تعداد میں سنہری ذرّات تھے وہ اگر چاہتا تو دنیا کا ایک عظیم فلسفی یا محقق یا ادیب اور مصنّف بن سکتا تھا۔ چوں کہ میں نے قارون کے اس خزانے کو بڑی حد تک ضائع کر دیا اس لیے بہت غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اس نقصان کی تلافی کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ صورت یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس یہ خزانہ بھرپور موجود ہے انھیں توجہ دلاؤں کہ وہ اس کو ضائع نہ کریں، اس کا صحیح استعمال کریں۔ اگر ان میں سے چند بھی میری نصیحت پر عمل کر لیں گے تو میں سمجھوں گا کہ میرا نقصان پورا ہو گیا۔ اسی لیے نونہالو! میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ کے پاس زندگی کا مکمل خزانہ موجود ہے۔ جرات، استقلال اور عقل کے ساتھ اسے استعمال کیجیے۔ اپنی زندگی کا کوئی اعلا مقصد مقرر کیجیے اور پھر اس کی تکمیل کے لیے ہر روز مطلوبہ تعداد میں وقت کے سنہری ذرات خرچ کیجیے۔

اخبار والے کا بل

ایک صاحب اخبار والے کا بل کہیں رکھ کر بھول گئے۔ انھوں نے اپنے نوکر سے پوچھا، "کیا تم نے اخبار والے کا بل دیکھا ہے؟"

نوکر نے بڑی سادگی سے جواب دیا، "صاحب، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ میں تو آج پہلی بار سُن رہا ہوں کہ اخبار والے بھی بل میں رہا کرتے ہیں۔"

بعض نونہال خطوط، مضامین، نظمیں، خبریں، تحفے، اخبار یا رسالے کے تراشے اور طب کی روشنی اور ہمدرد انسائکلو پیڈیا کے لیے سوالات بھیجتے وقت اپنا نام اور پتا نہیں لکھتے ہیں، جس کی وجہ سے اُن کا جواب دینے یا اُن کی بھیجی ہوئی چیزیں شائع کرنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ نونہالوں کو چاہیے کہ وہ جو چیز بھی بھیجیں اپنا مکمل نام اور پتا ضرور درج کریں۔ ہر تحریر الگ الگ کاغذ پر لکھیں اور ہر کاغذ پر اپنا نام اور پتا ضرور لکھیں۔

آج کا نونہال ۔ کل کا کامیاب معالج

اسے سرفرازیٔ پاکستان کے لیے تیار کیجیے

انسان جتنا صحت مند ہو گا اس کا مستقبل بھی اتنا ہی تابناک ہو گا۔ آپ کا یہ ننھا منا بچہ کل کے مضبوط، مستحکم اور صحت مند پاکستان کی امانت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اس میں ایک بڑی شخصیت پوشیدہ ہے... ہو سکتا ہے یہ ایک نامور معالج بن کر اپنے وطنِ عزیز کی تعمیر و ترقی میں حصہ لے۔

اس کی صلاحیتوں کو ابھارنے اور شخصیت کو نکھارنے کی ذمہ داری آپ پر ہے۔ اس ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے نبھائیے۔ اپنے بچے کی پرورش نہایت محنت، محبت اور توجہ سے کیجیے تاکہ کل یہ ایک مضبوط اور توانا جسم، بہتر تعلیم اور صحت مند ذہن کے ساتھ ملک و ملت کی خدمت کر سکے۔

نونہال ہربل گرائپ واٹر بچوں کی تکالیف مثلاً بدہضمی، قبض، اپھارہ، اسہال، قے، بے خوابی، پیاس کی شدت وغیرہ کے لیے مفید و مؤثر دوا ہے۔ دانت آنے کے زمانے میں اس کا استعمال ضروری ہے۔

اداراخلاق

لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر اور زمین پر اکڑ کر نہ چل

Adarts 4/84

اقوالِ حکیم

عصمت علی پٹیل

حکیم محمد سعید کی تحریروں سے چمکتے ہوئے جملوں کا انتخاب

● ہماری ہمیشہ کوشش یہی ہونی چاہیے کہ ہماری ذات دوسروں کے لیے سود مند ثابت ہو، کسی کو ہم سے نقصان نہ پہنچے۔ مصیبت کے ماروں کا ہاتھ بٹانا، ان کی مدد کو پہنچنا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔

● دوسروں کو اپنے سے کم تر خیال نہیں کرنا چاہیے بلکہ انھیں اپنے ہی جیسا سمجھنا چاہیے اور ان کے دُکھ سُکھ میں حصّہ لینا چاہیے۔ دوسروں کے غم کو اپنا غم جاننا چاہیے۔ بلاشبہ یہی وہ باتیں ہیں جن کے اختیار کرنے سے ہم بلند اخلاق کہے جاسکتے ہیں اور خود ہمیں اطمینان و طمانیت قلب حاصل ہو سکتی ہے اور ہم خوش رہ سکتے ہیں۔

● دوسروں کے اخلاق اچھے دیکھنا چاہتے ہو تو پہلے اپنے اخلاق کی اصلاح کرو اور دوسروں کے لیے نمونہ بنو۔ تمھارے اچھے عمل کا اثر دوسروں پر پڑے گا اور اچھے اخلاق کے فائدے لوگوں پر ظاہر ہوں گے۔ تمھاری خوش اخلاقی دوسروں کو بھی خوش اخلاق بنا دے گی۔

● اعتدال اور توازن بڑی اچھی چیز ہے۔ ہر کام میں بیچ کا راستہ اچھا ہوتا ہے اور انتہا پسندی کسی کام میں بھی مناسب نہیں ہوتی، اس لیے جو کام بھی کیا جائے سوچ سمجھ کر کیا جائے۔

● محنت کی عادت بڑی اچھی چیز ہے۔ محنتی آدمی کبھی پریشان نہیں ہوگا۔ محنت نہ کرنے سے سُستی اور کاہلی کی عادت پڑ جاتی ہے اور انسان کی ترقی رُک جاتی ہے۔ محنت سے انسان کے جوہر کھُلتے ہیں اور وہ مشکل سے مشکل کام کو آسانی اور خوبی سے انجام دے لیتا ہے۔

● پابندیِ وقت کی عادت زندگی میں ہمیشہ کام آتی ہے۔ اس عادت کی وجہ سے بنے ہوئے کام بگڑتے نہیں بلکہ بگڑے ہوئے کام بن جاتے ہیں۔ وقت کی پابندی کرنے والا ہمیشہ فائدے میں رہتا ہے اور کبھی شرمندہ نہیں ہوتا۔ وقت کی پابندی کامیابی حاصل کرنے کا پہلا قدم ہے۔

● اگر علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو استاد کا ادب کرو۔ جو اُستاد کا ادب نہیں کرتا وہ بے ادب بھی ہے اور بے علم بھی، کیوں کہ استاد ہی ہمیں علم دیتا ہے اور علم حاصل کرنے کے قابل بناتا ہے۔ جس

نے استاد کا ادب نہیں کیا وہ علم کی قدر بھی نہیں کر سکتا اور بے قدروں کو علم نہیں ملتا۔

● کسی کے پیچھے اس کی بُرائی کرنا خود بہت بڑی بُرائی ہے۔ تمھیں اگر کسی کی کوئی بات بُری معلوم ہو تو بہتر ہے کہ اس کے سامنے کہو یا کم سے کم خاموش رہو۔

● اپنی زندگی آدمی خود بناتا ہے اور محنت و عمل کے ذریعہ سے زندگی سنورتی ہے۔ محنت سے عزّت حاصل ہوتی ہے۔ محنت کے بغیر خود اپنی نظر میں بھی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ بچپن ہی سے محنت کی عادت ڈالنا چاہیے تاکہ بڑے ہو کر انسان محنت سے نہ گھبرائے۔

● یاد رکھو دوستی ہمیشہ دونوں طرف سے ہوتی ہے۔

● کسی کو حقیر نہ جانو۔ کوئی معمولی سے معمولی انسان اور معمولی سے معمولی چیز بھی حقیر نہیں ہوتی۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی وقت وہ تمھیں بے وقعت معلوم ہو۔ سب انسان برابر ہیں۔ اچھائی بُرائی یا بڑائی چھوٹائی کا معیار اگر کوئی ہے تو وہ علم اور اخلاق ہے۔ نہ کوئی شخص دولت کے ہونے سے بڑا بن جاتا ہے اور نہ مفلس ہونے سے چھوٹا۔

● دوسروں کی عزّت کرنا گویا اپنی عزت کرنا ہے۔ ہر انسان چاہے چھوٹا ہو یا بڑا عزت کا مستحق ہے۔ سب انسان برابر ہیں۔ بڑا وہ ہے جو دوسروں کی عزت کرے اور ان سے اچھا برتاؤ کرے۔ بڑا بننا چاہتے ہو تو لوگوں سے اخلاق سے پیش آؤ، اُن کی عزت کرو۔

● آزادی بڑی نعمت ہے، لیکن یہ نعمت جب ہی حاصل ہوتی ہے کہ آدمی اس کی قدر کرے۔ آزادی کے لیے بھی قربانی دینا پڑتی ہے۔ قربانی کے بغیر آزادی کی قیمت ادا نہیں ہوتی اور مفت کی چیز بے وقعت ہوتی ہے۔

● اچھے اخلاق کو ہر ایک پسند کرتا اور خوش مزاجی سے متاثر ہوتا ہے۔ اچھے اخلاق کی شروع سے عادت ڈالنا چاہیے۔ جب کسی سے بات کرو، نرمی اور اچھے الفاظ سے بات کرو۔

● محنت کی عادت ہر حال میں مفید اور ہر لحاظ سے ضروری ہے۔ شروع سے محنت کی عادت ڈالو۔ سستی اور کاہلی کی عادت کو پاس نہ آنے دو۔ محنت کرنے والا کبھی پریشان نہیں ہوتا اور سُست آدمی کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ محنت ہی سے سچّی خوشی حاصل ہوتی ہے۔

● صفائی کے راستے پر چلنے سے انسان صحت کی منزل پر پہنچتا ہے۔ صحت مند رہنا چاہتے ہو تو خود صاف رہو۔ اپنے مکان کو صاف رکھو۔ اپنے محلّے، اپنے مدرسے اور اپنے ملک کی صفائی کا بھی

خیال رکھو۔

- محنت کرنے سے عزت حاصل ہوتی ہے۔ محنت کسی بھی قسم کی ہو فائدہ پہنچاتی ہے۔ محنتی آدمی بہت جلد کامیاب ہو کر عزت کا مستحق بن جاتا ہے۔
- دولت نہ ہو تو آدمی غریب نہیں ہوتا۔ وہ محنت سے دولت حاصل کر سکتا ہے، لیکن محنت کی عادت نہ ہو تو امیر آدمی بھی اپنی دولت کھو کر غریب ہو جائے گا اور دوبارہ اس کو دولت میسر نہیں آئے گی۔
- ایثار اور قربانی نیک جذبہ ہے اور اس نیکی سے سب ہی کو فائدے پہنچتے ہیں اور خود اس شخص کو جو دوسروں کے کام آتا ہے۔
- دنیا میں جن لوگوں نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں، ان کے نام ہمیشہ روشن رہے ہیں اور صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان کے اس کارنامے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

کھلونا نگر

(ناول)

غازی کمال رُشدی

قیمت :- /۶ رُپے

بچے کھیل کھیل میں اپنی بھولی بھالی زندگی کا سچا ڈراما کھیلتے ہیں۔ ان کے کھلونے، کھلونے نہیں ہوتے بلکہ ان کے دوست، عزیز، ہیرو اور ایکٹر ہوتے ہیں۔ اس کہانی میں گڈا ٹارچی ایک ہوشیار، سمجھ دار شہری کا رول ادا کرتا ہے۔ کبھی وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ پکنک مناتا ہے کبھی اپنی جادوئی چھڑی اور ماتھے پر لگے ہوئے ٹارچ سے چوری کا پتا لگاتا ہے اور سنترے محل کے ۳۶۵ کمروں میں گھومتا ہے۔ ٹارچی بیسویں صدی کا گڈا ہے جو راکٹ میں بیٹھ کر چاند پر جا اُترتا ہے۔
بیسویں صدی کے ذہین بچوں کے لیے کھلونوں کی انوکھی دنیا کی دلچسپ باتیں۔

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس ہمدرد ڈاک خانہ ـــــ ناظم آباد ـــــ کراچی ۱۸

نونہال مُصوّر

محمد مبشر اقبال، ہری پور ہزارہ

پونم جان، کراچی

اسرار الحق خانزادہ، ٹنڈو جام

عبد الرشید انجم، کراچی

حساب داں

مرسلہ: امین اشرف علی، کراچی

بچّو! ہمیں افسوس ہے کہ ہم حساب میں تمھیں زیادہ ہدایتیں نہیں دے سکتے، کیوں کہ ہم سوالوں کے جواب اِدھر اُدھر سے پوچھ کر حل کیا کرتے تھے، لیکن ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ اگر تم بار بار یہ کہہ سکتے ہو کہ "فرض کیا....." تو تم بہت جلد حساب داں بن جاؤ گے۔

_____ شفیق الرحمن

صرف وزیرِ خزانہ

مرسلہ: اسد رحمان، ساہیوال

ایک وزیر کی شادی ہوئی تو اس نے دلہن سے کہا، "دیکھو بیگم، ہمارا گھر بھی ایک ملک کی طرح ہے جس میں حکومت ہوتی ہے، صدر اور وزیرِ اعظم ہوتے ہیں۔ تم اپنے لیے کون سا عہدہ پسند کرو گی؟"

دلہن نے بڑی معصومیت سے کہا، "میرے لیے تو سب کچھ آپ ہیں۔ آپ دونوں عہدے اپنے پاس رکھیں۔ بندی کو صرف وزیرِ خزانہ بنا دیں۔

سوچنے کی باتیں

مرسلہ: عتیق اللہ، کراچی

● بُغض ایک بے جان لاش ہے۔ پھر تم میں سے کون ہے جو اس کی قبر بننا پسند کرے گا۔

(جبران خلیل جبران)

● اگر ہم بچّوں کو خوش نہیں رکھ سکتے تو یہ ان کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہے۔ (بکسٹن)

گوشت اور ہڈّی

مرسلہ: نجمہ ثروت انصاری، ژوب

ایک کتّا اور ایک گدھا اکٹھے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک لفافہ پڑا ملا۔ گدھے نے اسے اُٹھایا اور کھول کر پڑھنا شروع کیا، لکھا تھا: حاملِ رقعہ ہذا کو حسبِ ذیل چیزیں مفت دی جائیں گی:

بھوسا، سبز چارہ، چنے.....

کتّے نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا، برادرم، ذرا دیکھنا اس فہرست میں نیچے جا کر گوشت اور ہڈّی کا ذکر بھی ہو گا۔ گدھا سارا پروانہ پڑھ گیا۔ اس میں کوئی ایسی چیز مذکور نہ تھی۔

کتّے نے کہا، تب یہ بے کار چیز ہے، پھینک

دو اسے۔

پارٹی منشوروں میں فقط گدھے ہی کی بات نہیں ہونی چاہیے بلکہ کتوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔

ـــــ ابنِ انشا

تلاش بے محل

مرسلہ: شائستہ ناظمہ شمیم اختر، کراچی

★ بلندی اور ترقی انکساری میں ہے، لوگ تکبّر میں تلاش کرتے ہیں۔

★ عزت عاجزی اور خاکساری میں ہے لوگ حسد اور بغض میں تلاش کرتے ہیں۔

★ کامیابی ہمّت اور شجاعت میں ہے، لوگ بزدلی میں تلاش کرتے ہیں۔

★ خیر و برکت ایمان داری میں ہے، لوگ دھوکے اور فریب میں تلاش کرتے ہیں۔

اصلاح

مرسلہ: سرفراز عارف، کراچی

ہشام بن عبدالمالک نے اپنے بیٹے کے استاد کو ہدایت کی، "جب آپ کسی مجلس میں اس کی زبان سے کوئی نامناسب کلمہ سنیں تو اسے سب کے سامنے ٹوک کر شرمندہ نہ کریں، کیوں کہ اس صورت میں ممکن ہے وہ اپنی غلطی درست کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس طرح یہ دوسری غلطی پہلی خطا سے زیادہ بری ہوگی۔ آپ اس کی نامناسب بات یاد رکھیں اور جب صرف آپ دونوں ہوں تو اس کو سمجھا دیں۔"

ہمدرد نونہال، ستمبر ۱۹۸۶ء

شیرِ خدا حضرت علی کرم اللہ وجہ کا ارشادِ گرامی ہے کہ بھرے مجمع میں کسی کو ٹوکنا اس کی اصلاح نہیں اس کی توہین کرنے کے برابر ہے۔

باپ کا بیٹا

مرسلہ: سید شہزاد علی، ملیر ہالٹ

ایک دفعہ ایک بچّے نے اپنے والد سے پوچھا، "کیا یہ صحیح ہے کہ والدین کا علم بچّوں سے زیادہ ہوتا ہے؟"

"بالکل!" باپ نے جواب دیا۔

"اچھا یہ بتائیے کہ دخانی انجن کس نے ایجاد کیا تھا؟" بچّے نے پوچھا۔

"جیمس واٹ نے!" باپ نے کہا۔

"تو پھر دخانی انجن جیمس واٹ کے والد نے کیوں ایجاد نہیں کیا؟"

شترمرغ

مرسلہ: شاہد محمود، سکھر

شترمرغ کا شمار دنیا کے سب سے بڑے پرندوں میں ہوتا ہے۔ یہ افریقہ کا جانور ہے اور افریقہ اور لاطینی امریکا میں کثرت سے پایا جاتا ہے، جسے بہ طور سواری بھی استعمال کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ اسے بڑے شوق سے پالتے ہیں۔

شترمرغ کا ایک قدم ۱۵ فیٹ کا ہوتا ہے۔ اس کے انڈے کا وزن تقریباً دو کیلوگرام ہوتا ہے، جس کو دو تین آدمی سیر ہو کر کھا سکتے ہیں۔ اس کا خول اتنا مضبوط

ہوتا ہے کہ یہ ۲۸۰ پونڈ وزن آسانی سے سہار لیتا ہے۔ افریقی اس کے انڈے کو حاصل کر کے کھانے کے بعد اس کے خول کو بہ طور برتن استعمال کرتے ہیں۔ انڈا حاصل کرنے کے بعد اس میں سوراخ کر لیتے ہیں اور تمام مادہ نکال کر اس کے خول سے پیالے وغیرہ بنا لیتے ہیں۔ شترمرغ انڈا دینے کے بعد اسے ریت میں دبا دیتا ہے اور گرمی کی تپش سے بچے پیدا ہوتے ہیں۔

مسکراہٹ

مرسلہ: بابر رضوان شیخ، اٹک

(۱) مسکراہٹ کتنی ارزاں ہے، مگر کتنی نایاب ہے۔

(۲) مسکراہٹ ایک ایسی جھلک ہے جس کی یاد بعض اوقات لافانی ہوتی ہے۔

(۳) مسکراہٹ کے بغیر کوئی شخص امیر نہیں، جس کے پاس مسکراہٹ نہیں اس جیسا کوئی غریب نہیں۔

(۴) مسکراہٹ گھر میں مسرت و شادمانی کا پیغام ہے۔

(۵) مسکراہٹ کاروبار میں اعتماد کا نشان ہے اور دوستوں کی پہچان ہے۔

(۶) مسکراہٹ تھکے ماندے کے لیے آرام اور مصیبت زدہ کے لیے بہترین تریاق ہے۔

(۷) مسکراہٹ ایک ایسی دولت ہے جو کسی سے خریدی مانگی یا چرائی نہیں جا سکتی۔

(۸) مسکراہٹ کی ضرورت سب سے زیادہ اُسے ہوتی ہے جس کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے کچھ اور نہیں

ہمدرد نونہال، ستمبر ۱۹۸۶ء

ہوتا۔ اگر آپ لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا چاہتے ہیں تو مسکراہٹ سے کام لیں۔

بے چارہ نوجوان

مرسلہ: شبینہ خورشید، کراچی

ایک خوش پوشاک نوجوان، بیرس کے سب سے مہنگے ریستوراں میں آیا اور بیرے کو ٹپ دی۔ بیرے نے شکریہ ادا کرنے کے بعد پوچھا، "آپ کے لیے کون سی میز مخصوص کر دوں؟"

"کوئی بھی نہیں!"

"وہ کیوں اور پھر اس ٹپ کا کیا مقصد؟"

"مقصد صرف یہ ہے کہ آج شام میں اپنی بیوی اور ساس کے ساتھ آؤں گا۔ تم صرف یہ کہہ دینا کہ تمام میزیں پُر ہو چکی ہیں!"

انسان کا دل

مرسلہ: محمد امداد اقبال، حیدر آباد

اندازہ لگایا گیا ہے کہ ستر سال کی عمر تک انسان کا دل تین ارب مرتبہ دھڑکتا ہے، تین لاکھ من خون صاف کرتا ہے۔ انسان ساڑھے تین سو من غلّہ کھا جاتا ہے، جس میں دالیں بھی شامل ہیں۔ ایک سو تین من سبزیاں اور پھل کھا جاتا ہے۔ بائیس ہزار گیلن پانی پیتا ہے۔ پندرہ سو گیلن دودھ پیتا ہے۔ تریسٹھ کروڑ مرتبہ سانس لیتا ہے۔

سگرٹ پینا منع ہے

مرسلہ: شگفتہ پروین، کراچی

لفتانزا جرمن ہوائی کمپنی ہے اور یہ بات ماننی

پڑے گی کہ یہ لوگ جو کام کرتے ہیں پکّا اور مکمل کرتے ہیں۔ کسی بات کے کسی پہلو کو فراموش نہیں کرتے۔ ایک معمولی مثال لیجیے۔

جہاز کے باتھ روم کے اندر موٹا موٹا لکھا ہے: "یہاں سگرٹ پینا منع ہے۔" اس کے باوجود ایش ٹرے کا بھی انتظام ہے کہ اچھا آپ نہیں باز آئے تو کم از کم اس کے ٹوٹے تو ایش ٹرے میں بجھائیے۔

اس پر ہمیں وہ دانش مند خدمت گار یاد آیا جسے آقا نے معالج صاحب کو لانے بھیجا تھا وہ ساتھ میں غسّال اور گورکن بھی لے آیا کہ زندگی اور موت تو خدا کے اختیار میں ہے جانے ان میں سے کس چیز کی ضرورت پڑ جائے۔

—— ابنِ انشا

بے رحم صرّاف

مرسلہ: محمد عمر احمد خان، کراچی

زمانہ بڑا بے رحم صرّاف ہے۔ آپ کسی مصنوعی تدبیر اور کسی بناوٹ سے اس کی جانچ سے کھرے نہیں نکل سکتے، لیکن یقین رکھیے کہ اگر آپ نے اپنے عمل سے اپنے آپ کو کھرا ثابت کر دیا تو مخالف طاقتیں چاہے کتنا ہی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر آپ کو کھوٹا بنانے کی کوشش کریں ان شاء اللہ وہ منہ کی کھائیں گی۔ آپ جھوٹ کی یورش دیکھ کر نہ گھبرائیے۔ وہ طوفان کی طرح اُٹھتا ہے اور بُلبلے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ بس آپ کو فکر جھوٹ کے مقابلے کی نہیں اپنی سچائی کی ہونی چاہیے۔ —— مولانا مودودی

بڑے آدمی

مرسلہ: عینبہ فرح، کراچی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے آدمی انعام کے طور پر دیے اور سزا کے طور پر روک لیے جاتے ہیں۔ عطا تو اسی کے حق میں ہوتی ہے، جو حق دار ہو۔ آخر قدرت ایک سپاس نا آشنا قوم کو بڑے آدمی کیوں عطا کرے۔ اسے اپنے عطیے کی رسوائی اور ناقدری ناگوار ہوتی ہے۔

—— مختار مسعود

جزا و سزا

مرسلہ: ناظمہ ارم، کراچی

ایک دن عبدالملک بن مروان کہیں جا رہا تھا، راستے میں ایک فقیر نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ عبدالملک کو بہت غصّہ آیا۔ ڈانٹا کہ تُو نے بے ادبی کیوں کی؟

فقیر نے جواب دیا، "امیر المومنین، محتاجی نے بے ادبی پر مجبور کر دیا ہے۔"

عبدالملک نے کہا، "ادب کے ساتھ بھی یہ سب کچھ کہا جا سکتا تھا۔"

نوکر کو حکم دیا کہ فقیر کو دو ہزار دینار دے دیے جائیں، کیوں کہ سائل کا سوال پورا نہ کرنا بزرگوں کی عادت نہیں۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ فقیر کا وہ ہاتھ کاٹ دیا جائے، جس نے بے ادبی کی ہے، کیوں کہ بے ادبی کی سزا دینا بھی بادشاہوں کا کام ہے۔

حسابی فارمولے

مرسلہ: محمد امتیاز، نوشکی

نصیحت + بڑھاپا = بزرگ

امراض ÷ فیس = ڈاکٹر

انسان + بھول = پروفیسر

اشرف المخلوقات - عقل = جانور

آدمی + اخلاق = انسان

کاغذ + جھوٹ = چھٹی کی درخواست

حقیقی خوشی

مرسلہ: سعیدہ ناز، کراچی

اگر آپ حقیقی مسرت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو خدمتِ خلق کو اپنا شعار بنا کر دیکھیے۔ آپ کو روحانی سکون ملے گا اور آپ دوسروں کے ساتھ مہربانی کر کے وہ لذّت محسوس کریں گے جو بڑی سے بڑی قیمت پر بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ یہی چیز آپ کو مسرتوں کی وادی میں لے جائے گی۔ اگر آپ اپنی مشکلات پر قابو پانا چاہتے ہیں تو ایسے انسان کو تلاش کیجیے جو آپ سے زیادہ مسائل اور مشکلات میں اُلجھ گیا ہو۔ اس کا ہاتھ بٹائیے اور معاوضے سے بے نیاز ہو کر کام کیجیے۔ آپ کے مسائل خود بہ خود حل ہو جائیں گے۔ یہ ایک سیدھا سادہ طریقہ ہے، لیکن اس میں بلا کی قوّت اور قدرت ہے اور اس میں انسان ناکام نہیں رہتا۔

نیک کُتا

مرسلہ: سمیرا کمال، کراچی

خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کیے ہیں۔ کتے اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہو گا۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ نہیں اُٹھانے دیتا۔ دم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لیے لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیوجانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا۔ گاڑی کے مختلف حصّوں کو کھٹکھٹایا۔ لوگوں سے کہلوایا خود دس بارہ مرتبہ آواز بیں دیں تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔ صورت حال کو ایک نظر دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگایا تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اُٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا وہیں سے پھر شروع کر لیا۔

—— احمد شاہ پطرس بخاری

رونے کی وجہ

مرسلہ: عمران احمد نعمانی، کراچی

ایک شخص اپنے دوست کے دروازے پر پہنچا اور اسے کھٹکھٹایا۔ دوست باہر نکلا اور اس کے آنے کا سبب پوچھا۔ اس شخص نے کہا، "مجھے اسی وقت چار سو درہم کی ضرورت ہے، میں مقروض ہوں۔" دوست اندر گیا اور فوراً اس کی مطلوبہ رقم لے آیا اور رقم اس کے حوالے کر کے اندر جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اس پر اس کی بیوی نے کہا "اگر تمھیں چار سو درہم کے ضائع ہونے کا اتنا ہی غم تھا تو دیے ہی کیوں؟"

اس نے کہا "اے نیک بخت! میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ میں اپنے دوست کے حالات سے اس قدر بے خبر رہا ہوں کہ اسے خود میرے پاس آکر اپنی حاجت بیان کرنی پڑی۔"

علم

مرسلہ: محمد سعید عباس، کراچی

علم ایک بحرِ ناپیدا کنارہ ہے جس کی تہ بے شمار موتیوں سے بھری پڑی ہے اور مَیں اس کنارے پر ایک طفلِ خُرد سال کی طرح گھونگے چُن رہا ہوں۔

—— نیوٹن

پہلا سبق

مرسلہ: فرحت محمد وزیر، کراچی

چیونٹی کے متعلق مشہور ہے کہ جب اس کا بچہ جنم لیتا ہے تو وہ بہ حیثیت ماں دو چیزیں بڑی محنت سے اپنے بچے کے ذہن میں بٹھاتی ہے۔ ایک باہمی اتفاق اور دوسری سمت کی پہچان۔ اس کا بچہ جہاں بھی چلا جائے گھر نہیں بھولتا، حتیٰ کہ آندھی ہو یا بارش، کوئی شے بھی اُسے اس کے گھر جانے سے نہیں روک سکتی اور ہم انسان اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے بھی اپنے بچوں کو یہ باتیں نہیں سکھاتے۔ کاش ہم اس ننھی سی مخلوق سے ہی کچھ سبق حاصل کر سکیں۔ اے کاش!

آہ بے چارہ

مرسلہ: نام نامعلوم، ملبر ہالٹ

دو امریکی سیّاحت کی غرض سے فرانس کے ایک قصبے میں گئے۔ ایک گرجے کے سامنے سے گزرتے ہوئے انھوں نے دیکھا کہ وہاں کسی کی شادی ہو رہی ہے۔ ایک امریکی نے ایک فرانسیسی سے انگریزی میں پوچھا، "یہاں کس کی شادی ہو رہی ہے؟"

فرانسیسی نے فرانسیسی میں جواب دیا، "جان سیریاں"۔ (میں نہیں جانتا۔)

دوسرے دن دونوں امریکیوں نے دیکھا کہ ایک جنازہ جا رہا ہے تو انھوں نے پھر فرانسیسی سے پوچھا، "یہ کس کا جنازہ ہے؟"

فرانسیسی نے جواب دیا، "جان سیریاں"۔ (میں نہیں جانتا۔)

امریکی نے اپنے ساتھی سے کہا، "آہ! بے چارہ جان سیریاں! کل ہی اس کی شادی ہوئی تھی اور آج چل بسا۔"

کام کی باتیں

مرسلہ: سعید احمد، ٹنڈو الہیار

★ جو شخص یتیم کی پرورش کرتا ہے، اس کے بچّوں کی پرورش خدا کرتا ہے۔

★ غیبت سے بچو، کیوں کہ یہ نیکیوں کو اس طرح جلاتی ہے جیسے آگ لکڑی کو۔

★ صبح سوئے رہنا روزی کو رد کرنا ہے۔

★ مطالعہ غم اور اداسی کا بہترین علاج ہے۔
★ انسان شکل سے نہیں عقل سے پہچانا جاتا ہے۔

افسر کا حکم

مرسلہ: نسرین ایوب، کراچی

سالانہ میٹنگ میں جب بینک کے اعلا افسر اور دوسرے ملازم اکٹھے ہوئے تو ایک بینک مینیجر نے گزارش کی، "جناب، ہمارے گن مین کے کارتوسوں کو بڑا عرصہ ہو چکا ہے۔ آپ نئے کارتوس خریدنے کی اجازت دے دیں۔"

"آپ بھی کیسے آدمی ہیں، ان کارتوسوں کو چلا کر دیکھ لیں، جو ٹھیک ہوں وہ رکھ لیں اور خراب کارتوسوں کی جگہ نئے خرید لیں" اعلا افسر اعلا نے جواب دیا۔

فیصلہ

مرسلہ: شبانہ پروین، کراچی

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ لڑکے کو باورچی بناؤں، کیوں کہ آج ہی اخبار میں اشتہار چھپا ہے۔ دیسٹ اینڈ ریستوراں کو باورچی کی ضرورت ہے۔ تجربے کے مطابق معاوضہ ۱۲۵۰ پونڈ سے ۱۵۰۰ پونڈ تک ملے گا۔ دوسرا اشتہار ہے۔ یونی ورسٹی کو سائنس کے شعبے میں ایک پروفیسر درکار ہے۔ اعلا ڈگری ہونی ضروری ہے۔ تنخواہ ۴۰۰ پونڈ ملے گی۔"

غذا اور بیماری

مرسلہ: تابندہ فخر، ڈرگ کالونی

طبی ماہرین کے مطابق آٹے اور دیگر غذاؤں میں شامل مٹی اور بجری وغیرہ سے آنتوں اور معدے کی تکالیف کے علاوہ پیٹ میں کیڑے پیدا ہوتے ہیں اور پھیپڑوں اور دل کی بیماریاں بھی لاحق ہوتی ہیں۔ مٹی اور ریت والے آٹے وغیرہ کے کھانے سے آنتوں میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے، جسے دُور کرنے کے لیے جرّاحی کا سہارا لینا پڑتا ہے، جو بعض صورتوں میں مہلک ثابت ہوتا ہے۔

تھیٹر

مرسلہ: محسن رجب علی، نواب شاہ

شو کے اوقات میں تھیٹر کمپنی گھڑی کی پابند نہ تھی۔ دو تہائی ہال کے ٹکٹ بک جائیں تو پھر ایک گھنٹے سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر ایک چار فیٹ لمبی تختی مستقل لگی رہتی ہے، "ہاؤس فل نہیں ہے۔" پردہ اُٹھنے سے پہلے تین ریکلے داغے جاتے تھے۔ یہ وہی توپیں تھیں جن کے چلتے ہی غنیم کے ہاتھی اس بری طرح بدکے تھے کہ ایک تو اپنی چپّل اور بیڑی کا بنڈل بھی چھوڑ گیا۔ پلاسی کی جنگ میں جب یہ بونی توپیں چلتی تھیں تو جتنی دُور گولا جاتا، اس سے دو چار گز آگے چل کر یہ خود پہنچ جاتی تھیں۔ جو عیّار فرنگی گولے سے بچ نکلتا وہ ان سے ڈھیر ہو جاتا۔

—— مشتاق احمد یوسفی

معلومات

مرسلہ: عبدالقدوس، عبدالرؤف، ملتان

❁ پاکستان میں کنگرس عالمی ابوریحان البیرونی ہمدرد فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام، وزارتِ تعلیم پاکستان کے زیرِ سرپرستی اور یونیسکو کے اشتراک سے ہوئی تھی۔

❁ کراچی میں ہونے والی اس کنگرس کا افتتاح اس وقت کی صوبۂ سندھ کی گورنر بیگم رعنا لیاقت علی خاں نے ۲۶۔ نومبر ۱۹۷۳ء کو کیا تھا۔

❁ "کتاب الصیدنہ" البیرونی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کا پہلی بار جناب حکیم محمد سعید نے انگریزی ترجمہ شائع کیا۔

❁ "مڈیسن ان چائنا" محترم حکیم محمد سعید کی انگریزی طبی تصنیف ہے۔

❁ ہمدرد نونہال کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔

❁ ہمدرد نونہال میں معلوماتِ عامہ کا سلسلہ اپریل ۱۹۶۶ء سے شروع ہوا۔

چراغ

مرسلہ: گل خاں نیازی، کراچی

حضرت حمدون قصار ایک رات اپنے دوست کے سرہانے بیٹھے تھے۔ وہ نزع کی حالت میں تھا۔ جب آپ کا دوست وفات پا چکا تو آپ نے چراغ بجھا دیا۔ لوگوں نے کہا، آپ نے ایسا کیوں کیا؟

آپ نے جواب دیا، اس وقت تک تو ہمارے دوست کا مال تھا، لیکن اب یتیموں کا مال ہے۔ ہمیں تیل جلانا نہ چاہیے۔

چونسٹھ دانت

مرسلہ: عقیل احمد، ماڈل کالونی

دو دوست آپس میں لڑ رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا "میں تیرے بتیس دانت توڑ دوں گا۔" دوسرا کہہ رہا تھا "میں تیرے چونسٹھ دانت توڑ دوں گا۔"

تیسرا شخص جو قریب ہی کھڑا ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا۔ وہ فوراً بول پڑا "بھائی صاحب، آدمی کے تو صرف بتیس ہی دانت ہوتے ہیں، لیکن آپ تو ......"

دوسرے آدمی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا، "مجھے پہلے ہی علم تھا کہ تم ضرور بیچ میں دخل دو گے، اس لیے میں نے تمھارے دانت بھی اس میں شامل کر لیے ہیں۔"

انسان کی طاقت

مرسلہ: مہربان اعظم، ڈیرہ اسماعیل خاں

انسان جب حقوق اللہ اور حقوق العباد کے سارے تقاضے اللہ کے حکم کے مطابق پورا کرتا رہتا ہے تو وہ مردِ مومن رہتا ہے اور مردِ مومن سمندر کی طرح اٹل، وسیع اور اتھاہ ہوتا ہے، لیکن جب وہ برائیوں اور کمزوریوں کا مجسمہ بن جاتا ہے تو وہ ایک پانی کا قطرہ بن جاتا ہے، جیسے سورج کی ایک کرن یا بارش کی ایک بوند یا ہوا کا ایک جھونکا آن کی آن میں تباہ کر سکتا ہے۔

❋

ایشیائی کھیل اور پاکستان

ساجد علی ساجد

دسویں ایشیائی کھیل جنوبی کوریا کے خوب صورت دارالحکومت سیئول میں بیس ستمبر سے پانچ اکتوبر تک ہوں گے، جن میں ۳۵ ملکوں کے دس ہزار کے لگ بھگ کھلاڑی حصہ لیں گے۔ ان کے علاوہ ڈیڑھ لاکھ کے قریب غیر ملکی مہمان ایشیائی کھیل دیکھنے آئیں گے۔

اس موقع پر سیئول میں کل ۲۷ کھیلوں کے مقابلے ہوں گے۔ ان کھلاڑیوں میں ایتھلیٹکس، تیراکی، غوطہ خوری، واٹر پولو، تیر اندازی، بیڈمنٹن، باسکٹ بال، باؤلنگ، باکسنگ، سائیکلنگ، آبی کھیل، شمشیر زنی (فینسنگ)، فٹ بال، گولف، جمناسٹک، ہینڈ بال، ہاکی، جوڈو، روئنگ (کشتی

رانی)، شوٹنگ، ٹیبل ٹینس، نائیک وانڈو (کراٹے کی ایک قسم)، ٹینس، والی بال، ویٹ لفٹنگ، ریسلنگ اور ریاٹنگ شامل ہیں۔

پاکستان جن کھیلوں میں حصہ لے رہا ہے ان میں اتھلیٹکس، باکسنگ، گولف، ہاکی، کشتی رانی، ٹیبل ٹینس، ٹینس، ریسلنگ اور ریاٹنگ شامل ہیں۔

مختلف کھیلوں کے مقابلوں کے لیے سیئول میں مختلف مقامات پر پچیس مراکز بنائے گئے ہیں۔ سیئول ہی میں ۱۹۸۸ء کے اولمپک کھیل ہوں گے۔ اس طرح ۱۹۸۶ء کے ایشیائی کھیلوں سے سیئول کے میزبانوں کے لیے اولمپک کی ریہرسل بھی ہو جائے گی۔ بیس اکتوبر کو اولمپک اسٹیڈیم میں ایشیائی کھیلوں کی افتتاحی تقریب ہو گی اور اسی مقام پر ایشیائی کھیل اختتام کو پہنچیں گے۔

جمہوریۂ کوریا جسے ایک ساتھ ایشیائی کھیل اور اولمپک کھیلوں کے لیے منتخب کیا گیا ہے شمال مشرقی ایشیا میں واقع ہے جو شمال کی طرف شمالی کوریا سے مشرق کی طرف بحرِ جاپان سے اور مغرب کی طرف بحیرۂ زرد سے گھرا ہوا ہے۔

اولمپک کھیلوں پر دنیا کی بڑی طاقتوں کی مسلسل برتری سے تنگ آ کر ایشیائی ملکوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی کھیلوں کی دنیا الگ سجائیں گے چنانچہ ۱۳۔ فروری ۱۹۴۷ء کو ایشین گیمز فیڈریشن قائم کی گئی۔ اس نے ہر چار سال بعد ایشیائی کھیل منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

پہلے ایشیائی کھیل

اس سے پہلے ایشیائی کھیل مارچ ۱۹۵۱ء میں بھارت کے دارالحکومت نئی دہلی میں ہوئے۔ جن میں گیارہ ایشیائی ملکوں انڈونیشیا، افغانستان، برما، ایران، فلی پین، جاپان، سنگاپور، ملائشیا تھائی لینڈ، سری لنکا اور بھارت شریک ہوئے۔ چار سو سے زیادہ کھلاڑیوں نے صرف چھے کھیلوں کے مقابلوں میں حصہ لیا۔ یہ کھیل اتھلیٹکس، فٹ بال، ویٹ لفٹنگ، تیراکی، سائیکلنگ اور باسکٹ بال تھے۔ ان اوّلین ایشیائی کھیلوں میں پاکستان نے شرکت نہیں کی تھی۔

دوسرے ایشیائی کھیل

دوسرے ایشیائی کھیل مئی ۱۹۵۴ء میں فلی پین کے دارالحکومت منیلا میں ہوئے۔ ملکوں

کی تعداد ۱۸ اور کھلاڑیوں کی تعداد ۹۰ تھی۔ کھیلوں کی تعداد چھے سے بڑھ کر آٹھ ہو گئی مینیلا میں پاکستان نے پہلی بار ایشیائی کھیلوں میں حصّہ لیا اور پہلی بار میں ہی اپنے وجود کا احساس دلا دیا۔ سب سے اچھی کارکردگی پاکستانی ایتھلیٹ کی رہی، جنھوں نے چار طلائی اور چار نقرئی تمغے جیتے۔ ریسلنگ میں پاکستان کو ایک طلائی، ایک نقرئی اور دو کانسی کے تمغے ملے۔ اس طرح مجموعی طور پر پاکستان نے تیرہ تمغے حاصل کیے

تیسرے ایشیائی کھیل

تیسرے ایشیائی کھیل ۱۹۵۸ء میں ٹوکیو (جاپان) میں ہوئے، جن میں بیس ایشیائی ملکوں کے ڈیڑھ ہزار کھلاڑیوں نے شرکت کی۔ کھیلوں میں بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس اور والی بال کا اضافہ ہو گیا۔ یہاں جاپان کا پلّہ بھاری رہا جس نے ۶۷ طلائی تمغے جیتے۔ پاکستان کو ۲۶ تمغے ملے، جن کی خصوصیت یہ تھی کہ پاکستان نے ہاکی میں پہلی مرتبہ ایشیائی کھیلوں کا طلائی تمغا حاصل کیا۔ پاکستان نے ایتھلیٹکس میں پانچ طلائی، چار نقرئی اور چار کانسی کے تمغے حاصل کیے۔ باکسنگ میں پاکستانی باکسروں نے دو نقرئی اور دو کانسی کے تمغے جیتے۔ سائیکلنگ میں پاکستان کو دو طلائی اور ایک کانسی کا تمغا ملا۔ پاکستانی پہلوانوں نے تین طلائی اور دو کانسی کے تمغے حاصل کیے۔ اس طرح مجموعی طور پر پاکستان کی کارکردگی اچھی خاصی رہی اور وہ فیلڈ اینڈ ٹریک مقابلوں میں دوسرے نمبر پر رہا۔

چوتھے ایشیائی کھیل

چوتھے ایشیائی کھیل انڈونیشیا کے دارالحکومت جکارتا میں ۱۹۶۲ء میں ہوئے۔ سترہ ملکوں کے ڈیڑھ ہزار سے زیادہ کھلاڑیوں نے اس میں حصّہ لیا۔ جاپان ۷۳ طلائی تمغوں کے ساتھ سب سے آگے رہا۔ پاکستان نے ۲۸ تمغے جیتے، جو ایک ریکارڈ تھا، کیوں کہ اس سے پہلے کبھی پاکستان نے اتنے تمغے نہیں جیتے تھے۔ سب سے اچھی کارکردگی پاکستانی پہلوانوں نے دکھائی، جنھوں نے تین طلائی، سات نقرئی اور چار کانسی کے تمغے جیتے۔ ایتھلیٹکس میں پاکستان نے دو طلائی، تین نقرئی اور دو کانسی کے تمغے جیتے۔ پاکستانی باکسروں نے دو طلائی، ایک نقرئی

اور دو کانسی کے تمغے حاصل کیے۔ پاکستانی والی بال ٹیم تیسرے نمبر پر رہی، جب کہ ہاکی میں بھی پاکستان نے ایشیائی چیمپئن شپ کے اعزاز کا کام یابی سے دفاع کیا۔

پانچویں ایشیائی کھیل

پانچویں ایشیائی کھیل تھائی لینڈ کے دارالحکومت بنکاک میں ہوئے۔ جاپان نے ۷۸ طلائی تمغوں کے ساتھ اپنی برتری برقرار رکھی۔ یہاں سے پاکستان کا زوال شروع ہوا، کیوں کہ پاکستانی کھلاڑی صرف آٹھ تمغے حاصل کر سکے۔ اتھلیٹکس میں پاکستان کو صرف ایک طلائی تمغا مل سکا۔ پاکستانی مکّے باز (باکسرز) دو نقرئی اور دو کانسی کے تمغے حاصل کر سکے۔ پاکستانی پہلوان بھی ناکام رہے، حتیٰ کہ پاکستانی ہاکی ٹیم بھی فائنل میں ہار گئی۔

چھٹے ایشیائی کھیل

صورتِ حال کچھ ایسی بنی کہ چھٹے ایشیائی کھیل ۱۹۷۰ء میں بنکاک میں ہوئے جن میں ۱۸ ملکوں کے ۱۷۵۰ کھلاڑیوں نے شرکت کی۔ تیرہ کھیلوں کے مقابلے ہوئے۔ یاٹنگ کو پہلی مرتبہ ایشیائی کھیلوں میں شامل کیا گیا۔ جاپان ۷۴ تمغوں کے ساتھ پھر مجموعی طور پر ایشیائی چیمپئن بنا رہا۔ پاکستان کو دس تمغے ملے، جن کی تفصیل یہ ہے: اتھلیٹکس ایک نقرئی، دو کانسی، باکسنگ ایک نقرئی، تین کانسی، ریسلنگ دو کانسی۔ پاکستان کو واحد طلائی تمغا قومی ہاکی ٹیم نے دلایا۔

ساتویں ایشیائی کھیل

ساتویں ایشیائی کھیل ۱۹۷۴ء میں تہران میں ہوئے۔ پہلی بار عوامی جمہوریہ چین نے شرکت کی۔ جنوبی کوریا، بحرین اور منگولیا بھی پہلی بار ایشیائی کھیلوں میں آئے۔ اس طرح ۱۹ ملکوں کے لگ بھگ دو ہزار کھلاڑیوں نے ان ایشیائی کھیلوں میں حصّہ لیا۔ کھیلوں کی تعداد سولہ ہوگئی۔ شمشیر زنی، جمناسٹک، ویمین باسکٹ بال اور گریکو رومن ریسلنگ کو پہلی بار شامل کیا گیا۔ پاکستان نے اس بار بھی دس تمغے جیتے، جن کی تفصیل یہ ہے: اتھلیٹکس ایک طلائی، دو کانسی، باکسنگ چار کانسی، لان ٹینس ایک کانسی، ریسلنگ ایک کانسی، ہاکی میں پاکستان نے اپنی برتری قائم رکھی اور طلائی

تمغا جیت لیا۔

آٹھویں ایشیائی کھیل

یہ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں ہونے والے تھے، مگر عین وقت پر پاکستان کے معذرت کرنے پر یہ کھیل بھی تھائی لینڈ کے دارالحکومت بنکاک میں ہوئے۔ جاپان نے پھر اپنی برتری کا پرچم ستر طلائی تمغوں کے ساتھ گاڑ دیا۔ کل ۲۵ ملکوں کے تین ہزار آٹھ سو کھلاڑیوں نے ۱۹ کھیلوں کے مقابلوں میں حصّہ لیا۔ پاکستان نے سب سے پہلے بہتر کارکردگی دکھائی اور پندرہ تمغے جیت لیے۔ قومی ہاکی ٹیم نے طلائی تمغا جیت کر اپنی ہیٹ ٹرک مکمل کرلی، مگر زیادہ حیرت انگیز کامیابی بیرام ایواری اور منیر صادق نے حاصل کی، جو خاموشی سے گئے اور باکسنگ میں طلائی تمغے جیت آئے۔ باقی تمغوں کی تفصیل یہ ہے: اتھلیٹکس ایک نقرئی، بیڈمنٹن ایک کانسی، باکسنگ ایک طلائی، ایک کانسی، لان ٹینس ایک نقرئی، ایک کانسی، ویٹ لفٹنگ ایک کانسی، ریسلنگ ایک نقرئی، تین کانسی۔

نویں ایشیائی کھیل

نویں ایشیائی کھیل بھارت کے دارالحکومت نئی دہلی میں ہوئے جہاں ۳۵ ملکوں کے لگ بھگ پانچ ہزار کھلاڑیوں نے ۲۵ کھیلوں کے مقابلوں میں شرکت کی۔ پاکستان نے مجموعی طور پر گیارہ تمغے جیتے۔ ہاکی میں پاکستان نے مسلسل چوتھی بار طلائی تمغا جیتا۔ باکسنگ میں بیرام ایواری نے اپنی بیگم گوہر بی ایواری کے ساتھ طلائی تمغا جیتا۔ باکسنگ میں پاکستان کو دو نقرئی اور چھے کانسی کے تمغے ملے۔ سردار فتح خاں نے نیزہ بازی میں نقرئی تمغا جیت لیا، البتہ پاکستانی کھلاڑی ٹیبل ٹینس، گھڑ سواری، اتھلیٹکس، وزن برداری (ویٹ لفٹنگ)، بیڈمنٹن اور لان ٹینس میں بُری طرح ناکام رہے۔

اب دسویں ایشیائی کھیل بیس ستمبر ۱۹۸۶ء سے سیئول میں ہوں گے تو پاکستانی کھلاڑی پھر اس عزم کے ساتھ شرکت کریں گے کہ وہ پہلے سے بہتر کارکردگی دکھائیں اور زیادہ سے زیادہ تمغے جیتیں تاکہ تمغے پانے والے ملکوں کی فہرست میں وہ اونچی سے اونچی جگہ پاسکیں۔

ہمدرد نونہال، ستمبر ۱۹۸۶ء

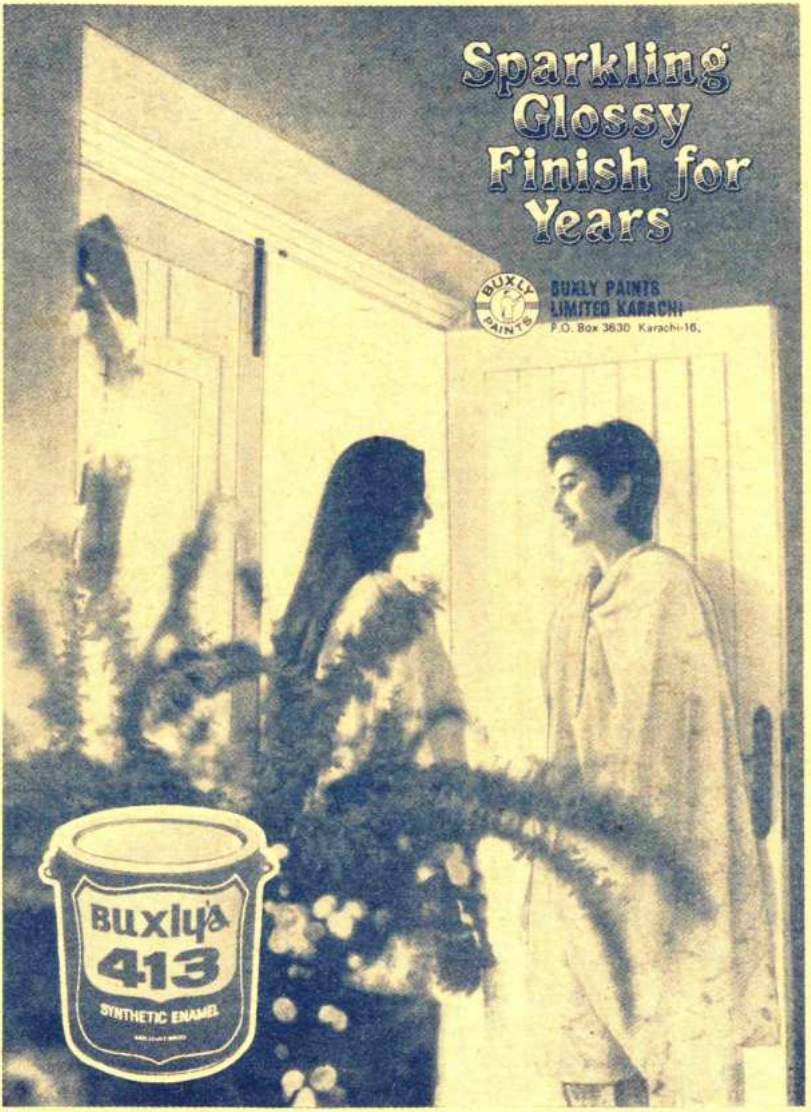
Sparkling
Glossy
Finish for
Years
BUXLY PAINTS
LIMITED KARACHI
P.O. Box 3630 Karachi-16.
Buxly's
413
SYNTHETIC ENAMEL

سدا بہار قصّے

تجھے کس نے مقرر کیا ہے؟

خلیفہ مُعتضِد (۲۷۹ھ - ۹۲۱ء) خلافتِ عباسیہ میں سولھویں نمبر پر آتا ہے۔ وہ بڑا جابر اور ظالم شخص تھا۔ بعض مجرموں کو اس نے دیواروں میں زندہ چُنوا دیا، لیکن اس کے عہد میں اللہ کے نیک بندے بھی بڑے دِل گُردے والے تھے۔ ایک بار خلیفہ نے عبداللہ بن حمدون سے پوچھا، "کیا لوگ میری بادشاہی سے خوش ہیں؟" کوئی درباری ہوتا تو تعریف میں زمین آسمان کے قُلّابے ملا دیتا، لیکن عبداللہ بن حمدون نے کہا، "نہیں، اس لیے کہ آپ ناحق لوگوں کا خون بہاتے ہیں۔" اسی طرح ایک دفعہ ایک مشہور عالم علّامہ ابوالحسن نوری ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ دیکھا تو اس میں کئی مٹکے سربند رکھے ہیں۔ پوچھا، "کیا ہے؟" ملّاح نے کہا خلیفہ مُعتضِد کی شراب ہے۔ علّامہ نے اپنی چھڑی اُٹھائی اور سب کو توڑ دیا۔ حاضرین خوف سے لرز رہے تھے۔ معتضد کو خبر ہوئی تو وہ ایک گُرز لے کر بیٹھ گئے کہ اس سے علّامہ کا سر توڑ دوں گا۔ ابوالحسن نوری حاضر ہوئے۔ خلیفہ نے پوچھا، "تو کون ہے؟" علامہ نے کہا، "مُحتَسِب۔" خلیفہ نے کہا، "تمھیں کس نے محتسب بنایا ہے؟" علامہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا، "جس نے آپ کو خلیفہ بنایا ہے۔"

میرے ذاتی معاملات میں دخل نہ دیجیے

سرسید احمد خان دہلی میں منصف کے عہدے پر فائز تھے۔ اس زمانے میں پاٹن نامی ایک انگریز سیشن جج تھا۔ کسی جاگیردار کی سیشن جج تک رسائی تھی اور اس جاگیردار کا بھائی سرسید کا دوست تھا، چناں چہ اس جاگیردار نے پاٹن سے شکایت کی کہ سید احمد خاں میرے بھائی کو بہکاتا، سکھاتا ہے اور میرے ساتھ کارروائی پر وَرغلاتا ہے۔ پاٹن نے سرسید سے اس بات کا صرف ذکر ہی نہیں کیا بلکہ یہ زور دیا

کہ وہ اپنے دوست سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔ سرسید نے کہا، "آپ بے شک میرے افسر ہیں، سرکاری معاملات میں آپ کی ہر بات کی تعمیل مجھ پر واجب ہے، لیکن میرے ذاتی معاملات میں آپ کو دخل نہیں دینا چاہیے۔ سیشن جج نے یہ معقول بات سُن کر پھر اُن پر کوئی دباؤ نہ ڈالا۔

بڑے باپ کا بیٹا

حضرت عمرو بن العاص مصر کے گورنر تھے۔ ان کے بیٹے کا نام محمد بن عمرو تھا۔ ایک مصری نے خلیفۂ وقت حضرت عمر فاروقؓ سے شکایت کی کہ محمد بن عمرو نے مجھے دس کوڑے مارے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تُو میرے منہ آتا ہے۔ میں بڑے باپ کا بیٹا ہوں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے دونوں باپ بیٹوں، یعنی حضرت عمرو بن العاص اور محمد بن عمرو کو مصر بُلا بھیجا۔ وہ آگئے تو آپ نے مصری کے ہاتھ میں کوڑا دیا اور فرمایا، "اس کوڑے سے اس بڑے باپ کے بیٹے کی خبر لے"۔ مصری نے محمد بن عمرو کو کوڑے مارنے شروع کر دیے۔ جب تک کوڑے پورے نہیں ہو گئے حضرت عمر فاروقؓ فرماتے رہے، "ہاں مارو۔ اس بڑے باپ کے بیٹے کو"۔

جب مصری کوڑوں کی تعداد پوری کر چکا تو حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عمرو بن العاص کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ایک دو کوڑے ان کو بھی رسید کرو، کیوں کہ انھی کے بَل پر بیٹے نے یہ جرات کی، لیکن مصری نے جواب دیا کہ امیر المومنین، انصاف پورا ہو گیا۔ حضرت عمر نے فرمایا، تمھاری مرضی۔

اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عمرو بن العاص کو مخاطب کر کے کہا:

"تم نے اِن لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا ہے، جب کہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا تھا"۔

یہ تھا انصاف اور یہ تھی مساوات اور برابری کہ گورنر بھی سزا سے نہیں بچتا تھا۔

گجراتی کہانی

مگر توتا گرفتار ہو گیا

مصنّف: اندو کمار جوشی - مترجم: غلام رازق شیخ

ایک بہت بڑا جنگل تھا۔ جنگل میں ایک کُٹیا تھی۔ اُس کُٹیا میں ایک بزرگ رہتے تھے۔ وہ مذہبی کتابیں پڑھا کرتے اور خدا کا ذکر کیا کرتے اور اسی طرح اپنی زندگی گزارتے۔

ایک روز کا ذکر ہے۔ بزرگ کٹیا سے باہر ایک چبوترے پر بیٹھے ہوئے پھولوں کی مالا بنا رہے تھے۔ اُسی دوران جنگل سے اُڑتا اُڑتا ایک توتا اُدھر آنکلا اور آکر بزرگ کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ایک شکاری بھی توتے کو تلاش کرتا ہوا اِدھر آنکلا۔ اس نے دیکھا تو بزرگ پھولوں کی مالا بنانے میں ایسے مگن تھے، گویا وہ اِرد گرد کے ماحول سے بالکل بے نیاز ہوں۔

"یہ بوڑھا تو اپنے کام میں مگن ہے، اگر توتا یہاں آیا ہوتا تو اس کی توجہ ضرور اسی کی طرف ہوتی۔ ایسا لگتا ہے گویا توتا ادھر نہیں آیا۔" یہ سوچتے ہوئے شکاری آگے بڑھ گیا۔ دراصل توتا پھولوں کے ڈھیر کے پیچھے وہیں بیٹھا ہوا تھا، اس لیے شکاری اسے نہ دیکھ سکا۔

جب شکاری چلا گیا تو توتے کی جان میں جان آئی۔ تب بزرگ نے اسے اپنی گود میں بٹھایا۔ اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا اور اُسے تسلّی دی۔ بزرگ نے سوچا کہ توتا تو عقل مند ہوتا ہی ہے، کیوں نہ اُسے ایسا سبق پڑھا دیا جائے کہ وہ ہمیشہ کے لیے شکاری سے ہوشیار ہو جائے۔ یہ سوچ کر بزرگ نے اُسے پڑھانا شروع کیا:

میں ہرا ہرا توتا ہوں
ہری ڈال پہ بیٹھا ہوں
نیچے نہیں آؤں گا
دانا نہیں کھاؤں گا
پھُر سے اُڑ جاؤں گا

بزرگ کئی دِنوں تک توتے کو یہ سبق رٹاتے رہے۔ کچھ دِنوں بعد ایک روز توتا خود ہی بول اُٹھا :

میں ہرا ہرا توتا ہوں
ہری ڈال پہ بیٹھا ہوں
نیچے نہیں آؤں گا
دانا نہیں کھاؤں گا
پُھر سے اُڑ جاؤں گا

یہ سُن کر بزرگ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ واہ توتے تے میری نصیحت اچھی طرح ذہن نشین کر لی ہے۔ اب شکاری کبھی بھی اسے اپنے جال میں نہیں پھانس سکے گا۔ یہ سوچ کر بزرگ مطمئن ہوگئے۔ ایک روز انھوں نے سوچا توتا اب ہوشیار ہو چکا ہے، لہٰذا اسے آزاد کر دینا چاہیے۔ آسمانوں کی سیر کرنے والے کو پنجرے میں قید رکھنے سے کیا فائدہ؟ یہ سوچ کر بزرگ نے توتے کو آزاد کر دیا۔ کچھ دِنوں بعد بزرگ کو پھر توتے کا خیال آیا۔ سوچنے لگے کہ توتے نے کیا واقعی میری نصیحت کو اپنی زندگی میں برتا ہوگا یا اُسے محض رٹ لیا تھا۔ مجھے اس کا امتحان لینا چاہیے۔

اسی خیال کے تحت بزرگ نے ایک روز ایک شکاری کو بُلوایا اور اپنے ارادے سے آگاہ کرتے ہوئے اسے ساری باتیں سمجھا دیں۔ اس کے بعد شکاری جنگل میں چلا گیا اور بزرگ کی بتائی ہوئی جگہ جال بچھا کر دانے ڈالے۔ کچھ دیر کے انتظار کے بعد آخر کچھ توتے اس میں پھنس ہی گئے۔ شکاری نے سب ہی توتے پنجرے میں بند کیے اور چلتا بنا۔ بزرگ سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق توتے لے کر وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بزرگ نے سب ہی توتے غور سے دیکھے۔ انھیں یہ دیکھ کر بے حد رنج ہوا کہ انھوں نے بڑی محنت سے جس توتے کو سکھایا پڑھایا تھا وہ بھی انھی میں قید تھا۔

"لاکھ توتے کو پڑھایا پھر بھی وہ نادان ہی رہا" بزرگ بے اختیار بول پڑے۔ افسوس کرتے ہوئے وہ کہنے لگے "کسی کو ہزار سمجھایا جائے، لاکھ نصیحتیں کی جائیں، لیکن جب تک وہ ان پر عمل پیرا نہ ہو تمام باتیں بے کار ہیں۔ جو لوگ ہدایتوں اور نصیحتوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں وہی زندگی میں کسی جال میں پھنسنے سے بچ سکتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے بوجھل قدموں سے بزرگ اپنی کُٹیا میں چلے گئے اور شکاری سب توتے لے کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

مُسکراتے رہو

ایک بچے کو باوجود کوشش کے ہفتے کے سات دنوں کے نام یاد نہ ہوئے تو ماسٹر صاحب کو ایک ترکیب سوجھی۔ انھوں نے بچے سے کہا، "کیا تمھارے گھر میں کوئی جانور وغیرہ ہیں؟" بچہ بولا، "جی، مرغی کے سات بچے ہیں۔"

ماسٹر صاحب نے کہا، "تو تم ہفتے کے سات دنوں کے نام پر ان بچوں کے نام رکھ لو۔" کافی دن گزرنے کے بعد ماسٹر صاحب نے ہفتے کے نام سنانے کو کہا تو اس نے سُنایا، "پیر، منگل، بدھ، جمعرات، جمعہ، ہفتہ، اتوار کہاں گیا؟" ماسٹر صاحب بولے۔

"اتوار کو بلّی کھا گئی۔" بچہ معصومیت سے بولا۔

مرسلہ: شبانہ نقوی، کراچی

ایک دیہاتی نے اے سے لے کر زیڈ تک انگریزی حروف یاد کر لیے۔ ایک دن اس کی ملاقات ایک شہری سے ہو گئی۔ دیہاتی نے اس سے پوچھا، "تم کتنی جماعت پڑھے ہوئے ہو؟" شہری نے جواب دیا، "بی۔ اے تک۔"

دیہاتی نے کہا، "واہ بابو جی، دو حروف پڑھے وہ بھی اُلٹے۔"

مرسلہ: محمد انور قریشی، شکار پور

ماں: بادر چی خانے میں نہ جانا۔

منّا: کیوں نہ جاؤں؟

ماں: اس لیے کہ وہاں جن بھوت رہتے ہیں۔

منّا: اچھا یہ بات ہے۔ تو پھر پھل اور مٹھائیاں تو وہ کھا جاتے ہیں اور آپ خواہ مخواہ مجھ پر شک کرتی ہیں۔

مرسلہ: عاشق علی کلہوڑو، میرپور سندھ

ایک گاؤں میں بجلی پہنچی اور ہر گھر میں بجلی کی بتیاں لگا دی گئیں۔ ایک ماہ گزرنے کے بعد میٹر انسپکٹر کو پہلے ہی گھر میں الجھن سے دوچار ہونا پڑا۔ میٹر کی ساری سوئیاں صفر پر تھیں اور گھر میں بجلی لگے ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ میٹر انسپکٹر نے صاحب خانہ کو بُلا کر پوچھا، "چودھری صاحب آپ بتّی بھی جلاتے ہیں یا نہیں؟"

چودھری نے بڑے فخر سے کہا، "کیوں نہیں جی ہر

روز رات کو جلاتے ہیں۔"

"کتنی دیر تک؟"

"بس جی یہی کوئی دس پندرہ سیکنڈ، لالٹین دیکھنے کے لیے کہ کس کونے میں بڑی ہے۔"

مرسلہ: عبدالحفیظ خاں، پرانا سکھر

❁ ایک صاحب صوبائی اسمبلی کا الیکشن جیت گئے۔ بڑی خوشی خوشی اپنے ایک دوست کو فون کیا، "بھائی، میں الیکشن جیت گیا۔"

دوست نے پوچھا، ایمان سے۔

بھئی، ایمان ویمان چھوڑو، بس جیت گیا۔

ایک دفعہ ایک گدھے نے ایک شخص کو دولتی جھاڑ دی۔ اس آدمی نے بھی غصّے میں آکر گدھے کو دو لاتیں جھاڑ دیں اور کہا، "کیا تُو سمجھتا ہے، میں تجھ سے کم ہوں۔"

مرسلہ: راشد عالم، ارشد عالم، لیاقت آباد

❁ شادی کے ایک مہینے بعد جارج کی اپنے کچھ بے تکلّف دوستوں سے ملاقات ہوئی۔

ایک نے کہا، "یار، تم تو شادی کے بعد نظر ہی نہیں آتے۔"

دوسرے نے کہا، "خوش قسمت ہو کہ تمھیں محبت کرنے والی بیوی ملی۔"

تیسرے نے کہا، "تمھاری بیوی کی تعریف نہ کرنا بے انصافی ہوگی۔ پہلے ہمیشہ تمھارے موزوں کی ایڑیاں پھٹی ہوتی تھیں، مگر اب بالکل درست موزے پہنے ہوئے ہو۔"

جارج نے ہنستے ہوئے کہا، "ہاں دوستو، میری بیوی نے سب سے پہلا کام مجھے یہی سکھایا ہے کہ پھٹے ہوئے موزوں کو کس طرح درست کیا جاتا ہے۔"

مرسلہ: ارباب امام بخش راہی، ڈھاڈر

❁ ایک نوعمر لڑکا ایک گدھے کو کھینچتا ہوا پولیس اسٹیشن کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ ایک سپاہی نے کہا، "ارے میاں، تم اپنے بھائی کو کھینچ کر کیوں لے جا رہے ہو؟"

"اس لیے کہ یہ کہیں پولیس میں بھرتی نہ ہو جائے۔"

مرسلہ: محمد عامر ایاز، لطیف آباد

❁ موسیقی کے ایک پروگرام میں جیل سے آئے ہوئے کچھ قیدیوں کو سامعین میں شامل دیکھ کر ایک صاحب کو بہت تعجب ہوا۔ انھوں نے قریب بیٹھے ہوئے شخص سے کہا، "اب تو ہمارے قیدیوں کو بڑی سہولت ملنے لگی ہے۔"

وہ شخص بولا، "سہولت؟ آپ نے ان قیدیوں سے بھی پوچھا ہے؟ یہ پروگرام ان کی سزا میں شامل ہے۔"

مرسلہ: شہر بانو غوری، الاڑکانہ

❁ ایک کنجوس شخص نماز ادا کرنے کے لیے مسجد جا رہا تھا۔ راستے میں اُسے یاد آیا کہ وہ گھر کا لیمپ جلتا ہوا چھوڑ آیا ہے، جس سے کافی تیل ضائع ہو جائے گا۔ وہ فوراً گھر واپس لوٹا اور نوکر کو آواز دی،

"میں تمھیں یہ کہنے کے لیے مسجد سے آیا ہوں کہ میرے کمرے میں لیمپ جل رہا ہے۔ اُسے بجھا دو۔"

نوکر نے کہا، "جناب، کیا آپ نے یہ نہیں سوچا کہ

واپس آنے میں آپ کے جوتے گھس گئے ہوں گے۔"

"نہیں، میں نے جوتے اُتار کر بغل میں دبا لیے تھے۔" کنجوس نے جواب دیا۔

مرسلہ: محمد ساجد اقبال، کراچی

ایک دوست دوسرے دوست سے: "تم تو کہتے تھے کہ تمھاری بیوی ڈرپوک ہے، لیکن کل تو اس نے چور کو مار مار کر اس کی ہڈیاں توڑ دیں۔"

پہلا دوست بولا: "اصل میں وہ یہ سمجھی تھی کہ میں آگیا۔"

مرسلہ: طاہر محمود، کراچی

دو میاں بیوی آپس میں کسی مسئلے پر جھگڑ رہے تھے۔ وہ کافی دیر تک جھگڑتے رہے۔ آخر میاں نے کہا، "بیگم ہمیں یہ مسئلہ عقل سے حل کرنا چاہیے۔"

بیوی غصے سے بولی، "ہاں ہاں، تاکہ تم جیت جاؤ۔"

مرسلہ: ذوالفقار علی منصور، مٹھن کوٹ

نوکر: (مالک سے) "حضور، مجھے پانچ رُپے دے دیں، تاکہ میں اپنے والدین سے مل آؤں۔"

مالک: "تمھارے والدین کہاں ہیں؟"

نوکر: "اس وقت سینما ہال میں فلم دیکھ رہے ہیں۔"

جج: (ملزم سے) کیا تم نے پہلے کبھی جیل کاٹی ہے؟

ملزم: جناب، دو دفعہ کوشش کر چکا ہوں، مگر سلاخیں اتنی موٹی تھیں کہ ناکام رہا۔

مرسلہ: محمود خاں، شادی پلی

ایک نئے نفسیاتی معالج نے ایک پرانے ہم پیشہ نفسیاتی معالج سے پوچھا، "تمام دن لوگوں کی الجھنیں، مصیبتیں اور پریشانیاں سُن سُن کر میں تو خود کو بے حد تھکا تھکا اور اداس محسوس کرتا ہوں۔ آپ تو مجھ سے بھی زیادہ لوگوں کی دکھ بھری کہانیاں سنتے ہیں۔ پھر بھی آپ اتنے تر و تازہ کیسے رہتے ہیں؟"

پرانے معالج نے جواب دیا، "یہاں سُنتا کون ہے۔"

ایک صاحب ڈرائیونگ کا امتحان دینے گئے۔ واپسی پر ان سے ایک دوست نے پوچھا، "کیوں بھئی، امتحان کا نتیجہ کیا نکلا؟"

انھوں نے جواب دیا، "میرے ہوش میں آنے تک میرا امتحان لینے والے سارجنٹ کو ہوش نہیں آیا تھا، نتیجہ کس سے پوچھتا؟"

مرسلہ: عائشہ عنبرین، کراچی

شوہر: (بے تحاشا ہنستے ہوئے) ہاہا، ہی ہی، ہو ہو۔ بیگم تم اسے ساڑھی کہتی ہو۔ یہ تو زیبرے کی کھال ہے۔ میری تو ہنسی نہیں رُکتی۔ ہاہا.....

بیوی: جب ساڑھی کا بل آئے گا تو تمھاری ہنسی خود بہ خود رُک جائے گی۔

ٹکٹ چیکر: (مسافر سے) "آپ کے پاس ٹکٹ نہیں ہے اور آپ اتنے آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں؟"

مسافر: معاف کیجیے غلطی ہوگئی، پیچھے میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔

مرسلہ: ایم ایس ناز، ایم این ناز، ایم اے ناز، فیصل آباد

ایک موٹی عورت اپنے شوہر کے ساتھ ریل میں سفر کر رہی تھی۔ وہ اپنے شوہر سے بولی، "میں اوپر والے برتھ پر نہیں جاؤں گی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

شوہر بولا، "اوپر جاؤ، برتھ خود ہی نیچے آجائے گی۔"

استاد: بارش کے فائدے بتاؤ۔

شاگرد: سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اسکول کی چھٹی ہو جاتی ہے۔

مرسلہ: سید عرفان عاصم علی زبیری، ماڈل کالونی

نقاد: (مصور سے) تو یہ ہے وہ خوف ناک، ہیبت ناک اور وحشت ناک تصویر جس کو آپ نے تجریدی مصوری کا شاہ کار قرار دیا ہے؟

مصور: آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، تصویر کہاں ہے آئینہ ہے۔

مرسلہ: ہما گلناز، کراچی

ایک صاحب نے اپنی بیوی کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے اپنے دوست کو بتایا، "میری بیوی میں ایک وصف بہت بڑا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے وقت سے دس برس آگے رہتی ہے۔"

دوست نے پوچھا، "یہ اندازہ تمھیں کیسے ہوا؟"

ان صاحب نے جواب دیا، "وہ میری ۱۹۹۶ء کی تنخواہ خرچ کر چکی ہے۔"

مرسلہ: لبنیٰ نور، لانڈھی

خاتون: میں تمھیں بتا چکی ہوں کہ مجھے ڈکشنری کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس پہلے ہی ایک ڈکشنری موجود ہے۔

سیلز مین: لیکن آپ کی الماری میں تو مجھے کوئی ڈکشنری نظر نہیں آرہی ہے۔

خاتون: وہ اُدھر میز پر رکھی ہے۔

سیلز مین: ارے نہیں مادام، آپ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔ وہ تو بائبل ہے۔

خاتون: اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بائبل ہے، لیکن کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اتنی دُور سے تم نے بائبل کو کیسے پہچان لیا؟

سیلز مین: اس پر جمی ہوئی دُھول دیکھ کر۔

مرسلہ: ام عنبرین، ہائیر کالونی

بیٹا: امی، قبر میں کیا ہوتا ہے؟

ماں: قبر میں سوال جواب ہوتے ہیں۔

بیٹا: امی، پھر آپ مجھے ابو کی قبر میں دفن کیجیے گا تاکہ جو سوال مجھے نہیں آئے وہ میں ابو سے پوچھ لوں۔

مرسلہ: طارق منظور، پشاور

ایک آدمی کو دن کے دو بجے ایک مچھر نے آ کے کاٹا۔

آدمی مچھر سے بولا، "میاں، تم تو رات کی ڈیوٹی دیتے تھے آج دن میں کیوں آئے ہو؟"

مچھر نے جواب دیا، "بھوں بھوں بھوں۔ جناب، آج میں اوور ٹائم کرنے آیا ہوں۔"

مرسلہ: محمد صدیق حاجی، جمعہ گوٹھ

سپاہی: (افیونی سے) "تم نشے میں سڑک پر پڑے

ہوئے ہو۔ فوراً میرے ساتھ کھانے چلو۔"

افیونی: اگر مجھ میں چلنے کی سکت ہوتی تو گھر نہ چلا جاتا۔

باپ: کیوں بیٹے، امتحان میں سوالات تو مشکل نہ تھے۔

بیٹا: نہیں ابّو، سوالات تو بڑے آسان تھے۔ بس جواب مشکل تھے۔

باپ: کیوں بیٹے، پیدل چلیں یا بس پر؟

بیٹا: آپ کی مرضی، ویسے اگر پیدل چلنا ہے تو مجھے گود میں اُٹھا لیں۔

مرسلہ: شیخ محمد حنیف سویا، شکارپور

انگریزی کے مشہور مصنّف چارلس لیمب کسی زمانے میں "انڈیا ہاؤس" میں ملازم تھے۔ یہ ملازمت اُن کے مزاج کے قطعی خلاف تھی، اس لیے وہ اس میں دل چسپی نہیں لیتے تھے اور وقت کی پابندی کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ یہ بات ان کے افسر کو معلوم ہوئی تو ایک دن اُس نے ان سے کہا،

"میں کئی دِنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ مسلسل دفتر دیر سے آ رہے ہیں۔"

"جی ہاں جناب۔" چارلس نے اس کی بات تسلیم کرتے ہوئے کہا، "لیکن کیا آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ میں اس کے بدلے میں دفتر سے جلد چلا بھی جاتا ہوں۔"

ایک بار ایک معزز شخص برطانیہ کے وزیرِ اعظم کے ساتھ تھیٹر دیکھ رہا تھا۔ وہ شخص وزیرِ اعظم کی طرف مُڑا اور اس نے پوچھا،

"جنابِ عالی وہ بدصورت عورت کون تھی جو کچھ دیر پہلے یہاں تھی؟"

وزیرِ اعظم نے جواب دیا، "اوہ، وہ عورت؟ وہ میری بیوی تھی!"

"معاف کیجیے گا جناب، میں آپ سے ہزار دفعہ معذرت خواہ ہوں۔ میرا مطلب اس ہونق سی لڑکی سے تھا جو ان کے ساتھ تھی۔"

"وہ میری بیٹی تھی۔" وزیرِ اعظم نے جواب دیا۔

پہلا کھلاڑی: "کیا بات ہے، اتنے رنجیدہ کیوں ہو؟"

دوسرا کھلاڑی: "میرے ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ مجھے فوراً ہاکی کھیلنا بند کر دینا چاہیے۔"

پہلا کھلاڑی: معلوم ہوتا ہے اس نے تمھارا کھیل دیکھ لیا ہے۔"

مرسلہ: سرفراز عارف، کراچی

ایک شخص ہانپتا کانپتا تھانے پہنچا اور انسپکٹر سے کہنے لگا، "انسپکٹر صاحب، مجھے جیل بھیج دیجیے۔ میں نے اپنی بیوی پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔" انسپکٹر گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا، "کیا وہ مر گئی؟"

"یہی تو مصیبت ہے وہ بچ گئی ہے، مجھے جلدی سے جیل بھیج دیجیے۔"

مرسلہ: الطاف رشید، عزیز آباد

Glass users throughout Pakistan are pleasantly experiencing the ***RELIABLE*** difference.

Baluchistan Glass Limited

More than a name ...
A total commitment to quality, service and innovative leadership.

پانی کی کھال

مناظر صدیقی

اگر تم کسی ڈونگی یا چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر کسی بہت چھوٹے سے تالاب کی سیر کرو تو تم وہاں ایک عجیب و غریب تماشا دیکھو گے یعنی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نما کیڑے تمھیں پانی کی سطح پر چلتے ہوئے نظر آئیں گے، لیکن نہ تو وہ پانی میں ڈوبتے ہیں نہ ان کے جسم کا کوئی حصّہ پانی میں بھیگتا ہے۔ تمھیں ایسا معلوم ہو گا جیسے یہ جادو ہے۔ یا تو یہ جادو کے کیڑے ہیں جو پانی میں نہیں ڈوبتے یا پھر یہ پانی کا جادو ہے جو نہ تو کیڑوں کو ڈبوتا ہے نہ انھیں بھگوتا ہے۔ تم ضرور سوچو گے کہ آخر یہ کیسے ہوتا ہے؟ کیڑے ڈوبتے کیوں نہیں؟ تمھارا جی چاہے گا کہ تم بھی اسی طرح پانی پر چل سکتے تو کتنا اچھا ہوتا۔

بات اصل میں یہ ہے کہ پانی کی بھی کھال یا جلد ہوتی ہے، لیکن یہ ہماری جلد کی طرح نظر نہیں آتی۔ ہوتا یہ ہے کہ پانی کے ننھے ننھے قطرے جنھیں سائنس کی زبان میں سالمے (مالی کیول) کہا جاتا ہے۔ ایک دوسرے سے چپکے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ سالمے مل کر پانی کی سطح پر ایک نظر نہ آنے والی تہ یا جلد بنا دیتے ہیں۔ اس جلد کو ہم پانی کا تناؤ کہہ سکتے ہیں۔ پانی کی یہ جلد بہت زیادہ مضبوط نہیں ہوتی۔ جب ہم پانی میں کود تے ہیں تو یہ جلد پھاڑ کر پانی کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں، لیکن پانی پر جو کیڑے تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ چوں کہ بہت ہلکے ہوتے ہیں اس لیے ان کے وزن سے پانی کی جلد نہیں پھٹتی اور وہ اسے چلنے پھرنے کے لیے کسی سخت سطح کی طرح استعمال کر سکتے ہیں۔

پانی کا جادو تم بھی کر سکتے ہو یعنی پانی کا ایک ایسا کھیل یا تماشا جو جادو سمجھا جائے اس کے لیے تمھیں صرف تین چیزوں کی ضرورت ہو گی:

(۱) ایک چوڑے منھ کی خالی بوتل

(۲) گاز کپڑے کا ایک ٹکڑا

(۳) ربر کا ایک مضبوط چھلّا

بوتل میں پانی بھر لو۔ پھر کپڑے کی کئی تہیں بنا کر اسے نل کی ٹونٹی سے اچھی طرح بھگو لو اسے دیکھتے رہو کہ پانی اس کپڑے میں سے کس طرح بہ کر نکلتا ہے۔ جب یہ کپڑا اچھی طرح بھیگ جائے تو اسے تان کر بوتل کے منھ پر رکھ دو اور ربر کے چھلّے مضبوطی سے باندھ دو۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ بوتل کا منھ ربر کے چھلّے سے اچھی طرح بند ہو جائے۔ کوئی ذرا سی جھری بھی باقی نہ رہے۔ اب پھرتی سے بوتل کو اُلٹ دو۔ تم دیکھو گے کہ پانی بوتل سے باہر نہیں نکلے گا۔ پھر بوتل کے منھ پر منڈھے ہوئے گاز کپڑے کے ہر ننھے منّے سوراخ میں پانی بھر چکا ہو گا۔ پانی کی جلد یا پانی کی سطح کا تناؤ پانی کو بوتل سے باہر نہیں نکلنے دے گا۔

پانی کی جلد یا سطح کا تناؤ بہت کم زور ہوتا ہے۔ اس لیے اگر تم بوتل کو ہلاؤ گے یا کپڑے کو انگلی سے چھیڑو گے تو پانی نیچے گرنے لگے گا۔

پانی کی سطح کے تناؤ سے فائدہ اُٹھا کر ہم کسی گلاس کو لبالب بھر سکتے ہیں، بلکہ بعض اوقات پانی گلاس کے کناروں سے بڑائے نام اوپر بھی ہو جاتا ہے۔ اس کا تجربہ کرنے کے لیے تمھیں ایک چھوٹے گلاس اور تیس چھوٹے پیسوں کی ضرورت ہو گی۔

گلاس میں اس کی اوپری سطح تک پانی بھر دو۔ اب ان میں چھوٹے پیسے ایک ایک کر کے ڈالو، لیکن اس بات کا خیال رہے کہ نہ تو تمھاری انگلیاں پانی کی سطح کو چھونے پائیں نہ پیسے پانی میں ڈالتے وقت اتنی زور سے ٹپکائے جائیں کہ پانی چھلک پڑے یا اس کی بوندیں اچھل جائیں۔ پیسے پانی میں ڈالنے کے لیے تم چھوٹی چمٹی استعمال کر سکتے ہو تاکہ پیسے بہت احتیاط سے پانی میں داخل ہوں۔

جب تم اس میں دس پندرہ پیسے ڈال چکے ہو گے تو تم دیکھو گے کہ پانی کی سطح حقیقت میں گلاس کے کناروں سے بھی اوپر ہو گی۔ پانی کی سطح ایک بڑے بلبلے کی طرح اُبھری ہوئی ہو گی۔ اصل بات یہ ہے کہ پانی کی سطح کا تناؤ پانی کو روکے ہوئے ہوتا ہے اور اسے نیچے نہیں گرنے دیتا۔

اب تم سمجھ سکتے ہو کہ پانی کی سطح پر کیڑوں کا چلنا، بوتل کا پانی سے نیچے نہ گرنا اور گلاس سے پانی کا نہ چھلکنا، یہ سب پانی کا جادو ہے۔

مگر فساد خون سے بچنے کے لئے صافی بہتر ہے

خون میں سرایت کئے ہوئے فاسد مادے پھوڑے پھنسیوں اور کئی دوسری جلدی بیماریوں کو جنم دیتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لئے صافی باقاعدگی کے ساتھ استعمال کیجئے۔ خون کی صفائی اور جلدی بیماریوں سے محفوظ رہنے کا مفید ذریعہ ہے۔

جڑی بوٹیوں
سے تیار شدہ

صافی

ہمدرد

سے خون بھی صاف، جلد بھی صاف

اس شمارے کے مشکل الفاظ

نونہالوں کی خواہش پر ہر لفظ کے سامنے اُس زبان کا اشارہ بھی لکھا جا رہا ہے جس سے وہ لفظ اردو میں آیا ہے۔
یہ اشارے اس طرح لکھے ہوں گے، ع: عربی، ف: فارسی، ہ: ہندی، س: سنسکرت، ت: ترکی، انگ: انگریزی، ا: اردو

ازبر :(ع) اَ زْ بَرْ : حفظ کرنا، زبانی یاد کرنا

جاں پرور :(ف) جاں پَرْ وَرْ : پرورش کرنے والا، پالنے والا

عزائم :(ع) عَزَا اِ مْ : عزیمت کی جمع۔ ارادے

ششدر :(ف) شَشْ دَرْ : حیران، پریشان، حیرت زدہ

مُرصّع :(ع) مُ رَصْ صَعْ : خوش بیانی سے آراستہ، نگینے یا جواہرات جڑا ہوا، موزوں الفاظ جو نظم و نثر میں نگینے کی طرح جڑے ہوں

شقی القلب :(ع) شَقِی اُلْ قَلْبْ : سنگ دل، بے درد

اجتناب :(ع) اِجْ تِنَابْ : پرہیز، کنارہ کشی

مہ پارہ :(ف) مَہْ پارَہْ : چاند کا ٹکڑا، محبوب، خوب صورت

فی الفور :(ع) فِلْ فَوْرْ : فوراً۔

ہم جلیس :(ع) ہَمْ جَلی سْ : ساتھی، ہم نشین، مصاحب

محتشم :(ع) مُحْ تَشِمْ : شان و شوکت والا

تشدّد :(ع) تَ شَدْ دُدْ : سختی، زیادتی، جبر

حواس باختہ :(ع) حَ وَاس باخْ تَہْ : گھبرایا ہوا۔ ہکا بکا

تلقین :(ع) تَلْ قِیْن : نصیحت، سمجھانا، تعلیم دینا

تیروسناں :(ف) تِیْر و سِناں : تیر اور بھالا۔

معبود :(ع) مَعْ بُوْ دْ : جس کی عبادت کی جائے، اللّٰہ تعالیٰ

نافع :(ع) نَا فِعْ : نفع دینے والا، اللّٰہ تعالیٰ کا نام بھی ہے، مفید۔

فرمودہ :(ف) فَرْ مُو دَ ہْ : کہا ہوا، فرمایا ہوا، حکم

ہراساں :(ف) ہَرَ ا ساں : ڈرا ہوا، خوف زدہ

مقصود :(ع) مَقْ صُوْ دْ : مقصد، غرض، مُدّعا، مطلب۔

انتشار :(ع) اِنْ تِشَا رْ : گھبراہٹ، پریشانی، پھیلنا

متاع :(ع) مَتَا عْ : مال و اسباب، پونجی

سپنا :(ہ) سَپْ نَا : خواب

مطلوب :(ع) مَطْ لُوْبْ : جس چیز کی طلب ہو، پسندیدہ

حق العباد :(ع) حَقْ قُلْ عِبَادْ : بندوں کا حق

مصائب :(ع) مَصَا اِ بْ : مصیبت کی جمع، تکلیفیں

وضع :(ع) وَضْ عْ : بناوٹ، دستور، چلن، صورت، طور طریق

جُثّہ :(ع) جُثْ ثَہْ : بدن، جسم

طمانیت :(ا) طَمَا نِیَت : اطمینان، سکون، آرام

صحّت مند نونہال

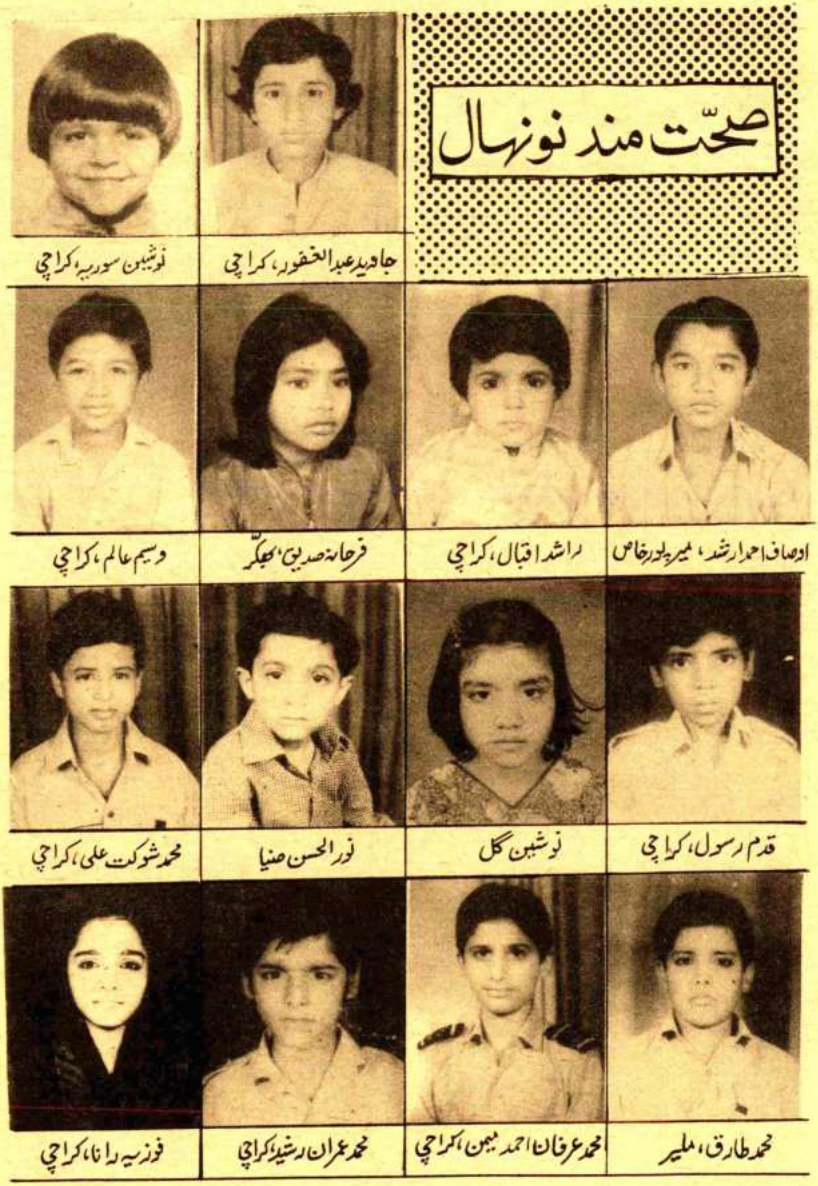

جاوید عبدالغفور، کراچی
نوشین سوریہ، کراچی
اوصاف احمد رشد، میرپور خاص
راشد اقبال، کراچی
فرحانہ صدیق، بھکّر
وسیم عالم، کراچی
قدم رسول، کراچی
نوشین گل
نور الحسن ضیا
محمد شوکت علی، کراچی
محمد طارق، ملیر
محمد عرفان احمد میمن، کراچی
محمد عمران رشید، کراچی
فوزیہ رانا، کراچی

منتخب کہانیاں

خاص نمبر (ستمبر ۱۹۸۵ء) میں انعامی کہانیوں کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس میں جو کہانیاں اول، دوم اور سوم آئی تھیں وہ فروری ۸۶ء میں شائع ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ پندرہ اچھی کہانیوں میں سے دو کہانیاں یہاں شائع کی جا رہی ہیں۔ باقی آئندہ شائع کی جائیں گی۔

مہمانِ خصوصی

شہیرہ وارث، راولپنڈی

اسے آج صبح سے کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ بھوک کی شدت سے وہ کم زوری محسوس کر رہا تھا۔ بھوک کی حالت میں تو بڑا انسان بھی کسی کا لقمہ بھی چھین لیتا ہے۔ وہ تو ابھی معصوم بچہ تھا۔ بچپن میں اس کے ماں باپ ایک حادثے میں چل بسے اور وہ اس دنیا میں مصائب کا پہاڑ عبور کرنے کے لیے اکیلا رہ گیا۔ ماں باپ کے تصوّر سے دو آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک آئے۔ اس کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔ بڑے بڑے رفاہی ادارے نہ جانے کن غریبوں کی مدد کر رہے تھے۔

ابھی وہ انھی خیالات کے تانے بانے میں اُلجھا ہوا تھا کہ ایک کار تیزی سے اس کے سامنے سے گزری۔ اس نے نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ کچھ فاصلے پر شامیانے نصب تھے، جن میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ کار سے ایک ادھیڑ عمر کا خوش پوش آدمی اُترا۔ اُس کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ چہرے پر غرور اور تکبّر تھا۔ وہ نہایت غرور سے تقریب کا افتتاح کرنے کے بعد اسٹیج پر مہمانِ خصوصی کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد اسٹیج سیکرٹری نے اسے اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ فوٹو گرافروں کے کیمروں کی روشنیاں اس پر پڑ رہی تھیں۔ اس نے تقریر شروع کی:

"عزیز سامعین! آپ جانتے ہیں بچے ہمارا سرمایہ ہیں۔ ہماری قوم کا مستقبل ہیں۔ کل انھیں ہمارے ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ سڑکوں پر پھرنے والے ان بے بس اور غریب بچّوں کو دیکھیے۔ ان کی مدد

کیجیے، ورنہ کل یہ بچے معاشرے پر بوجھ بن جائیں گے۔"

تقریر ختم ہوئی اور وہ تالیوں کی گونج میں جلسہ گاہ سے اپنی کار کی طرف بڑھا۔ اچانک ایک بچہ جو میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس تھا، گاڑی کے سامنے آگیا، "بابو جی، کل سے بھوکا ہوں۔"

امیر آدمی نے اُسے جھڑک دیا۔ بچہ پھر چلّایا، "بابو جی، صرف ایک رُپیہ آپ ..... آپ امیر ہیں بابو جی، ایک رُپیہ ....." امیر آدمی نے زور سے دروازہ بند کیا اور بچے کو بُری طرح ڈانٹا۔ بچے کو اس سے کچھ ملنے کی امید تھی۔ مجمع اس شخص کے لیے زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا۔

بچہ پھر چلایا، مگر اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے کار بچے کو دھکا دیتے ہوئے آگے نکل گئی.... مجمع اب بھی زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا۔

سبق

حلیمہ کوثر، بہار کالونی کراچی

اطہر کا اور میرا بچپن ساتھ ساتھ گزرا۔ ہم دونوں نہ صرف دوست اور ہم جماعت تھے، بلکہ چچا زاد بھائی اور پڑوسی بھی تھے۔ اطہر کے اور میرے ابّو آپس میں بھائی تھے اور ہمارے گھر بھی قریب قریب تھے۔ اطہر اور میں دونوں ساتھ اسکول جاتے اور واپس آتے تھے۔ اسی طرح ہم مل کر باغ میں کھیلتے، شرارتیں کرتے اور مار کھاتے تھے۔ چوں کہ باغ ہمارے گھر سے قریب تھا اس لیے اسکول سے واپسی کے بعد ہمارا زیادہ تر وقت اسی باغ میں گزرتا تھا۔ باغ کی ہری ہری گھاس پر لیٹنے، قلابازیاں کھانے اور آم کے پیڑ پر چڑھنے اور گرنے میں ہمیں بڑا مزا آتا تھا۔

ایک دن جب کہ ہمارا اسکول بند تھا۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا آسمان پر اُڑتے ہوئے پرندوں کو گننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اطہر کی مسرت بھری آواز سنائی دی۔ وہ مجھے باغ میں بُلا رہا تھا۔ آواز سنتے ہی میں نے جلدی میں باغ کی جانب دوڑ لگا دی۔ وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ ایک کوّا گھاس پر بیٹھا ہوا تھا اور اطہر نہایت دل چسپی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ میرے پوچھنے سے پہلے اس نے بولنا شروع کر دیا، "دیکھو اکرم، یہ کوّا بے چارہ زخمی ہے۔ معلوم نہیں اس کا بازو کس طرح ٹوٹ گیا۔ افسوس، اب یہ اُڑ نہیں سکتا۔ بھائی اکرم اب یہ زندہ کس طرح رہ سکے گا؟" اطہر کا حساس دل کوّے کی حالت پر پریشان تھا۔ اتنے میں ہمیں وہاں موجود پاکر آم کے پیڑ پر بسیرا کیے

ہوئے کوّوں نے اپنی کائیں کائیں سے ہمارے کان کھانے شروع کر دیے۔ وہ شاید اپنے ساتھی کی تکلیف کا سبب ہم کو سمجھ رہے تھے۔ ہم دونوں ان کوّوں سے خوف زدہ ہو کر دُور ہٹ گئے۔ اطہر برابر زخمی کوّے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ دوسرے کوّے اس کو نقصان پہنچائیں گے۔ چند لمحوں بعد ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ ایک کوّے نے کوئی چیز زخمی کوّے کے پاس گرائی، جسے وہ اپنے پنجوں اور چونچ سے نوچ نوچ کر کھانے لگا۔ اطہر خوشی بھرے لہجے میں بولا، "دیکھو اکرم، پرندے اپنے ساتھیوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ یہ کوّے اس زخمی کوّے کی مدد کو آئے ہیں۔

اطہر نے اس واقعے سے ایسا سبق سیکھا کہ اس کے بعد وہ ہر دم ہر ایک کی مدد کے لیے تیار رہتا۔ اکثر چھوٹے بچّوں کو اسکول پہنچا آتا۔ کسی بھی معذور اور ضعیف شخص کو دیکھتا تو اس کی مدد کو دوڑ پڑتا۔ اکثر اسکول سے واپسی پر اس کو اس وجہ سے دیر ہو جاتی کہ وہ راستے میں کسی بوڑھی عورت کو بوجھ اٹھائے ہوئے دیکھ کر اس کے گھر سامان پہنچا آتا۔ کبھی کبھی میں اس کی ان حرکتوں پر ناراض ہو جاتا۔ تب وہ کہتا، اکرم، اللہ تعالیٰ نے ہاتھ پاؤں اسی لیے تو دیے ہیں کہ دوسرے کے کام آئیں۔ اپنے لیے تو صرف جانور جیتے ہیں، ہم تو انسان ہیں اور پھر مسلمان اور پاکستانی بھی۔ خدمت کا تو کوئی مول نہیں۔"

وقت گزرتا رہا اور ہم اسکول کو خیر باد کہہ کر کالج میں جا پہنچے۔ اطہر یہاں بھی میرا ہم جماعت تھا۔ وہ نہ صرف یہ کہ پڑھائی میں مجھ سے تیز تھا، بلکہ ہر کام میں وہ آگے آگے رہتا تھا۔ کالج میں بھی ہر وقت دوسروں کی مدد کو تیار رہتا۔ کبھی کسی غریب طالب علم کی فیس کا مسئلہ حل کر رہا ہے تو کبھی کسی کو کتابیں پہنچا رہا ہے۔ یہاں اس نے ایک تنظیم قائم کی، جس کا مقصد معذور اور نابینا افراد کی مدد کرنا اور ان کو زندگی کی خوشیوں میں شریک کرنا تھا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ معذور بچّوں کے اسکولوں اور اداروں کے لیے چندہ جمع کرتا تھا۔ ہر ہر دروازے پر دستک دیتا اور لوگوں کو اس خدمت کا احساس دلاتا۔ نابینا طلبہ کے لیے وظائف اور کیسٹوں کا بندوبست کرتا، تاکہ وہ ان کیسٹوں سے علم حاصل کر سکیں۔ نابینا افراد سے اس کو خاص طور پر ہمدردی تھی۔ وہ اکثر کہتا، "اکرم، تمھیں ہیلن کیلر کی کہانی یاد ہے؟" اور میرے یہ کہنے پر کہ ہاں ہیلن کی زندگی میں معذوروں کے لیے ہمت اور ارادے کا ایسا سبق موجود ہے جو اُن میں زندگی کی اُمنگ اور آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ تب وہ ہنس دیتا اور کہتا، "مجھے تو ہیلن کی استانی نے متاثر کیا، اگر ہم میں کچھ لوگ معذور افراد کی اس طرح تعلیم پر کام کر سکیں تو بلاشبہ ہمارے ملک کی ایک بڑی آبادی ہمارے ساتھ ملک کی ترقی میں مددگار ہو گی۔ میں چاہتا ہوں اکرم، کہ نابیناؤں کے لیے کچھ کام

ایسا کروں کہ میری آنکھیں بے شمار نابیناؤں کی آنکھیں بن جائیں۔" میرا یہ دوست اور بھائی جو سفید چھڑی بن کر اپنے نابینا بھائیوں کا سہارا بننا چاہتا تھا، ایک دن جب کہ وہ ایک نابینا ساتھی کو اپنے اسکوٹر پر کالج پہنچاتے جا رہا تھا کہ ایک تیز رفتار ویگن نے اس کی اسکوٹر کو کھلونے کی مانند اُچھال دیا اور میرے اس دردمند بھائی کا فُٹ پاتھ سے سر اس طرح ٹکرایا کہ وہ لہولہان ہو گیا۔ سارے لوگ اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ کئی دن بے ہوش رہنے اور سر کے کئی آپریشن کے بعد وہ جب موت کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا تو اس کی وہ آنکھیں، جو نہ جانے کتنے نابیناؤں کا سہارا تھیں، ضائع ہو چکی تھیں۔

آج میرا دوست، میرا ساتھی خود سفید چھڑی کا محتاج ہے۔ میں اس کے سامنے اپنے غم کا اظہار نہیں کرتا، مگر اس کی یہ معذوری مجھے خون کے آنسو رُلاتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ اطہر نے بچپن میں ایک کتّے سے انسانیت کا وہ سبق سیکھا تھا جو خدمت کی بہترین مثال تھا، مگر وہ ویگن کا ڈرائیور ایک انسان ہوتے ہوئے بھی کتّے جیسے پرندے سے بدتر نکلا۔

میرا ساتھی آج بھی باحوصلہ ہے اور اپنے ہاتھ میں سفید چھڑی تھامے اور بریل پر انگلیاں متحرک کیے علم کے حصول میں مصروف ہے اور اپنی قسمت پر شاکر رہتے ہوئے کہتا ہے:

"اب میرے لیے اپنے جیسے ساتھیوں کو بریل کے ذریعہ سے تعلیم دینا زیادہ آسان ہو گیا ہے، کیوں کہ میں ان کی دشواریوں کو زیادہ صحیح طور پر سمجھ سکتا ہوں۔" اس کے دل میں آج بھی وطن اور اپنے ساتھیوں کی خدمت کا جذبہ موجزن ہے اور وہ بے نور آنکھوں سے بھی روشنیاں پھیلا رہا ہے۔

○

ہم چاہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اخبارِ نونہال کی خبریں معتبر اور مستند ہوں تاکہ ہر ایک یہ کہہ سکے کہ اخبارِ نونہال میں یہ خبر یا معلومات آئی ہے تو ضرور صحیح ہو گی، لیکن بعض نونہال خبر کے ساتھ یا تو تراشہ نہیں بھیجتے یا تراشے پر اخبار کا نام و تاریخ لکھنی بھول جاتے ہیں۔ جس اخبار سے آپ تراشہ کاٹیں اُس کا نام، شہر کا نام اور اخبار کی تاریخ ضرور تراشے پر یا تراشے کو کاغذ پر چپکا کر نیچے لکھ دیا کیجیے۔ بعض نونہالوں کی بھیجی ہوئی خبریں اچھی ہونے کے باوجود حوالہ نہ ہونے کی وجہ سے شائع نہیں ہوتیں۔ اگر کسی کتاب سے آپ نے معلومات لی ہے تو کتاب کے نام کے علاوہ صفحے کا نمبر بھی لکھ دیا کیجیے۔

مدیر اعلا

نونہال ادیب

حمد

مرسلہ: فضل ربی راہی، مینگورہ

تُو ہے مالک بحر و بر کا
تُو ہے خالق خیر و شر کا
ساری فصلیں تُو نے اُگائیں
تو رازق ہر ایک بشر کا
صحرا تیرے، دریا تیرے
ناظم ہے تُو خشک و تر کا
مولا میری جھولی بھر دے
میں پیاسا ہوں علم و ہنر کا

نعت

مرسلہ: خالد محمود قریشی، روہڑی

نعت ہو سرکار کی کیوں کر بیاں
ہے قلم حیراں، عاجز ہے زباں
آپ ہی ہیں رحمۃ للعالمین
کہہ رہا ہے خود یہ قرآنِ مبیں
جب ہوا اس ذاتِ اقدس کا ظہور
گر پڑے باطل کے ایوان و قصور
جہل کی تاریکیاں سب چھٹ گئیں
شرک و ظلمت کی جڑیں بھی کٹ گئیں
ہر طرف پھیلی ضیا اسلام کی
علم و عرفاں کی، خدا کے نام کی
اے شہِ والا ادھر بھی اک نظر
آپ کی امت ہوئی بے بال و پر
آج پھر نرغے میں ہیں باطل کے ہم
دُور کر دیں پھر ہمارا رنج و غم
حال ہے محمود کا ابتر حضورؐ
اس کو بُلوا لیجیے یثرب حضورؐ

چھوٹے بچے

مرسلہ: شگفتہ یوسف، راولپنڈی

ہم ہیں اب معصوم سے بھول
اکثر ہو جاتی ہے بھول
بڑو! ہمیں کر دینا معاف
دل تو ہیں نا سب کے صاف
ریس تمہاری کرتے ہیں
پیچھے قدم بھی دھرتے ہیں
ہم ہیں اب معصوم سے بھول
اکثر ہو جاتی ہے بھول

ہے زندگی کا مقصد

مجیب ظفر انوار، کراچی

"کیا سوچ رہے ہو بھائی، چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے کیا چائے پینے کا بھی ارادہ نہیں ہے؟"

"ایں .... ہاں ہاں.... اچھا اچھا!" ڈاکٹر فہیم کے کہنے پر ڈاکٹر سعید چونک گیا اور اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اس نے ایک نظر ڈاکٹر فہیم کو دیکھا اور پھر جلدی سے سامنے رکھی چائے کی پیالی اُٹھا کے اپنے ہونٹوں سے لگالی۔ اس کا چہرہ پیالی کے پیچھے چھپ چکا تھا اور فہیم اس کے چہرے پر پیدا ہونے والے جذبات کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔

ڈاکٹر فہیم تھوڑی دیر تک بہ غور اُسے دیکھتا رہا اور پھر شانے اُچکا کر بولا "تمہاری مرضی، بتا دیتے کہ تم کیا سوچ رہے تھے۔ ویسے نہ بتاؤ تو بھی تمہاری مرضی!" ڈاکٹر سعید یہ سن کر مسکرا اُٹھا۔ پیالی میز پر رکھی اور بائیں ہاتھ سے فہیم کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا "تم بتا دو دوست کوئی ڈاکٹر کس وجہ سے پریشان ہو سکتا ہے؟"

"بھئی ظاہر ہے کسی پریشانی کی وجہ سے!" ڈاکٹر فہیم نے اس پر طنز کیا۔

"وہی تو پوچھ رہا ہوں کس قسم کی پریشانی!"

"کسی مریض کی بگڑتی ہوئی حالت!" ڈاکٹر فہیم یکایک سنجیدہ ہو گیا۔

"ہاں تم بالکل ٹھیک سمجھے میری پریشانی کی وجہ بھی ایک مریض ہی ہے، ایک معصوم مریض، بھول جیسا!" ڈاکٹر سعید نے فہیم کا کندھا چھوڑتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز دُور کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے لہجے میں بے پناہ افسردگی تھی۔ "معصوم مریض؟.... وہ کون ہے؟" فہیم نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک ہے بچہ، ٹریفک کے حادثے میں بے حد زخمی ہو کر آیا ہے اس کی حالت بڑی خطرناک ہے۔ اللہ نہ کرے وہ کسی وقت بھی ...."

"ایسا نہ کہو، کیا تم بھی اس کیس پر دسترس نہیں رکھتے!" ڈاکٹر فہیم نے گھبرا کر جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"دسترس! دسترس تو ہر کام پر اللہ ہی رکھتا ہے،

میں تو کوشش کرتا ہوں اور کوشش سے ہی مجھے پتا چلا کہ حادثے کے دوران اس بچے کا کافی خون ضائع ہو چکا ہے۔ کوئی سنگ دل ویگن ڈرائیور اس معصوم کو سڑک کراس کرتے ہوئے کچل کر فرار ہو گیا۔ کئی گھنٹے یہ خون میں لت پت سڑک پر پڑا رہا مگر راہ گیر اپنی گواہی کے خوف سے اس معصوم کو تڑپتا سسکتا دیکھ کر بھی نہ رُکے۔ کسی سے اتنا نہ ہو سکا کہ اسے ہسپتال پہنچا دے، آخر دو راہ گیر اجنبی نوجوانوں نے فرشتہ بن کر اُس کی مدد کی اور اسے ہسپتال لے آئے۔ مجھے یہ تمام باتیں ان ہی نوجوانوں نے بتائی ہیں۔" ڈاکٹر سعید نے دکھ سے کہا۔

"اوہ نو! نو.... تو تم نے اس بچے کے والدین اور گھر والوں کو اطلاع کر دی؟" ڈاکٹر فہیم نے جلدی سے پوچھا اور اپنی جھلے کی آدھی پیالی میز پر واپس رکھ دی۔

"ہاں اسی بچے کے اسکول بیگ سے اس کا اسکول کارڈ ملا۔ اس سے گھر کا پتا اور ٹیلے فون نمبر معلوم ہوا ہے۔ اسکول کا نام بھی اس کی کاپیوں سے معلوم ہو گیا ہے۔ شہر کا بہترین اسکول ہے وہ۔ میں نے خود اس کے گھر فون کیا تھا۔ بس اس کے گھر والے آنے ہی والے ہوں گے۔" ڈاکٹر سعید نے کہا اور ایک گہری سانس بھرتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

"تو کیا وہ اسکول سے آ رہا تھا؟"

"ہاں اسکول ہی سے آ رہا تھا۔ ابھی تک وہ بے

ہوش ہے.... ہوش میں آنے پر صحیح صورتِ حال کا اندازہ ہو سکے گا، مگر اسے بروقت خون کی اشد ضرورت ہے۔ قسمت سے اس کے گروپ کا خون ایمبولینس میں تو کیا پورے ہسپتال میں بھی موجود نہیں ہے۔ میرا بلڈ گروپ بھی دوسرا ہے اور تمھارا بھی۔"

"اوہ نو تو پھر اب کیا ہو گا؟" فہیم نہایت پریشان دکھائی دینے لگا۔ اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار گہرے ہو گئے۔ "سنگ دل بے رحم ڈرائیور اپنی غفلت کے باعث نہ جانے کتنے پھول روندتے ہیں یہ۔ بے حس انسان!" غصّے سے اس نے اپنی مٹھی میز پر ماری جس سے پیالیاں جھنجھنا اُٹھیں۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نرس گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی ڈاکٹر سعید اُچھل پڑا۔

"سر، جلدی چلیے، ایمرجنسی ہو گئی ہے۔ اس بچے کے والدین بھی آ چکے ہیں، مگر خون کا ابھی تک بندوبست نہیں ہو سکا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس بچے کی حالت بھی بگڑتی جا رہی ہے۔" نرس نے اٹکتے اور رُکتے لہجے اور پریشان بدحواس سانسوں کے درمیان بہ مشکل اپنی بات پوری کی۔ نرس کی بات سنتے ہی سعید تیزی سے اُٹھا، میز پر رکھا اپنا فرسٹ ایڈ کا بکس اُٹھایا اور جلدی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ڈاکٹر فہیم اور نرس بھی تھے۔

لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ڈاکٹر سعید جلدی جلدی

چلتا ہوا ایمرجنسی وارڈ میں آ گیا۔ وارڈ میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر بچّے کے ماں باپ پر پڑ گئی۔ بچّے کی ماں نے روتے روتے اپنی آنکھیں سرخ کر لی تھیں اور باپ کے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ جلدی سے بیڈ کے قریب چلا آیا۔ بچّے کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکن محسوس کی۔ آنکھوں کے پپوٹے دیکھے۔

"جلد از جلد خون کا انتظام کریں کیس ہمارے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔" ڈاکٹر سعید نے بے چارگی کے عالم میں قریب کھڑے بچّے کے والد سے کہا۔

"میں مجبور ہوں ڈاکٹر کہیں سے بھی اس گروپ کے خون کا بندوبست نہیں ہو سکا ہے۔" باپ نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے اور بے ساختہ پیچھے مُڑ گیا۔

"سر، وہ آدمی ابھی تک نہیں آئے جنھیں خون کی تلاش میں روانہ کیا گیا تھا۔" نرس نے بوکھلائی ہوئی آواز میں بچّے کی بگڑتی ہوئی حالت اور اس کی ماں کی بے چینی دیکھتے ہوئے کہا، "اف خون کا گروپ... خون کی اشد ضرورت۔" ڈاکٹر سعید بڑبڑانے لگا۔

اس نے ایک نظر بے ہوش بچّے پر ڈالی جس کا موت سے فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا جا رہا تھا اور پھر ایک نظر اس کے پریشان ماں باپ پر ڈالی جن کے چہرے کملا گئے تھے۔ ڈاکٹر فہیم بے چارگی کے عالم میں اس سارے منظر کو دیکھ رہا تھا۔

"سر جلدی کیجیے۔" اچانک ایک آواز پر سب چونک اُٹھے۔ سب نے مُڑ کر دیکھا یہ جملہ ادا کرنے والی ایک نرس تھی۔ "کیا بات ہے سسٹر رئیسہ؟" ڈاکٹر سعید نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سر، مانا کہ میں بہت کم زور ہوں، مگر میرے خون میں اتنی طاقت ہے کہ یہ ایک معصوم پھول کو تر و تازہ رکھ سکے، خوش قسمتی سے میرے خون کا گروپ بھی یہی ہے۔ سر، جلدی کیجیے، وقت ضائع نہ کریں۔ اس بچّے کو مرنے سے بچا لیں۔" سسٹر رئیسہ نے جلدی سے اپنا بازو ڈاکٹر سعید کے سامنے کر دیا۔

"مگر تم .... تم ....." ڈاکٹر سعید نے کچھ کہنا چاہا مگر رئیسہ کے چہرے پر موجود جذبے نے جیسے اس کی زبان کو تالے لگا دیے۔ جلدی سے سرنج نکال کر اس نے ایک نظر بچّے کے والدین کے پژمردہ چہروں پر ڈالی جن پر سے غم کے بادل چھٹتے جا رہے تھے اور وہ تشکّر آمیز نگاہوں سے رئیسہ کو دیکھ رہے تھے۔ وارڈ میں آس پاس کے مریض بھی سسٹر رئیسہ کو تعریف بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ دوسرے ہی لمحے سرنج سسٹر رئیسہ کے بازو میں اُتر چکی تھی۔ ایک ہلکی سی سسکی اس کے منھ سے نکلی اور پھر دو موتی اس کی آنکھوں سے ٹوٹ کر بے ہوش بچّے کے چہرے پر جا گرے۔

بڑی بی

سیما ناز، کراچی

جیسے ہی اسکول کی گھنٹی بجی سب بچے اپنے بیگ سنبھالتے ہوئے گیٹ سے نکلنے لگے۔ احسن بھی اپنے دوستوں کے ساتھ باہر نکلا اور سڑک پار کی، لیکن آج سڑک کے کنارے درخت کے پاس کوئی نہیں تھا۔ احسن بہت حیران ہوا کہ آج بڑی بی کیوں موجود نہیں ہیں۔ احسن کو سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اس کے تمام دوست گھروں کی جانب روانہ ہو چکے تھے اور اسکول خالی ہو چکا تھا، مگر وہ اسی درخت کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں دائیں جانب مڑتی ہوئی گلی پر لگی تھیں، لیکن بڑی بی کا کوئی پتا نہیں تھا۔ ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ اُسے ڈر ہوا کہ کہیں ابّو اُسے ڈانٹیں نہیں۔ وہ مایوس ہو کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا، لیکن اس ارادے کے ساتھ کہ وہ کل ضرور بڑی بی سے ملے گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

گھر میں داخل ہوا تو سب کو پریشان پایا۔ خیر امّی جان کو بہانہ بنا کر مطمئن کر دیا۔

دوسرے دن بھی بڑی بی موجود نہیں تھیں اسکول کی کب کی چھٹی ہو چکی تھی۔ تمام لڑکے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے، لیکن احسن ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ اس نے بستہ گلے سے اُتارا اور سڑک کے کنارے اُگے ہوئے درخت کے ایک سائے میں بیٹھ گیا۔

بڑی بی کون تھیں احسن ان کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ دائیں جانب مڑتی ہوئی گلی کے کسی مکان میں ملازم تھیں اور اس کا ایک بیٹے کے سوا کوئی نہیں تھا جو مر چکا تھا۔ جب وہ اسکول سے نکل کر درخت کے پاس پہنچتا تو بڑی بی اس کے انتظار میں وہاں کھڑی ہوتیں اور احسن کو دیکھ کر ان کے جھریوں بھرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ احسن بڑی بی کا ہاتھ پکڑ کر ان کو سڑک پار کرا دیتا تھا اور جب وہ گھر کی جانب روانہ ہوتا تو وہ اس کو ڈھیروں دعائیں دیتی تھیں پرسوں جب وہ میچ دیکھنے میں مصروف ہو گیا تھا تو اس کے ابّو انتظار کرنے کے بعد خود اسے لینے پہنچ گئے، جس کی وجہ سے وہ بڑی بی سے نہیں مل سکا اور آج بھی اسے دیر ہو چکی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو دو گھنٹے گزر چکے تھے اور اس کا دل بڑی بی سے ملے بغیر جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر گلی کی جانب دیکھا۔ ایک لڑکا گزر رہا تھا۔ احسن گلی کی طرف بڑھنے لگا۔

"ٹھہرو دوست! کیا تم نے بڑی بی کو دیکھا ہے؟ جو اس گلی کے کسی مکان میں ملازم تھیں۔" احسن نے جلدی جلدی حلیہ بتایا تو وہ کہنے لگا:

ہاں! وہ ہمارے ہی گھر میں ملازم تھیں، لیکن۔

یہ کہتے ہوئے وہ رُک گیا۔

"کیا ہوا انھیں؟" احسن نے بے تابی سے پوچھا۔

"انھیں ہر روز ایک لڑکا سڑک پار کراتا تھا، لیکن پرسوں انتظار کے باوجود وہ نہ آیا اور جب بڑی بی سڑک پار کرنے لگیں تو... ایک کار کی زد میں آکر شدید زخمی ہوگئیں۔ اب بے چاری ہسپتال میں ہیں۔"

"دوست! میں ہی وہ لڑکا ہوں۔ کیا تم مجھے ہسپتال کا پتا بتا سکتے ہو؟"

"ضرور۔" یہ کہتے ہوئے لڑکے نے احسن کو ہسپتال کا پتا اور وارڈ نمبر بتا دیا۔ احسن جلدی سے ہسپتال کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں وہ بڑی بی کی سلامتی کی دعائیں مانگتا رہا۔ جب وہ ہسپتال پہنچا تو اسے پتا چلا کہ بڑی بی کی حالت خطرناک ہے اور انھیں خون کی بہت ضرورت ہے۔ اس نے ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود اپنا خون دینے پر اصرار کیا۔ چناں چہ احسن کا خون لے لیا گیا۔

خون لینے کے بعد ڈاکٹر نے ایک پرچی پر دوائیں لکھنے کے بعد اس کو دیتے ہوئے کہا:

"اچھے بچے! بڑی بی کی حالت اب ٹھیک ہے، لیکن ان کی جان بچانے کے لیے ان دواؤں کی بہت ضرورت ہے۔ تم ان کا بندوبست کر دو، کیوں کہ یہ دوائیں ہسپتال میں موجود نہیں ہیں۔" احسن پرچی لے کر باہر آگیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اتنے رُپے کہاں سے آئیں گے؟ وہ یہ سوچتے ہوئے آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ شام کا اندھیرا ابھی پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو چھے بجنے والے تھے۔ اچانک کچھ سوچ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ ایک دُکان کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ گھڑیوں کی دُکان تھی۔

"مجھے یہ گھڑی بیچنی ہے۔" احسن نے گھڑی کلائی سے اُتارتے ہوئے کہا۔ دُکان دار نے ایک نظر احسن پر ڈالی اور کہا، کیا گھر سے بھاگ کر آرہے ہو؟"

"نہیں، یہ بات نہیں.... مجھے ایک مریض کی جان بچانے کے لیے رُپوں کی سخت ضرورت ہے۔ براہِ مہربانی جلدی کیجیے۔"

دُکان دار نے قیمت ادا کردی وہ تیزی سے میڈیکل اسٹور کی طرف بھاگا۔ جب وہ دوائیں لے کر ہسپتال میں داخل ہوا تو اس کا دل خوشی سے کھلا جارہا تھا۔ ڈاکٹروں نے فوری طور پر مریضہ کو دوائیں دیں۔ بڑی بی ابھی تک بے ہوش تھیں اور احسن دل ہی دل میں خوب دعائیں مانگ رہا تھا۔ آخر کافی دیر بعد بڑی بی کو ہوش آگیا اور بڑی بی نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ احسن کا خوشی کے مارے بُرا حال تھا۔ بڑی بی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی اور احسن کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا فرض پورا ہوگیا۔ احسن ان کے پاس بیٹھا ہوا باتیں کرتا رہا۔ "خالہ! آپ جلدی اچھی ہو جائیں گی۔" بڑی بی مسکرا دیں۔ جب رات بہت زیادہ ہوگئی تو احسن پھر آنے کا کہہ

کمرہ وارڈ سے باہر چلا آیا۔

ہر طرف گہری تاریکیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ احسن نے وقت دیکھنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا، لیکن گھڑی نہ پا کر ہاتھ نیچے کر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ آج اسے سخت سزا ملے گی، کیوں کہ وہ دیر سے گھر جا رہا تھا۔ دوسرے اس نے گھڑی بیچ دی تھی، لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ تھی اور اس کا دل پُرسکون تھا اور ذہنی طور پر اپنے آپ کو مطمئن اور خوش محسوس کر رہا تھا۔ اسے زندگی میں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے سر پر کوئی قرض تھا جو اس نے اُتار دیا۔

اچھا دیس

مرسلہ: شوکت علی، اورنگی

کالی کالی اس کی گھٹائیں
پیاری پیاری اس کی فضائیں
ٹھنڈی ٹھنڈی اس کی ہوائیں
بانکی بانکی اس کی ادائیں

سب سے اچھا دیس ہمارا
سب سے پیارا دیس ہمارا

صبح کا منظر پیارا پیارا
شب کا چندا سر پہ پیارا
سورج جیسے لال انگارا
موتی ہیرا ایک اِک تارا

سب سے اچھا دیس ہمارا
سب سے پیارا دیس ہمارا

آؤ دیس پہ تن من واریں
دیس کے ہر طبقے کو اُبھاریں
دیس کی حالت دل سے سُدھاریں
پھر ہم سب مل کر پکاریں

سب سے اچھا دیس ہمارا
سب سے پیارا دیس ہمارا

ہمدرد نونہال، ستمبر ۱۹۸۶ء

حکیم محمد سعید ایک طالبِ علم کی نظر میں

محمد شبیر الوان، کراچی

محترم حکیم محمد سعید سے میری پہلی ملاقات ایک شام ہمدرد کراچی میں ہوئی تو میں نے یہ محسوس کیا کہ واقعی ایک حکیم الامت ہم میں آج بھی موجود ہیں جو صرف اپنی عظیم حکمت کی وجہ سے ہی مشہور نہیں ہیں بلکہ بے شمار خوبیوں، صلاحیتوں، دانائیوں، حکمتوں کے مالک بھی ہیں۔ حکیم محمد سعید صاحب ایک طرف تو علم کی روشنی سے لوگوں کے دلوں کو منور کرتے ہیں اور اخلاق، امن، محبت، بھائی چارہ اور نظم و ضبط کا پیغام دیتے ہیں دوسری طرف اپنی حکمت سے لوگوں کو فیض پہنچاتے ہیں۔ حکیم محمد سعید صاحب ایک ادیب بھی ہیں۔ آپ کے مضامین مختلف رسائل و جرائد اور کتابوں کی شکل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حکیم محمد سعید صاحب سیاحت کے بے تاج بادشاہ

ہیں ۔ ملک ملک کی سیاحت کر چکے ہیں ۔ مختلف ممالک میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کا بھی شرف حاصل ہوا ہے ۔

حکیم صاحب ایک ملن سار، خوش گفتار اور ہمدرد انسان ہیں ۔ قول و فعل کے سچّے اور کامل پختہ یقین رکھنے والے انسان ہیں ۔ اسلام کی عظمت ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔ حکیم صاحب کا پیغام ہے: اسلام سے محبّت، پاکستان سے محبّت اور پاکستان کی تعمیر ۔ یہی محبّت اور سچائی ہر ایک کے دل میں پیدا ہو تو پاکستان ایک صحیح اسلامی مملکت بن سکتا ہے ۔ آپ کی دانش ورانہ گفت گو، نرم مزاجی اور بلند اخلاق ہر سخت دل انسان کو موم کر دیتی ہے ۔ سفید کُرتا پاجامہ اور سفید شیروانی حکیم صاحب کا پسندیدہ لباس ہے ۔ جلے پینے کے بالکل شوقین نہیں ہیں ۔ جس محفل میں حکیم صاحب کی قد آور شخصیت موجود ہو وہاں لوگ ارد گرد دائرہ بنا کر آپ کی اچھی اچھی باتیں توجہ سے سنتے ہیں ۔

حکیم محمد سعید صاحب نے بزم نونہال کا سلسلہ شروع کر کے پوری قوم پر ایک بڑا احسان کیا ہے ۔ بچّوں کی تعلیم و تربیت ایک مشکل کام ہے، لیکن حکیم صاحب نے یہ کام بھی اپنے ذمّے لیا ہے ۔ بچّوں کو ذہنی و علمی تربیت دے کر پاکستان سے محبّت اور پاکستان کی تعمیر کے لیے تیار کرتے ہیں ۔ آپ کا مشن یہ ہے کہ پاکستان ایک طاقت ور اور مضبوط ملک بن جائے اور ہر آدمی پاکستان سے محبّت اور اس کی تعمیر میں حصّہ لے، کیوں کہ یہ ملک بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا ہے ۔ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ ہو جس کے لیے یہ ملک وجود میں آیا ہے ۔

شامِ ہمدرد راول پنڈی، پشاور، لاہور اور کراچی میں منعقد کر کے لوگوں کو ارشاداتِ نبویؐ، علم کی محبّت اور جذبہ حب الوطنی کا درس دیتے ہیں ۔ یہی حکیم صاحب کا مقصدِ حیات ہے ۔ حکیم صاحب کا ہر کام قوم کے نام ہے ۔ سب کچھ قوم کو وقف کر چکے ہیں ۔ آپ کی وَلولہ انگیز تقریر، فکر انگیز مقالات قوموں اور نسلوں کے لیے خضرِ راہ کا کام دیتے ہیں ۔

آپ نے نو سال کی عمر میں قرآنِ پاک حفظ کر لیا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا حافظہ بہت تیز ہے ۔ غرض حکیم صاحب سیّاح، صحافی، دانش ور، طبیب اور ایک ہمدرد دوست بھی ہیں ۔ کراچی کو آپ نے یہ شرف بھی بخشا ہے کہ یہاں مدینۃ الحکمت کی بنیاد ڈالی ۔ یہ آپ کی محنت اور لگن اور کاوشوں کا نتیجہ ہے ۔ یہاں سے علم کے روشن چراغ پھوٹیں گے ۔ ہر دور، ہر زمانہ اور ہر قوم کے لیے مدینۃ الحکمت اور مدینۃ العلم کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس ضرورت کو آپ نے پورا کر دکھایا ہے ۔ پاکستانی قوم کے لیے حکیم صاحب کی ذات سرمایۂ افتخار ہے ۔ آپ پاکستان کی غیر متنازعہ شخصیت ہیں ۔ میری دعا ہے کہ پوری قوم آپ کے نقشِ قدم پر چلے ۔

ماں

مرسلہ: غلام جیلانی، کراچی

■ جنّت ماں کے قدموں تلے ہے۔ (حضور اکرمؐ)

■ ماں کے بغیر گھر قبرستان لگتا ہے۔ (اورنگ زیب عالمگیر)

■ دنیا کی سب سے بہترین شے ماں اور صرف ماں ہے۔ (مولانا محمد علی جوہر)

■ سخت سے سخت دل کو ماں کی پرنم آنکھوں سے موم کیا جا سکتا ہے۔ (علامہ اقبال)

■ ماں اور پھول میں مجھے کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ (نادر شاہ)

■ ماں باپ سے زیادہ شفیق ہوتی ہے۔ (افلاطون)

■ ماں کا غصّہ وقتی ہوتا ہے۔ (ورڈزورتھ)

■ دنیا کا کوئی رشتہ ماں سے زیادہ پیارا نہیں۔ (شیلے)

■ ماں کا پیار کسی کو بتانے اور سکھانے کا نہیں۔ (لقمان)

■ اگر مجھ سے ماں کو چھین لیا جائے تو میں پاگل ہو جاؤں۔ (فردوسی)

■ آسمان کا سب سے بہترین تحفہ ماں ہے۔ (ملٹن)

■ ماں کا پیار سب سے بہترین اور خوب صورت ہے۔ (چارلس ڈکنز)

■ میری عمر ۵۰ سال ہو چکی ہے، مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میری ماں میرے گھر آنے سے پہلے سو چکی ہو۔ (وہیٹ مین)

■ اس بات سے ہمیشہ بچو کہ ماں نفرت کرے یا بد دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ (بو علی سینا)

■ بچّے کے لیے سب سے اچھی جگہ ماں کا دل ہے خواہ بچّے کی عمر کتنی ہی ہو چکی ہو۔ (شیکسپیر)

قیمتی دولت

عابد محمد خاں عابد، کراچی

وقت سب سے قیمتی دولت ہے، جو ایک عقل مند انسان کی طرح ہر گھڑی اور ہر لحظہ سرگرم ہے۔

اس کے پائے ہمّت کبھی نہیں ڈگمگاتے۔ وہ کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا! اس دنیا کے دکھ سکھ اسے روک نہیں سکتے۔ وہ سدا ایک رفتار پر چلا جا رہا ہے۔

وہ ہمیشہ ہوا کے دوش پر سوار ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کی رفتار کو نہیں روک سکتی۔ وقت ایسا حاکم ہے جو تمام تبدیلیوں اور تمام انقلابات کا ذمّے دار ہے۔ وقت بلند و بالا عمارتوں کو کھنڈرات

اور بڑی بڑی بستیوں کو ویرانوں میں تبدیل کر دیتا ہے اور اُجڑے ہوئے گل زاروں کو ہرا بھرا کر دیتا ہے۔

انسان اس دنیا میں بے کار پیدا نہیں ہوا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اس پر کچھ فرائض عائد کر رکھے ہیں۔ اس کے کرنے کے ہزارہا کام ہیں اور وہ کام اس قدر زیادہ ہیں کہ ایک عمر تو کیا سیکڑوں عمریں ہوں پھر بھی وہ تمام کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ علوم و فنون کا سیکھنا، ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا، کسبِ معاش، اہلِ عیال کی دیکھ بھال، بچوں کی پرورش، خدمتِ خلق، عبادت و ریاضت ان میں سے ہر ایک کے لیے وقت درکار ہے، لیکن جو لوگ وقت کی قدر کرتے ہیں وہ اس مختصر سی زندگی میں کارہائے نمایاں کر جاتے ہیں کہ صفحۂ روزگار پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کا نام زندہ رہ جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب دنیا والے خوابِ شیریں کے مزے لیتے ہیں، یہ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے وقت کی اہمیت کو پہچانا اور وقت کی قدر کرتے ہوئے انتہائی محنت کی اور پھر ایسا عروج حاصل کیا کہ قوموں کی تاریخ بدل دی۔ وہ صاحبِ حکومت اور صاحبِ علم تھے اور انھوں نے ایسا مرتبہ حاصل کیا کہ ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ حرفِ آخر سمجھا گیا اور انھوں نے خوب نام کمایا۔

لیکن جن لوگوں نے وقت کی قدر نہیں کی زمانے نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا، حکومت ان سے منھ موڑ گئی وہ خس و خاشاک کی طرح زندگی کے دریا میں بہتے رہے اور انھیں آخری دم تک کوئی کنارہ نصیب نہیں ہوا۔ وہ بے نام و نشان زمین کی پیٹھ کا بوجھ بنے رہے اور بے یار و مددگار مر گئے۔ ہم محنت سے مال و دولت جمع کر سکتے ہیں۔ خوراک، دوا، پرہیز اور ورزش سے بگڑی ہوئی صحت بحال کر سکتے ہیں، لیکن اپنے تمام زور، فہم و فراست، اثر و رسوخ اور امارت کے باوجود گزرے ہوئے وقت کا ایک لمحہ اور بیتی ہوئی ایک گھڑی کسی قیمت پر واپس نہیں لا سکتے، اس لیے عقل مند انسان وہی ہے جو وقت کی قدر و قیمت کو سمجھے اور کوئی لمحہ بے کار نہ گزارے۔

انسان بے کار رہنے کے لیے نہیں بنایا گیا۔ خود فطرت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی کام کرتا رہے۔ عقل مند انسان مفید اور سود مند کاموں میں مشغول و مصروف رہتے ہیں اور وہ کام یاب زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس بے کار آدمی کا دماغ شیطان کا کارخانہ ہے۔ جب بھی کوئی بے کار بیٹھے گا اور وقت کی آواز کو رائیگاں گنوائے گا تو اس کے دل میں بُرے بُرے خیالات جنم لیں گے۔ جس سے اس کی طبیعت گناہ اور بدی کی طرف مائل ہو گی۔ لیکن جو لوگ وقت کو ضائع نہیں کرتے اور کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں، وہ اکثر گناہوں اور برائیوں سے

ہمدرد نونہال، ستمبر ۱۹۸۶ء

بچے رہتے ہیں۔

طالب علمی کا زمانہ عمر کا اہم ترین حصّہ ہوتا ہے۔ یہ وہ بیش بہا زمانہ ہے جس میں طالب علم علوم و فنون سیکھتا ہے۔ ذہنی طور پر ترقی کرتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں تمام دنیاوی اور دینی فلاح و بہبود کی بنیاد پڑتی ہے۔ سمجھ دار طالب علم اپنے وقت کا بیش تر حصّہ اسی مقصد کے حصول کے لیے صرف کرتا ہے۔ پابندیِ وقت کامیابی کی کنجی ہے۔

وقت کی قدر کرنے والا طالب علم صبح سویرے اُٹھتا ہے اور اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ اس وقت دماغ تر و تازہ ہوتا ہے۔ طبیعت شگفتہ اور جسم چُست ہوتا ہے۔ اسی لیے گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہو جاتا ہے، لیکن وقت کو برباد کرنے والے دن چڑھے تک سوئے رہتے ہیں اور جب ناکام ہوتے ہیں تو پھر اپنی قسمت کو کوستے اور نصیبوں کو پیٹتے ہیں، اس لیے ہمیں چاہیے کہ طالب علمی کے زمانے ہی سے وقت کی قدر کو جانیں تاکہ ایک اچھے انسان اور اچھے شہری کہلائے جا سکیں۔

نکّمے کا خواب

جناب سید نظیر زیدی کی نظم

مرسلہ: رضوانہ فیروز، راول پنڈی

کل میں نے خواب دیکھا
اور لاجواب دیکھا
ہمدرد نونہال، ستمبر ۱۹۸۶ء

دیکھا کہ ایک پری نے
حلوہ مجھے کھلایا
نہلا دُھلا کے اس نے
پھر تاج سر پہ رکھا
یہ تاج کیا تھا سر پر
میں نے گلاب دیکھا
کل میں نے خواب دیکھا
اور لاجواب دیکھا

بعد اس کے میں نے دیکھا
پریاں بہت سی آئیں
اور ایک بڑا سا بستہ
وہ اپنے ساتھ لائیں
گھبرا گیا میں کہتا
جب یہ عذاب دیکھا
کل میں نے خواب دیکھا
اور لاجواب دیکھا

جاگا جو میں زمیں پر
اوندھا پڑا ہوا تھا
میرا بڑا سا بستہ
مجھ پر گرا ہوا تھا
اب سوچ لیں کہ کیا کچھ
میں نے جناب دیکھا
کل میں نے خواب دیکھا
اور لاجواب دیکھا

شاہی باورچی

عظمیٰ احمد، فیصل آباد

کہتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر تختِ شاہی پر بیٹھنے کے بعد بھی نہایت سادہ اور محتاط زندگی بسر کرتا تھا۔ بادشاہ کے ذاتی باورچی کی خدمت ظاہر ہے کہ بہت عزت اور شہرت کی چیز سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے بڑے بڑے ہنرمند باورچی بے حد شوق اور آرزو سے یہ خدمت خاص حاصل کرتے تھے، مگر بعد میں یہ حقیقت کھل جاتی تھی کہ بنی ہوئی کھچڑی یا معمولی روٹی دونوں وقت پکتی ہے اور تمام کی تمام بادشاہ سلامت کے سامنے دسترخوان پر چلی جاتی ہے۔ دسترخوان سے صاف رکابی واپس آجاتی ہے یعنی باورچی کو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کچھ نہیں ملتا اور خشک تنخواہ پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح باورچی چند روز میں ہی عاجز آکر ملازمت چھوڑ دیتے تھے۔

بار بار کے استعفوں سے تنگ آکر بادشاہ نے ایک نئے باورچی سے یہ معاہدہ کیا کہ کم از کم ایک برس تک تم کو ملازمت کرنی پڑے گی اور اس عرصے میں استعفا قبول نہ ہوگا۔ ناواقف باورچی نے بڑی خوشی سے یہ معاہدہ کر لیا، مگر جلد ہی اس پر بھی حقیقت کھل گئی۔ اب یہ باورچی مصیبت میں پڑ گیا۔ نہ گزر ہوتی تھی اور نہ استعفا دے سکتا تھا۔ ناچار تنگ آکر اس نے سوچا کہ بادشاہ کو اس قدر ناراض کرنا چاہیے کہ وہ خود ہی نکال دے لہٰذا اس نے ایک دن کھچڑی میں برابر کا

ہمدرد نونہال، ستمبر ۱۹۸۶ء

نمک جھونک دیا۔ بادشاہ نے کھچڑی کھالی اور باورچی کو کچھ نہ کہا۔ باورچی نے مایوس ہو کر اگلے دن بالکل نمک نہ ڈالا اور پھیکی کھچڑی پکائی۔ بادشاہ نے اس دن بھی کچھ نہ فرمایا۔ تیسرے روز باورچی نے صحیح مقدار میں نمک ڈالا۔ بادشاہ نے اس دن باورچی کو نظر اُٹھا کر دیکھا اور بڑے تحمل سے فرمایا، "میاں، ایک ڈھنگ اختیار کرو۔ بار بار نمک کی مقدار بدلنے کی تکلیف مت اُٹھاؤ۔"

باورچی ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔ حکم ہوا، کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔ باورچی نے عرض کیا، جہاں پناہ! میں سات لڑکیوں کا باپ ہوں۔ شاہی باورچی کہلاتا ہوں۔ لوگوں کو مجھ سے بڑی توقعات ہیں اور میری حالت ہے کہ فاقوں مرتا ہوں۔ میں نے یہ سمجھ کر ملازمت کی تھی کہ جہاں پناہ کی ذاتی خدمت بجا لا کر کچھ عرصے میں مال دار بن جاؤں گا۔ مگر اب تو سال بھر تک فاقہ ہی نظر آتا ہے۔ بہ تصدقِ فرقِ مبارک خادم کو آزاد فرمایا جائے۔ بادشاہ نے فرمایا، آزادی کی خواہش ہے یا رُپے کی ضرورت ہے؟ عرض کیا، "رُپے کی زیادہ ضرورت ہے۔" فرمایا، "اچھا آج آدھ پاؤ کھچڑی زیادہ پکا لینا۔" باورچی کچھ نہ سمجھا اور آدھ پاؤ کھچڑی زیادہ پکا لی۔ بادشاہ نے اپنے حصّے کی کھچڑی کھانے کے بعد باقی ماندہ زائد کھچڑی کے سات حصّے کیے اور ایک ایک تشتری میں ایک ایک حصّہ رکھ کر باورچی کو حکم دیا کہ خوان میں

لگا کر ہمارے ساتوں وزیروں کو ہمارا یہ خاصہ پہنچا دو۔

چوں کہ آج تک ایسا تحفہ وزیروں کو نہ ملا تھا اس غیر معمولی شاہی التفات کی خبر لگی تو ان کی خوشیوں کی کوئی انتہا نہ رہی۔ شاہی باورچی کا بڑے تپاک سے ساتوں وزیروں کی ڈیوڑھیوں پر استقبال ہوا اور شاہی خاصہ لانے کے صلے میں ہر وزیر نے باورچی کو معقول رقم انعام میں دی۔

باورچی یہ رقم اور کافی ساز و سامان کمانے کے بعد بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے کہا، "کہو گزارے کی کوئی صورت نکل آئی؟" باورچی نے دست بستہ عرض کی کہ حضور کی توجہ کی بہ دولت اب عمر بھر کے لیے بے فکری ہو گئی ہے۔ اب کوئی حاجت باقی نہیں۔ بادشاہ نے فرمایا، "آئندہ کھچڑی میں نمک صحیح اندازے سے ڈالنا۔"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ واقعہ تحقیق پر پورا نہیں اترتا۔ یہ واقعہ اورنگ زیب عالمگیر کا نہ سہی، لیکن ہے دل چسپ اور سبق آموز۔ بہت سے مسلمان بادشاہوں کی سادگی اور کفایت شعاری کے اس قسم کے واقعات تاریخ میں ملتے ہیں۔

خوشحال خاں خٹک

فضل ربّی راہی، مینگورہ

خوشحال خاں خٹک پشتو زبان کے مشہور شاعر

ہمدرد نونہال، ستمبر ۱۹۸۶ء

تھے۔ وہ ۱۰۲۲ھ میں ضلع پشاور میں نوشہرہ کے قریب اکوڑہ خٹک کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے، جس کے ایک طرف دریا اور دوسری طرف پہاڑ ہیں۔ انھوں نے آزاد فضا میں پرورش پائی۔ آپ کے والد کا نام شہباز خاں تھا۔

خوشحال خاں کے والد خٹک قبیلے کے سردار تھے۔ خٹک افغانوں کا ایک مشہور قبیلہ ہے، جس کی آبادی دریائے اٹک کے پار سے شروع ہوتی ہے اور پشاور تک چلی جاتی ہے۔ مغل بادشاہ شاہ جہاں نے خوشحال خاں کے والد شہباز خاں کو اپنی طرف سے منصب دار مقرر کیا تھا۔ خوشحال خاں کو تیرہ سال کی عمر میں ان کے والد نے جنگ کے تمام گُر بتا دیے تھے۔ انھوں نے خوشحال خاں کو بچپن ہی میں اپنے ساتھ کئی جنگوں میں شریک کیا تھا۔ جہاں خوشحال خاں نے بڑی بہادری کے جوہر دکھائے۔

خوشحال خاں کی عمر جب ۲۸ برس کی ہوئی تو ان کے والد ایک جنگ میں مارے گئے۔ والد کی وفات کے بعد انھیں قبیلے کا سردار مقرر کیا گیا۔ خوشحال خاں جب خٹک قبیلے کے سردار بن گئے تو شاہ جہاں نے ان کے والد کا منصب انھیں پیش کر دیا۔ شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے بھی یہ منصب داری خوشحال خاں ہی کے پاس رہنے دی، لیکن کچھ عرصے

کے بعد اورنگ زیب کو لوگوں نے خوشحال خاں کے خلاف بھڑکا دیا اور اورنگ زیب نے انھیں زنگون کے ایک قلعہ میں قید کر دیا، جس کا خوشحال خاں کو بہت رنج ہوا اور چار سال بعد قید سے رہا ہونے کے بعد بھی ان کا دل مغل بادشاہ کی طرف سے صاف نہ ہوا۔

قید سے رہا ہونے کے بعد وہ ان قبیلوں کی رہنمائی اور سرپرستی کرنے لگے جو مغلوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ اپنوں کی غداری اور نفاق کی وجہ سے جب مقصد حاصل ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو وہ وطن چھوڑ کر آفریدیوں کے علاقے میں جا بسے اور باقی ماندہ زندگی لکھنے اور پڑھنے میں گزاری اور ۷۸ سال کی عمر میں ۱۱۰۰ھ میں وفات پائی۔

خوشحال خاں خٹک نہ صرف ایک بڑے شاعر اور ادیب تھے بلکہ ایک بہادر سپاہی بھی تھے۔ وہ ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ تاریخ میں قلم اور تلوار کے دھنی کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ عربی و فارسی اور اسلامی علوم کے عالم تھے اور تصوف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ساتھ ہی وہ طب میں بھی مہارت رکھتے تھے، لیکن ان کی اصل شہرت شاعری کی وجہ سے ہے۔ وہ عام شاعروں کی طرح محض گفتار کے غازی نہ تھے۔ وہ اپنے شعروں کے ذریعہ سے حق باتوں کی تلقین کرتے تھے خود اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ ان کی شاعری اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور صفاتِ رسولؐ کے بیان کے لیے بھی مشہور ہے۔ خوشحال خاں خٹک پشتو شاعری میں اپنا ایک اسلوب رکھتے تھے۔ ان کی شاعری اتنی جامع اور وقیع ہے کہ ہم انھیں بلا تردد بڑا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ وہ شاعری میں کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے بلکہ خود نئے نئے موضوعات تلاش کرتے تھے۔ انھوں نے نظم و نثر کی تقریباً ڈھائی سو کتابیں لکھیں جن میں کلیاتِ خوشحال خاں، فضل نامہ، بازنامہ، دستار نامہ، صحت البدن اور رباعیات وغیرہ مشہور ہیں۔

ان کی شاعری میں بڑا اثر، جوش اور ولولہ ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں اتحاد اور آزادی کے سبق دیے ہیں۔ ان کا کلام عوام کو عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ جس طرح جرمنی کے باشندے گوئٹے پر اور ایران کے باشندے فردوسی پر فخر کرتے ہیں اسی طرح سرحد کے عوام بھی خوشحال خاں پر ناز کرتے ہیں۔ خوشحال خاں خٹک پشتو کے بڑے شاعر ہی نہ تھے بلکہ قوم کے سچے رہبر بھی تھے۔ انھوں نے کوہاٹ سے سوات اور بُنیر تک کے علاقوں کا سفر کر کے پٹھانوں کو متحد کرنے کی کوششیں کیں اور انھیں قومی غیرت دلا کر آزادی کی زندگی بسر کرنے پر اُبھارا۔

خوشحال خاں کا کلام بہت شائستہ، پاکیزہ اور واضح ہے۔ ان کے شعروں میں پٹھانوں کے لیے عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کا زبردست پیغام

موجود ہے۔ ان کا کلام پڑھ کر آج بھی عوام کی روحیں وجد میں آجاتی ہیں۔ مشرق اور مغرب کے علم دوست خوشحال کی شاعری کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کی نظموں کے ترجمے بھی کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ سرحد کے غیور عوام اُن کے کارناموں پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔

سچ

مرسلہ: این کے کرن کیانی، راولپنڈی

تم جب بھی لب کھولو بچّو
سچ کے لیے سب کھولو بچّو
ہر کان میں یہ رس گھولو بچو
جب بھی بولو سچ ہی بولو

وہ جو سچ کہتا ہے ہمیشہ
اُس پہ یقین رہتا ہے ہمیشہ
سچ موتی ہیں ان کو رولو
جب بھی بولو سچ ہی بولو

ہے جھوٹ تو کاغذ کی کشتی
آج نہیں تو کل ڈوبے گی
جھوٹ کی کشتی پر مت ڈولو
جب بھی بولو سچ ہی بولو

سچّی بات اثر کرتی ہے
فوراً دل میں گھر کرتی ہے
سچ سے ہر دِل کا در کھولو
جب بھی بولو سچ ہی بولو

پیارے بچّو! سوچو تم بھی
کرن کی یہ باتیں سچ کی
سچائی کی میزان میں تولو
جب بھی بولو سچ ہی بولو

سہیلی کی یاد

اللہ رکھی بٹ، کراچی

میری ہمدرد اور دوست علینہ! نہ جانے آج مجھے تمھاری یاد شدّت سے کیوں آرہی ہے۔ میں اور تم ہمیشہ ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔ تم امیر تھیں اور میں غریب، لیکن تم نے کبھی مجھے غریب ہونے کا احساس نہ ہونے دیا۔ تم ہمیشہ مجھے اپنی بہن کی طرح سمجھتی تھیں۔ تم میری مدد کرتی تھیں، لیکن مجھے احساس بھی نہ ہونے پاتا کہ تم میری مدد کر رہی ہو۔ تم ایک ہمدرد اور رحم دل انسان تھیں۔ ویسے تو تمھیں کسی سے بھی دشمنی نہ تھی، لیکن تم میری بہت گہری دوست تھیں۔ تمام اسکول میں ہم دونوں کی دوستی مشہور تھی۔ اسکول میں تمام لڑکیاں ہماری دوستی پر رشک کیا کرتی تھیں۔ جب کبھی کوئی لڑکی لڑتی تو اساتذہ ہماری مثال دیتے تھے۔

تم امیر تھیں، تمھارا کوئی بھائی نہ تھا، اس لیے تمھارے والدین نے تمھاری پرورش بالکل لڑکوں کی طرح کی تھی۔ تمھارے والدین نے تمھیں ہر وہ کام سکھایا تھا جو لڑکے کرتے ہیں۔ تم نے تیراکی بھی سیکھی تھی اور تمھیں تیراکی تھی بھی بہت پسند۔ تمھیں سیر تفریح کا بہت

شوق اور خاص کر سمندر کی موجوں سے کھیلنے کا تمھیں بہت شوق تھا۔ تم جب کبھی تفریح کرنے جاتیں تو مجھے بھی ساتھ لے جاتیں۔ وہ دن تو شاید میں زندگی بھر نہ بھلا سکوں گی جس دن میں اور تم دونوں تفریح کرنے کلفٹن گئی تھیں اور تھوڑی دیر گھاس پر آرام کرنے کے بعد ہم سمندر کے پانی سے اٹھکیلیاں کرنے لگیں۔

ابھی ہمیں سمندر کے پانی سے کھیلتے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ایک بچّے کی دل خراش چیخ نے وہاں موجود تمام لوگوں کو سہما دیا۔ ہم سے کچھ فاصلے پر چند لوگ کھڑے ایک بچّے کے ڈوبنے کا تماشا دیکھ رہے تھے اور اس بچّے کی ماں اپنے لختِ جگر کو ڈوبتا دیکھ کر شدّتِ جذبات اور اپنی ممتا کی وجہ سے اپنا کلیجہ پیٹ رہی تھی۔

میں اور تم جب وہاں پہنچے تو تم سے اس دکھی ماں کی بے تابی دیکھی نہ گئی، کیوں کہ تم ایک رحم دل انسان اور اچھی تیراک تھیں۔ تم نے میرے سمجھانے کے باوجود اپنے آپ کو سمندر کی بے رحم موجوں کے حوالے کر دیا اور پھر تم سمندر کی موجوں میں غائب ہو گئیں۔ میں نے تمھیں بہت سمجھایا کہ تم ایک لڑکی ہو اور لڑکی سمندر کی موجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی، مگر تم نہ مانیں۔ سارے لوگ حیرت سے ایک نازک سی لڑکی کی جرأت دیکھ رہے تھے اور میں تمھاری خیریت کی دعائیں کر رہی تھی اور جب کافی دیر کے بعد تم سمندر سے باہر نکلیں تو تمھارے سر سے خون بہ رہا تھا اور تمھارے ایک ہاتھ میں وہ ڈوبنے والا بچّہ تھا جس کا سانس ابھی باقی تھا۔ سمندر سے باہر آکر تم نے اس بچّے کو اس کی ماں کے حوالے کیا اور خود زمین پر گر گئیں۔ شاید تمھارا سر پتھر سے ٹکرا گیا تھا، جس کی وجہ سے تمھارے دماغ میں کافی چوٹ آئی تھی اور کافی مقدار میں خون بھی بہ گیا تھا اس وجہ سے تم بے ہوش ہو گئی تھیں۔

اس بچّے کو ہسپتال لے جایا گیا۔ وہ بچّہ تو بچ گیا، لیکن تم نہ بچ سکیں۔ تم بہت عظیم تھیں۔ عینی، تم نے اپنی جان دے کر ایک ماں کی گود بھر دی تھی۔ عینی، تم نے لڑکی ہو کر وہ کام کر دیا جو وہاں کھڑے ہوئے مرد نہ کر سکے تھے۔ تم نے اپنا نام اس دنیا میں ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ میں اور تم ایک دوسرے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے تھے۔ عینی، میری اچھی پیاری دوست، میری دعا ہے کہ اللہ تمھیں جنّت الفردوس میں جگہ دے۔

پیاری باتیں

مرسلہ: مسعود عالم برقی، کراچی

اِدھر آؤ بچّو! تمھیں یہ بتاؤں

کہ پڑھنے سے جی مت چرانا کبھی تم

برائی کی منزل کبھی راہ جائے
نہ اس رہ کی سمت جانا کبھی تم
خفا ہوں جسے سن کے امّی و ابّا
زباں تک نہ وہ بات لانا کبھی تم
جو حاصل ہو تم کو بزرگوں کی صحبت
کہیں اُٹھ کے ہرگز نہ جانا کبھی تم
سنو غور سے اور کرو کچھ عمل بھی
جو پڑھ لو نہ اس کو بھلانا کبھی تم
جو کہتے ہو منہ سے وہ کر کے دکھانا
نہ بے کار باتیں بنانا کبھی تم

احسان کا بدلہ

امیر علی امیر، کراچی

سردی کا موسم تھا اور سخت بارش ہو رہی تھی۔ ایک بھوکی سیہ سردی اور پانی سے بچنے کے لیے کسی جگہ کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ وہ ایک پرانے درخت کے تنے میں سوراخ دیکھ کر ٹھٹکی۔ اندر دیکھا تو ایک سانپ نظر آیا۔ سیہ نے گڑگڑا کر کہا، "بھائی سانپ، مجھے بڑی سخت سردی لگ رہی ہے اور مجھے بڑی زبردست بھوک بھی لگ رہی ہے۔ کیا آپ مجھے اپنے گھر میں جگہ دیں گے؟" سانپ کو اس کی حالت پر رحم آگیا۔ بولا، "آجاؤ۔" سیہ اندر چلی گئی اور آرام سے ایک طرف بیٹھ گئی۔ سانپ نے اسے کھانے کو بھی دیا۔ تھوڑی دیر بعد جب سیہ کے جسم میں گرمی آگئی تو وہ درخت کے کھوکھلے تنے میں اِدھر اُدھر پھرنے لگی۔ سیہ کے جسم پر کانٹے ہوتے ہیں۔ کانٹے سانپ کے بدن میں چبھے تو اسے بہت تکلیف ہوئی۔ وہ نرمی سے کہنے لگا، "سیہ بہن۔ بارش تھم گئی ہے۔ اب تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اس سوراخ میں ہم دونوں میں سے صرف ایک رہ سکتا ہے۔" سیہ نے جواب دیا، "مجھے یہ سوراخ بہت پسند ہے میں یہیں رہوں گی۔ تم چاہو تو شوق سے جا سکتے ہو۔" سانپ نے کہا، "اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا تو میں تمھیں اندر آنے ہی نہ دیتا۔" سیہ نے جواب دیا، "یہ تمھاری غلطی ہے۔ تمھیں چاہیے تھا کہ مجھے بُلانے سے پہلے میرے کانٹوں کو دیکھ لیتے۔" سچ ہے بے سوچے سمجھے کام کرنے سے ہمیشہ تکلیف ہوتی ہے۔

لوری

مرسلہ، اسما مستنصر، سنجول

دادای اماں کہتی ہیں
چاند پہ پریاں رہتی ہیں
جب سورج سو جاتا ہے
چاند نکل کر آتا ہے
سو سو پریاں مل مل کر
میٹھے گیت سناتی ہیں
بستر پر جو سوئے گی
دن کو ضرور وہ دیکھے گی
دادی اماں کہتی ہیں
چاند پہ پریاں رہتی ہیں

ننھے قارئین لکھتے ہیں

نونہالوں کی پسند، ناپسند، تجویزیں، شکایتیں، مشورے

✿ نونہال میں ایک کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس میں فرصت کے کھیل یا مشاغل پر کوئی مضامین نظر نہیں آتے مثلاً باغ بانی، مچھلیاں پکڑنا اور پالنا، ٹکٹ اور سکے وغیرہ جمع کرنا، فوٹو گرافی وغیرہ۔

عرفان الحق چاندنہ، کراچی

✿ سرورق بہت پسند آیا۔ جاگو جگاؤ اور پہلی بات بہت اچھا تھا کہانیاں اچھی تھیں۔ نجم السحر عابدی، کراچی

✿ مسکراتے رہو بہت ہی اچھا لگا۔ ثمینہ اسماعیل، کراچی

✿ جاگو جگاؤ اور خیال کے پھول کی تو میں جتنی تعریف کروں کم ہے۔ مینا ولی، راولپنڈی

✿ رسالہ صفحہ اوّل سے آخر تک ہی اچھا اور قابلِ تعریف تھا۔

محمد لطیف خاں شہزاد، ہری پور

✿ ہمیں تحفے بہت پسند ہے۔ فاروق اور عزیزہ، کراچی

✿ جولائی کے شمارے کی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ نونہال ادیب میں کہانی "آئینہ" میں جاپان کے دارالحکومت کا نام کیوٹو لکھا ہوا تھا جب کہ اصل نام ٹوکیو ہے۔ اس کے علاوہ منور شہناز کی نظم "میری کتاب" نقل شدہ تھی جو کہ اردو کی چھٹی کتاب سے لی گئی تھی۔

عبدالرحیم ناگوری، حیدرآباد

✿ جولائی کا شمارہ پڑھا دل کو سکون مل گیا۔

سید نور جہاں شاہ بکیاری، شہداد پور

✿ آپ کی محنت ہمدرد نونہال کو ہر مہینے چار چاند لگا دیتی ہے۔

محمد شبیر، کراچی

✿ اگر محمد سعید صاحب کے کالم کو رسالے کی جان کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ تمام کی تمام کہانیاں بہترین تھیں۔

محمد راشد قریشی، کراچی

✿ جناب حکیم محمد سعید کے جاگو جگاؤ کو پڑھ کر روح کو تسکین ملی۔ برکاتی انکل کی پہلی بات لاجواب تھی۔

خالد محمود قریشی، پرانا گولیمار

✿ گلستانِ علم (ہمدرد فاؤنڈیشن) سے ایک مہکتا اور مسکراتا ہوا پھول (ہمدرد نونہال) آیا، جس کی دل کشی و دل فریبی، منفرد اور مسحور کن خوش بُو (تحریریں) سے ہمارے دل و دماغ کو راحت و فرحت اور تازگی و پاکیزگی ملی۔ اس نرم و نفیس پھول کو ہم نے ایک ہی دن میں سونگھ لیا (پڑھ لیا)۔ اس خوب صورت و حسین پھول کی پہلی پتّی کی خوش بُو (جاگو جگاؤ کی باتیں) سے ہمیں بہت زیادہ تسکین و راحت ملی۔ اس کے بعد ہم نے اس خوش نما پھول کو اپنے گل دان (کتابوں کی الماری) میں سجا دیا۔ جس سے گل دان کی آرائش و زینت کو چار چاند لگ گئے۔ محمد انور قریشی، شکار پور

✿ جولائی کا نونہال بہت چٹ پٹا تھا۔ کہانیاں بھی اچھی تھیں لطیفے کوئی خاص نہیں تھے۔ شازیہ منظور، لاہور

✿ اس دفعہ نونہال میں سب سے منفرد بات اس کا سرورق ہے جو آپ نے بالکل ہی بدل ڈالا۔ سرورق پر ایسے ہی مناظر کی تصاویر ہونی چاہییں۔ محمد نوید مرزا، لاہور

✿ میری ایک تجویز ہے کہ کراچی وغیرہ سے جو خط لکھتے ہیں اُن کو ایک جگہ شائع کریں۔ کراچی کے ایک جگہ اور اسی طرح باقی دوسرے بھی۔ ایم۔ آئی۔ شاہدہ الیاس، راولپنڈی

✿ "زندگی کے رنگ مفکرین کی نظر میں" محمد اشرف نوشاہی نے جس طرح اس کو مرتب کیا ہے وہ بہت ہی قابلِ دید ہے۔

راحیل احمد صدیقی، لطیف آباد

✿ کہانیوں میں "بھنگیاں" اور "اُڑنے والا گھوڑا" پسند آئیں۔ شان الحق حقی کا "لفظوں کا جگ سا" بہت دل چسپ تھا۔

محمد صابر محمود، حیدرآباد

❀ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ نظمیں بھی اچھی تھیں۔ نونہال ہی ایک ایسا رسالہ ہے جس میں زیادہ سے زیادہ معلومات ہوتی ہیں۔

محمد اعجاز منیر، تلہ گنگ

❀ خوب صورت اور پیارا پیارا نونہال میرے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایک بے مثال رسالہ ہے۔ اس جیسا رسالہ میں نے کبھی نہیں پڑھا۔ یہ ایک ایسا گل دستہ ہے جس کی خوش بُو تمام نونہال پڑھنے والوں کو بھلی لگتی ہے۔ غزالہ شاہین، فیصل آباد

❀ جولائی کا نونہال بہت پسند ہے۔ لطیفے تقریباً سارے نقل شدہ تھے۔ لگتا ہے آپ کو سچی بات کڑوی لگتی ہے۔ آپ میں سچی بات سننے کا حوصلہ نہیں ہے۔ تقریباً یہ میرا دسواں خط ہے۔ اس سے پہلے خط میں میں نے یہ لکھا تھا کہ آپ کو فیصل آباد والوں سے دشمنی ہے۔ اور میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ آپ صرف کراچی والوں کی تحریریں چھاپتے ہیں۔ ثاقب مجید شیخ، فیصل آباد

❀ کہانیوں میں سے بھگے میاں، بارش کا بھوت اور سمرنا کا حاکم پسند آئیں۔ امۃ الواسع شاہین، لاہور

❀ جاگو جگاؤ، بارش میں بھوت، چور پکڑنے کی مشین اور جناب ساجد علی ساجد کا مضمون پاکستان میں ورلڈ کپ بے مثال تھے۔

شبانہ خان، میر پور خاص

❀ جناب مسعود احمد برکاتی کی بات کافی دل چسپ تھی۔

پرنس راشد شاہد بن

❀ تمام کہانیاں اچھی تھیں، لیکن جناب مناظر صدیقی کی کہانی "اُڑنے والا گھوڑا" بے حد پسند آئی۔ لطیفے بھی چٹ پٹے اور معیاری تھے۔ نونہال ادیب کی تمام کہانیاں پسند آئیں۔ پرنس شباب احمد، کراچی

❀ جاگو جگاؤ رسالے کی جان تھا۔ نونہال ادیب اور لطیفے بھی پسند آئے۔ سید ممتاز حیدر عابدی، کراچی

❀ صحت مند نونہال کا واقعی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر کسی کو تصویر چھپوانی ہی ہے تو کچھ محنت کر کے "معلومات عامہ" میں تصویر چھپوائے یا پھر "نونہال ادیب" میں کچھ لکھ کر اپنے مضمون کے ساتھ تصویر شائع کروائے۔ آپ کے پہلے والے آرٹسٹ کدھر چلے گئے ہیں۔ یقین جانیے اگر رسالہ کسی طرف سے کم زور ہے تو وہ ہے شعبۂ تصاویر۔ ہمیں یہ کم زوری بہت گراں گزرتی ہے۔ اس طرف کافی توجہ کی ضرورت ہے۔ ڈائمنڈ عمانوائیل، لاہور

❀ خط کے جواب میں، چور پکڑنے کی مشین اور بھگے میاں بہت پسند آئیں۔ عدنان ذوالفقار، اسلام آباد

❀ کہانیوں میں جب آنکھ کھلی اور اُڑنے والا گھوڑا بہت پسند آئیں۔ عرشیہ زیدی، فیصل آباد

❀ اس دفعہ نونہال میں تصویروں کا معیار اچھا نہیں تھا۔ تصویریں کارٹون کی طرح بنی ہوئی تھیں۔ زرقا پرویش، کراچی

❀ نونہال کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔ ہمیشہ کی طرح جناب حکیم محمد سعید اور جناب مسعود احمد برکاتی صاحب نے بہت متاثر کیا۔ تمام کہانیاں اور نظمیں پسند آئیں۔ سعدیہ رفیق، فیصل آباد

❀ اس دفعہ قیمت صرف ۲ رُپے ہے ویسے اگر اس کی قیمت ۱۰ رُپے بھی ہو تو کوئی حرج نہیں، لیکن قیمت اتنی کم ہونے کی وجہ سے ہمارے غریب بہن بھائیوں کا بھلا ہو سکے گا۔ تحفے اب کچھ اچھے نہیں آرہے ہیں۔ روبی حنیف، کراچی

❀ جناب حکیم محمد سعید کے جاگو جگاؤ اور خیال کے پھول بہت پسند ہیں۔ لطیفے بھی خاصے چٹ پٹے رہے۔

جہان عالم عادل، مینگورہ سوات

❀ تمام مضامین اچھے تھے خاص کر جاگو جگاؤ، جھوٹا گولہ، بارش میں بھوت، چور پکڑنے کی مشین، بھگے میاں اور اُڑنے والا گھوڑا متاثر کن تحریریں تھیں۔ نظموں میں اسمٰعیل میرٹھی (قمر ہاشمی) چاند سارے (شفق) اور چندا ماموں (سمیع الوری) پیاری پیاری نظمیں تھیں۔ محمد اشرف ناز، شیخو پورہ

❀ سرورق اپنی مثال آپ تھا۔ جاگو جگاؤ ہمیشہ کی طرح نہایت سبق آموز تھا۔ پہلی بات نے ہمیں بہت متاثر کیا۔ ہمیں یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ قبلہ مسعود احمد برکاتی صاحب کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنّت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

دل عزیز صدیقی، کراچی

❀ کہانیاں بہت اچھی اور معیاری ہوتی ہیں اور نظمیں، لطیفے بھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ عظمیٰ ناہید انصاری، جلال پور جٹاں

نونہال دن بہ دن اچھا ہوتا جارہا ہے۔ اس سے اچھا رسالہ آج تک میں نے اپنی زندگی میں نہیں پڑھا۔ جولائی کا نونہال تو بہت ہی شان دار اور دل چسپ تھا۔ سعدیہ ضیا، سعودی عرب

مجھے حکیم محمد سعید کا "جاگو جگاؤ" اور مسعود احمد برکاتی کی "پہلی بات" سب سے زیادہ پسند ہے۔

اوصاف علی ارشد، میر پور خاص

نونہال بہت ہی پیارا رسالہ ہے۔ رابعہ حبیب، کراچی

جولائی کا نونہال بہت اچھا تھا۔ زاہد شرجیل، جوہر آباد

اس رسالے میں جاگو جگاؤ، خیال کے پھول، سب کہانیاں کافی پسند آئیں۔ محمد نعیم خاں شاکر میانوالی

صحت مند نونہال کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ معلومات عامہ کے درست جوابات بھیجنے والوں کی تعداد پر شائع کرنا بھی بند کر دیں، کیوں کہ ان کا بھی کوئی مقصد نہیں۔ اصل بات تو نام کی ہے۔ محمد عمران قمور، ساہی وال

پہلی بات کی چند آخری پُرسوز سطور پڑھ کر آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ واقعی ماں جیسی ہستی کا اس دنیا میں کوئی بدل نہیں۔ عامر خطیب

ان نونہالوں کے نام جنھوں نے ہمیں اچھے خطوط لکھے، لیکن جگہ کی کمی کے باعث ان کے صرف نام دیے جا رہے ہیں۔

کراچی:۔ لبنیٰ ناز، کاشف ملک، شاذیہ جلیل، نادیہ جلیل، نازیہ جلیل، عاصمہ مسعود، نوید اختر، اظہر الحسن، محمد نایاب ادریس، مریم حاجی ابوبکر، یاسمین کنول، شہناز فاطمہ، راشد شفیع سلاوٹ، شگفتہ پروین، محمد نظیر بھٹی، عارف صدیق راجپوت، روزینہ رشید، ساجد حسین، محمد خالد، محمد طارق، شکیل احمد، محمد ناصر، شاہد لطیف، نرگس دلدار، رئیس احمد قدیر، ندیم نصیب شاہ، سعدیہ خلجی، شائستہ وجاہت، معز رعنا، محمد عابد، حمیرا افشین انجم، ثمین اطہر، فراز اظہر، ملک مسرور احمد، فرح بانو، احمد خان، جنید اختر، عبدالرؤف بدر، سلیم احمد خاں، شہزاد اسماعیل، محمد عارف ضیا، رضوان احمد، سیدہ گلناز فاطمہ نقوی، کاشف واحد، شگفتہ، ملک نعیم احمد اعوان، محمد عامر بٹ، سید صفدر کمال، ثمینہ کنول، سید شبیر عامر، عبدالباسط، فہیم مرتضیٰ، عبدالغفور، جمیل الدین، نوید اختر، الیاس جبار، فیاض علی، ذوالفقار حیدر علی، محمد عدنان انعام، سید کاظم رضا رضوی، نادر احمد، شہلا تبسم، سید شفیق الدین، نغمہ احمد ترمذی، محمد عمران شیخ، زبیدہ احمد، فرحت پروین، عظمیٰ رحمٰن، عطیہ رحمٰن، زاہد اختر۔ ٹنڈو جان محمد:۔ خرم شہزاد قائم خانی۔ حاصل پور: جواد علی احمد۔ جمرود وزیر ڈھنڈ: عالمگیر خاں آفریدی۔ سیال کوٹ: حاجی محمد عالم۔ مقام نامعلوم: محمد ارشد الہدیٰ، ندیم محمد خاں رحیمی، ایاز احمد قریشی، شیخ غزالہ قمر۔ ڈگری: تنویر عالم۔ سرائے عالمگیر: سید رضا اسلم بخاری۔ مسقط: محمد داود اظہر خلیل خاں۔ نواب شاہ: لبنیٰ شبیر۔ جمرود خیبر ایجنسی: شکیل احمد۔

حیدر آباد:۔ محمد علی شجر، وسیم احمد قائم خانی، تسنیم عالم منظر قریشی، ایم اکبر خاں زادہ، روبینہ، نوشین، ثمینہ، افشین، نوین۔ لاہور: عباد علی سحر ناز، عاصمہ جمیل، ملک عبدالاحد۔ صوابی: حمید خاں۔ باڈہ:۔ محمد سعید گوندر، محمد اسلم بلوچ۔ ٹنڈو الہ یار:۔ محمد فیصل شجاعت حسین، محمد ارشد قائم خانی، محمد ذاکر قریشی۔ پیر جو گوٹھ: سلمیٰ شیخ۔ نوابشاہ: محمود علی شیخ، محمد سہیل مگسی بلوچ، ذیشان علی، افشاں مگسی بلوچ۔ سامارو: محمد شفیق قائم خانی، رفیق احمد قائم خانی۔ ہارون آباد: عاصم منور۔ ٹنڈو جام: نواب فرخ اصغر خاں زادہ۔ سکھر: محمد حنیف چاچڑ۔ سلطان صلاح الدین عباسی، آر۔ یو۔ خالد گھوٹکی:۔ امر لعل چھابڑیا۔ جام پور: سجاد احمد بلوچ، شفقت رسول گوپانگ۔ جیکب آباد: عبدالرب بھٹی، فیصل آباد: شیخ عبدالرشید، روح اللہ، سمیع اللہ۔ خیر پور میرس: منیر احمد شیخ کھوڑا۔ لدوہ:۔ محمد مسعود یوسف۔ جانگرہ: بجمہ بلوچ۔ شہداد کوٹ:۔ امداد حسین بلوچ۔ راول پنڈی: ایم۔ اے عرفان اختر۔ بہاول نگر: محمد مقبول احمد۔ لاڑکانہ: غزالہ منیر شیخ غزل۔ تھرپارکر: اعجاز علی میمن۔ پشاور: محمد سجاد۔ آزاد کشمیر: عظیم اسلام۔ جام پور: محمد اسحاق گوپانگ بلوچ۔ ٹھٹھہ: عظمیٰ، ماہ رخ۔ سوات: الیس اختر علی۔ راول پنڈی: محمد ممتاز۔ کالا باغ: ایم جنید۔ کوہاٹ: رفیق احمد اوف لاچی۔ کنڈ: ایم معروف ہزاروی نوکی۔ کراچی:۔ ایم عتیق الرحمٰن، ثمینہ شیخ، قاضی تنویر عبدالعزیز۔

معلوماتِ عامہ ۲۴۳ کے صحیح جوابات

اس بار بھی سوالات کی تعداد بارہ ہی ہے، لیکن تصویریں صرف ۱۲ یا ۱۱ صحیح جوابات بھیجنے والوں کی شائع کی جائیں گی دس اور نو صحیح جوابات بھیجنے والوں کے صرف نام شائع کیے جائیں گے۔ جوابات ۱۵۔ ستمبر ۸۶ء تک بھیج دیجیے۔ جوابات کے نیچے اپنا صاف نام اور پورا پتا لکھیے۔

۱۔ جب حضرت نبی کریمؐ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا اُس وقت آپ اپنی عمر کے چھٹے سال میں تھے۔

۲۔ چودھری رحمت علی نے ۱۹۳۲ء میں لندن میں جو جماعت بنائی تھی اس کا نام "پاکستان نیشنل موومنٹ" تھا۔

۳۔ مصر کے صدر کرنل جمال عبدالناصر کا ۱۹۷۰ء میں انتقال ہوا۔

۴۔ جون۔ ایف کینیڈی اور روبرٹ ایف کینیڈی دونوں سگے بھائی تھے۔

۵۔ مولانا شوکت علی کا انتقال بھی اسی سال یعنی ۱۹۳۸ء ہی میں ہوا۔

۶۔ اسلام آباد سے پہلے پاکستان کا مستقل دارالحکومت کراچی میں تھا۔ راول پنڈی عارضی دارالحکومت تھا۔

۷۔ ورجل (VIRGIL) قدیم روم کا ایک رزمیہ شاعر تھا۔ رزمیہ شاعری میں کسی قوم کے ایک بہادر یا کئی بہادروں کے واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔

۸۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق اور مرزا اسد اللہ خاں غالب دونوں بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔

۹۔ "تہذیب و فن" کے مصنف جناب احمد ندیم قاسمی ہیں۔

۱۰۔ سورج مکھی وہ پھول ہے جو سورج کے ساتھ دن بھر اپنا رُخ بدلتا رہتا ہے۔

۱۱۔ ہندوستان کے سب سے پہلے مسلمان بادشاہ کا نام قطب الدین ایبک ہے۔

۱۲۔ سلطان محمود غزنوی کو بندھیل کھنڈ کے راجا کا ہاتھی بہت پسند آگیا تھا۔ راجا اُسے کسی قیمت پر بیچنے کو تیار نہیں تھا۔ اتفاق سے ایک رات وہ ہاتھی خود ہی اپنے لشکر سے نکل کر سلطان محمود کے خیمے کے سامنے آگیا۔ اس لیے سلطان محمود نے اس کا نام "خداداد" رکھ دیا۔

بارہ صحیح جوابات بھیجنے والے کا نام

توقیر محمد صدیقی، خیرپور میرس

بارہ صحیح جوابات بھیجنے والوں کی تصاویر

توقیر محمد صدیقی، خیرپور میرس | فیاض احمد سومرو، خیرپور میرس | سید وزیر حسین شاہ، خیرپور میرس | نعیم حسین، شکارپور | ندیم رضا، خیرپور میرس

گیارہ صحیح جوابات بھیجنے والوں کے نام

ہری پور ہزارہ	محمد زاہد	احمد مرتضیٰ فاروقی	پرنس الطاف اللہ شیخ
محمد مبشر اقبال	محمد فرخ رشید	خیرپور میرس	پرنس محمد عامر سعید شیخ

دس صحیح جوابات بھیجنے والوں کے نام

کراچی	سعد احمد انصاری	فرحانہ رفیق سبحانی	ندیم اشتیاق ساجد
ازہر محمود عالم عثمانی	محمد صادق	وسیم صادق	محمد امین سیف الملوک
محمد ظفر ایوب	لبنیٰ شبیر	محمد انوار حسین	**ملتان**
محمد اشرار حسن	محمد سہیل ایوب	خواجہ معین احمد	پرنس ملک سرفراز احمد
اشہر سعید عالم عثمانی	خرم خاں	خواجہ مدین احمد	مسعود سرور گوندل
محمد ذیشان ایوب	بشیر اظفر انوار	**سانگھڑ**	**نواب شاہ**
محمد اشرف ایوب	مجیب ظفر انوار	غلام رسول پارس	جاوید شبیر
محمد اظہر ایوب	فرید ظفر انوار	کنول غلام نبی منصوری	آسمہ عندلیب

خیرپور میرس

پرنس نجد اللہ سومرو

پرنس الطاف علی مغل

پرویز رضا مغل

سلیم رضا مغل

شکیل احمد، جمرود خیرالجتنی

محمد اشرف آزاد، سامارو

محمد طاہر آرائیں، سکھورو

عابد حسین، سامارو

محمد سلیم خیرالدین، اسلام آباد

محمد عثمان، راول پنڈی

توضیح جوابات بھیجنے والوں کے نام

کراچی

قاضی تنویر عبدالعزیز

سید آصف مصطفیٰ نقوی

انیس گل واسطی

فرقان شمیم

محمد ریاض الدین قریشی

انور حسین صدیقی

ظفر حسین صدیقی

منصور کمال نقوی

محمد یٰسین مالک

محمد یوسف قریشی

نوید اقبال

ریحان جمیل

مرزا معراج بیگ

مرزا اسرار بیگ

انیس مقصود علی

قیصر علی خاں

نوید سحر

سید شبیر حسین رضوی

سید معز الدین

مرزا غفار بیگ

مرزا شہزاد بیگ

اسلام آباد

شائستہ اقبال

زینت فردوس

خیرپور میرس

عبدالجبار میمن

منیر احمد شیخ کھوڑا

شکیل احمد شیخ کھوڑا

جمیل احمد شیخ کھوڑا

مختلف شہروں سے

دلشاد احمد، میاں چنوں

محمد اقبال، سامارو

یہ دھلائی کے سفوف

آج کل صابن کے علاوہ دھلائی کے مختلف پاؤڈر (ڈیٹر جینٹ) بہ کثرت استعمال ہو رہے ہیں۔ لندن کے اسکول آف میڈیسن کے ایک مطالعے کے مطابق ان پاؤڈروں اور سفوفوں کو استعمال کرنے کی صورت میں برتن وغیرہ کو خوب اچھی طرح دھولینا چاہیے۔ خاص طور پر بچّوں کے برتنوں مثلاً بوتل وغیرہ کو بالکل صاف کر لینا ضروری ہے، کیوں کہ غذا میں اس کی شمولیت سے بچّے کی آنتیں بوسیدہ ہو سکتی ہیں۔ چوہوں پر کیے گئے تجربات سے اس کی توثیق ہو گئی ہے کہ اس کی وجہ سے آنتوں کی اندرونی نازک سطح تباہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یہ بڑوں کے لیے بھی مُضر ہو سکتے ہیں۔

ہمدرد
پیلو ٹوتھ پیسٹ

ٹوتھ پیسٹوں کی طویل فہرست میں اِس نئے نام کا اضافہ کیوں؟

اس لیے کہ صرف اسی میں
پیلو کے معجزانہ خواص شامل ہیں

پیلو، دانتوں کی مکمل صفائی اور مسوڑھوں کی صحت کے لیے مشرق میں صدیوں سے متعارف ہے۔

طویل تحقیق اور مسلسل تجربات کے بعد، اب جدید سائنس نے بھی حفظِ دنداں کے لیے اس کے معجزانہ اثرات کو تسلیم کرلیا ہے۔ چوں کہ کسی دوسرے ٹوتھ پیسٹ میں پیلو شامل نہیں اس لیے پیلو فارمولے کے مطابق ایک نئے ٹوتھ پیسٹ کی ضرورت ناگزیر تھی جو ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ نے پوری کردی۔

ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ دانتوں کو صاف اور مسوڑھوں کو مضبوط کرتا ہے اور امراضِ دہن سے محفوظ رکھتا ہے۔

—— صحتِ اسنان — صحتِ انسان ——

ہمدرد
پیلو ٹوتھ پیسٹ

فلورائیڈ کے ساتھ

پیلو کے اوصاف مسوڑھے مضبوط، دانت صاف

ہمدرد

ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں

The winning name in biscuits

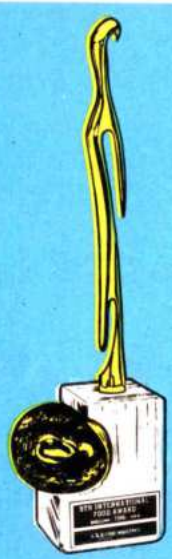

IX
INTERNATIONAL
FOOD AWARD
SPAIN 1986

now wins
world-wide
acclaim

Scanner

Interflow-AB-3